پردیس کی باتیں

حالاتِ سفر ممالکِ اسلامیہ و یورپ

(از)

مرزا حسین احمد بیگ

ایچ۔ سی۔ ایس

ناظم عدالت ملک سرکار عالی

سنہ ۱۹۳۳ء

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی

طبع
بار دوم

ے سکہ عثمانیہ
ے سکہ انگریزی

مرزا رفیق بیگ
مرزا حسین احمد بیگ
مرزا سلیم بیگ
قاہرہ

دیباچہ

طبع اول کے وقت ڈرتے ڈرتے پانچسو جلدیں چھپائی تھیں خیال تھا
کہ آجکل اُردو لٹریچر کی قدر نہیں ہے انگریزی داں اصحاب کی تعداد زیادہ
ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ حضرات زیادہ تر انگریزی لٹریچر کی طرف مائل رہتے
ہیں حتیٰ کہ اخبار بھی پڑھیں گے تو انگریزی میں۔ انگریزی زبان کے رسالے۔
اخبارات اور ناول وغیرہ خوب فروخت ہوتے ہیں اُردو بیچاری کو یہ آؤ بھگت
کہاں نصیب ہے۔ اب سرکار نظام خلد اللہ ملکہ نے اپنی ریاست ابد مدت میں
عثمانیہ یونیورسٹی قائم کرکے اردو کی قدر و منزلت بڑھادی ہے اور عنقریب وہ
زمانہ بھی آنیوالا ہے کہ اُردو لٹریچر اس وقعت کی نظر سے دیکھا جائے گا جس کا
کہ وہ مستحق ہے یہ میری خوش قسمتی ہے کہ امید کے خلاف یہ سفرنامہ عام طور پر
مقبول ہوا اور جیسی جیسی کتابیں فروخت ہوتی گئیں۔ مانگ زیادہ ہونے
لگی۔ احباب کا تقاضہ ہوا کہ دوسرا اڈیشن نکالو۔ مجبوراً فرمایش کی تکمیل کرنی پڑی
اس دفعہ یہ کتاب کسی قدر ترمیم کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش

کی جاتی ہے۔ اکثر واقعات کا تذکرہ سابقہ اڈیشن میں چھوٹ گیا تھا۔
ہوئی کہ بہت سی باتیں میری ڈائری میں درج نہیں ہیں۔ بلکہ ذہن
محفوظ ہیں۔ جو بات یاد آگئی میں نے لکھ دی۔ بعض باتیں بعد میں یا
وہ اس اڈیشن میں اضافہ کردی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ چند غیر ضرور
کو خارج کر دیا ہے تاکہ جدید مضامین کے لئے گنجائش نکلے۔ اور
حجم بلا ضرورت بڑھنے نہ پائے۔

مرزا حسین احمد بیگ

دیباچہ (طبع اول)

سفرنامہ کسی کا ہو کبھی بیکار مت سمجھو — اس آئینہ میں فرحت عکس عالم خوب آتا ہے

ہر اک نقش قدم سیاح کا رہبر ہے منزل کا — ہزاروں گمرہوں کو راہ پر یہ ہی لگاتا ہے

خدا معلوم میرے چھوٹے بھائی میاں حسین احمد بیگ کے دل میں کیا سمائی کہ ایک دفعہ ہی دنیا دیکھنے نکل کھڑے ہوئے بہت اچھا کیا۔ روپیہ خرچ ہوا تجربہ حاصل ہوا اپنے اور اپنے ملک والوں کی اصلی شکل آئینہ میں نظر آئی۔ باہر والوں سے نفرت اور اپنوں سے محبت پیدا ہوئی اور دنیا میں کچھ کام کرنے کا شوق تو پیدا ہو گیا واپس آکر اپنا سفرنامہ لکھا یہ بہت ہی اچھا کیا اپنے خیالات کا دوسروں پر اظہار کیا۔ یہاں والوں کو یہ بتایا کہ تم کیا ہو اور باہر والے تم کو کیا سمجھتے ہیں تم کیا کر رہے ہو اور وہاں کیا ہو رہا ہے تم سو رہے ہو اور دنیا جاگ رہی ہے ہاں ایک بات بہت بری کی کہ سفرنامہ لکھ کر مجھ سے اس کا مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ٹالنے میں استاد ہوں۔ مگر آخر ہیں وہ میرے ہی چھوٹے بھائی وہ اصرار کرنے میں مجھ سے زیادہ نکلے۔ میں نے کہا اس کتاب کیلئے کسی دیباچہ کی ضرورت نہیں۔ کہنے لگے ہے اور ضرور ہے۔ میں نے کہا جب میں نے یہ ملک نہیں دیکھے تو ان کے متعلق لکھوں گا کیا خاک۔ جواب ملا اس کی کچھ ضرورت نہیں آخر بھائی اور وہ بھی چھوٹا بھائی۔ کہاں تک بیمروتی اور روکھائی کرتا ناچار راضی ہو گیا لکھنے بیٹھا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ پہلے تو یہ نہیں جانتا کہ دیباچہ ہے کیا بلا۔ اور اس کے لکھنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ معمہ حل نہیں ہوتا کہ انہیں لکھا کیا جائے خدا رکھے

اس وقت ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ جو کوڑی بھر عقل خرچ کیے بغیر قلم برداشتہ
زنا زن دس دس بارہ بارہ صفحے گھسیٹ جاتے ہیں اور وہ کتاب کے شروع میں
چھپ کر خواہ مخواہ اس کا حجم و قیمت بڑھاتے ہیں۔ اور عرفِ عام میں دیباچہ یا مقدمہ
کہلاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دیباچہ نویس یا "مقدمہ باز" کو نہ اس فن سے مس ہوتا
ہے اور نہ اس علم سے بہرہ ایسی صورت میں یہ دیباچہ اس طرح لکھ جاتے ہیں کہ خواہ کسی کتاب میں
لگا دیا جائے بلا خوف و نکتہ چینی و لومۃ لائم اس سے متعلق ہو جاتا ہے چونکہ نہ میں نے کبھی کوئی
مقدمہ لکھا ہے نہ کبھی خدانخواستہ یہ "پیشہ" اختیار کیا ہے اور نہ بدقسمتی سے ان ملکوں کی
سیر کی ہے جن کا اس کتاب میں ذکر ہے۔ اس لئے اب آپ ہی بتلائیے کہ میں کیا لکھوں
سوائے اس کے کہ اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر اپنے سر سے اس بار کو اُتار پھینکوں اور بھائی سے
کہدوں کہ بس اسی کو دیباچہ کہتے ہیں اور مقدمہ یوں ہی لکھا جاتا ہے۔

یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ہر کتاب میں دو چیزیں دیکھنے کی ہوتی ہیں ایک مضمون
دوسرا طریقہ تحریر مضمون انھوں نے ایسا کیا ہے کہ اس کے صحیح یا غلط ہونے کو خدا ہی
بہتر جانتا ہے۔ ہاں گلستاں میں شیخ سعدی نے یہ ضرور فرمایا ہے کہ "جہاندیدہ بسیار
گوید دروغ" لیکن اب یہ اصول ذرا مشکل ہی سے کام دیتا ہے پہلے تو سفر ہی کون کرتا
تھا اور کرتا بھی تھا تو اِدھر اُدھر تھوڑی دور گیا۔ اور گھر چلا آیا۔ اِس لئے دور دراز ملکوں
کے حالات بہت کم لوگ جانتے تھے اگر کوئی بندۂ خدا ذرا دور کا چکر لگا آیا تو وہ جو کچھ
کہے اس کی تردید کوئی کہاں سے کرے۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی نے اپنا سفرنامہ لکھ
بھی دیا تو زیادہ سے زیادہ اسکی دس بارہ نقلیں ہو کر رہ گئیں اور بس۔ اب کوئی اس کو دیکھے تو
کہاں سے دیکھے اسلئے پُرانے زمانے میں جہاندیدہ لوگوں کو جھوٹ بولنے کے بہت موقعے تھے۔ اب
رنگ بدل گیا ہے ہر شہر میں ہزاروں نہیں تو بیسیوں آدمی ایسے ہیں جو یورپ تو کیا
ساری دنیا کا چکر کاٹ آئے ہیں ذرا کوئی جھوٹ بولا اور پکڑا گیا۔ ایسی صورت میں

یہ تو کسی طرح توقع نہیں ہوسکتی کہ میاں احمد نے اس سفرنامہ میں مجذوب کی بڑ ہانکی ہوگی اس لئے میں اس پہلو پر کچھ اور لکھنا بے ضرورت سمجھتا ہوں وہ جانیں اور ان کا کام جانے۔ اگر انہوں نے واقعات میں خیالات سے رنگ بھرا ہے تو وہ آپ ہی کھل جائیگا اور یہ خود اس کے متعلق جوابدہ ہوں گے اور اگر واقعات صحیح ہیں اور انہوں نے وہاں کے حالات اور خیالات کا صحیح نقشہ کھینچا ہے تو یہ یقینی امر ہے کہ اس سے پڑھنے والوں کو فائدہ پہنچیگا اور ضرور پہنچیگا۔

اب رہا اسلوب بیان اور لطف زبان تو اس کے متعلق میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دونوں اچھے ہیں اور بہت اچھے ہیں۔ زبان کیوں اچھی نہ ہوگی۔ آخر انہوں نے کیسے لوگوں سے زبان سیکھی ہے۔ اِن کی ماں دہلی کی۔ ان کے باپ دہلی کے۔ اور انکا سارا خاندان دہلی کا۔ ماں اگر خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان مرحوم دہلوی مترجم بوستان خیال کی پوتی ہیں تو باپ رشتہ میں اسداللہ خاں غالب مغفور کے پوتے ہیں۔ جو زبان انہوں نے اپنے گھر میں سُنی اور سیکھی ہے وہی اس سفرنامہ کی زبان ہے اور یہ وہ زبان ہے جو پہلے دہلی کے شرفا کی زبان تھی اور اب مٹ رہی ہے اب رہا اسلوب بیان تو وہ آخر کیوں درست نہ ہوگا۔ ان کو دن رات لکھنے پڑھنے ہی سے کام ہے خود مجسٹریٹ ضلع ہیں روزانہ بیسیوں گواہ لیتے ہیں فیصلے لکھتے ہیں۔ وکلا کی بحث سنتے ہیں جسکو خدا نے ایسے موقع دیے ہوں اگر وہ بھی طرز تحریر اور طریقہ بیان پر حاوی نہ ہوجائے تو بس سمجھ لو کہ حد ہوگئی انہوں نے شروع شروع میں مجھے اپنے سفرنامے کے دو چار صفحے دکھانے کی کوشش کی اور اصلاح بھی چاہی مگر میں نے صاف انکار کردیا۔ اور انکار کرنیکی وجہ بھی تھی۔ اگر "خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد" ایک امر واقعہ ہے تو میری اس رائے کو بھی ماننا پڑیگا کہ کبھی دو کہیں دو آدمیوں کی تحریر یکساں نہیں ہوتی اور اس لئے ایک شخص دوسرے شخص کی عبارت میں اصلاح بھی نہیں دیسکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی مشیخت جتانے کو

ایک آدھ حرف اِدھر کا اُدھر کردے یا زبردستی کوئی لفظ کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ بنادے یقین مانیے مجھے بڑا مزہ آیا جب کچھ دنوں بعد میں نے ان سے کہا کہ اس فقرے کو یوں بدلدو تو اچھا ہے اور انہوں نے کہا کہ یہ میری زبان ہے اس میں آپ کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے میری خدا سے دعا ہے کہ ہر لکھنے والے میں یہی اسپرٹ پیدا ہو اور ہر شخص اپنے لکھے کو ناقابل اصلاح سمجھے اس سے لکھنے والوں کی ہمت بڑھیگی۔ اس سے زبان میں روانی آئیگی۔ اور اس سے نکتہ چینیوں کی زبان بند ہوگی۔ ورنہ یہ استادی اور شاگردی کی مصیبت وہ ہمت شکن ہے کہ ہزاروں اہل قلم کو ڈبو چکی ہے۔ اور لاکھوں ہی کو آئندہ لے مریگی۔

بہرحال یہ سفرنامہ اس نامربوط اور بےمعنی دیباچہ یا مقدمہ کے ساتھ آپ کے سامنے آتا ہے پڑھیے اور حالات پر غور کیجیے اپنے خیالات کو وسعت دیجیے۔ اپنا مقابلہ باہر والوں سے کرکے خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل کیجیے اور اگر آپ کا روپیہ کھتوں میں پڑا سڑ نہیں گیا ہے یا سود کے چکروں میں آکر آپ کی املاک قرق نہیں ہو رہی ہے تو آپ بھی گھر سے نکلیے کچھ دنیا دیکھیے اور اگر ممکن ہو تو اپنی اور اپنی قوم کی اصلاح کیجیے۔ نہیں تو جو روپیہ اس سفرنامے کے لکھنے والے اور اس دیباچہ کے تحریر کرنے والے کا بھلا کرے کہ مفت میں ہمارے روپے ستیاناس کردیے۔ والسّلام۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یورپ کے سفر سے واپس آنے کے بعد اکثر کرم فرما احباب کا یہ تقاضا شدت
کے ساتھ ہوا کہ حالات سفر قلمبند کرو۔ مجھ کو اس کام کے لئے نہ تو فرصت اور نہ
ہمت۔ کچھ دنوں تک عذر و حیلہ کر کے جان بچاتا رہا بعض احباب نے بہ اصرار کہا کہ
کتاب نہیں لکھتے تو کم از کم کسی مجمع میں حالات سفر بیان کرو۔ چنانچہ نارمل سکول
و انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل میں کچھ لکچر ہوئے جن کے سلسلہ میں روزنامچے کے پریشان اوراق
کو ترتیب دینے کی ضرورت ہوئی۔ سفرنامے کے لئے احباب کا تقاضا برابر جاری رہا
بالخصوص میرے واجب التعظیم عنایت فرما نواب ناظر یار جنگ بہادر رکن عدالت العالیہ
حیدرآباد دکن) نے کئی دفعہ تاکید فرمائی کہ ضرور لکھو اور جلدی لکھو۔ میں نے پاس
ادب سے وعدہ کر لیا۔ اگرچہ اس سفر میں ڈائری روزانہ لکھا کرتا تھا لیکن اس وقت سفرنامے
کا خیال بھی میرے ذہن میں نہ تھا البتہ اعزہ و اقربا کی دلچسپی کے لئے ڈائری کی نقل
ہفتہ وار مکان بھجوا دیا کرتا تھا۔ خانگی اغراض کی خاطر ڈائری لکھنا اور پبلک
میں اس کو کتاب کی شکل میں پیش کرنا یہ دونوں کام ایک دوسرے سے بالکل
مختلف ہیں۔ وعدہ کی تکمیل چونکہ لازمی تھی اس لئے اس کام کو شروع کیا۔ فرائض
منصبی کو انجام دینے کے بعد جو کچھ وقت بچتا۔ اس کام کی نذر ہو جاتا۔ چنانچہ ابھی

یا بڑی جیسی کچھ بھی ہے۔ یہ کتاب ناظرین با تمکین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے

گر قبول افتد زہے عزو شرف

خدا کے فضل سے اس ملک میں ایسے حضرات کی کمی نہیں ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے یورپ کی سیر کر چکے ہیں بلکہ برسوں قیام بھی رہا ہوگا۔ ان حضرات کی خدمت میں التجا یہ ہے کہ اگر کوئی واقعہ غلط یا مبالغہ کے ساتھ اس کتاب میں بیان ہوا ہے یا کوئی اہم فروگزاشت ہوگئی ہے تو براہ کرم ایسی غلطیوں کو نظر انداز فرمائیں کیونکہ میرا علم اور مشاہدہ بہت محدود ہے۔ حتی الامکان وہی لکھا ہے جو دیکھا تھا البتہ تاریخی واقعات کی تو بات ہی الگ ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ان اصحاب کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ جنھوں نے کبھی ہندوستان کے باہر سفر نہیں کیا یا ان ممالک کی سیر کے لئے جانا چاہتے ہوں۔ جن کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اگر میری یہ امید پوری ہوگئی تو میں اپنے کو خوش قسمت خیال کرونگا اور یہ سمجھوں گا کہ اس کتاب کے لکھنے کا منشا و مقصد بھی پورا ہوگیا۔

مرزا حسین احمد بیگ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پردیس کی باتیں

تمہید سفر کا اصلی مقصد تبدیل آب و ہوا تھا۔ عرصہ سے صحت ذرا خراب ہو گئی تھی۔ اِس فکر میں تھا کہ کوئی ہمسفر مل جائے کیونکہ تنہا اتنے لمبے سفر پر جانا بے لطفی سے خالی نہ ہوتا۔ حسنِ اتفاق دیکھو کہ میرے قریبی عزیز اور ہم زلف مرزا رفیق بیگ اپنے کام سے یورپ جانے والے تھے ان کے اس ارادے سے مجھ کو تقویت ہوئی۔ رفیق بیگ کے دیکھا دیکھی بھائی سلیم بیگ بھی تیار ہو گئے اِس سے بہتر صحبت اور کیا ہو سکتی تھی۔ ہم عمر، ہم خیال اور ایک دوسرے کے ہمدرد یہی چیز سفر کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہے پہلی مئی ۱۹۳۰ء کو لائڈ ٹرسٹو کا ایک جہاز (S.S.GANGE) ایس ایس گینج بمبئی سے روانہ ہونیوالا تھا ہم نے کک کمپنی کو لکھ دیا کہ درجۂ دوم میں تین برتھ (BERTH) ہمارے لئے محفوظ کر دیے جائیں۔ جواب ملا کہ اِس جہاز میں جگہ مطلق نہیں ہے لیکن کوشش کرینگے ایسے موقع پر کمپنی والے ایک فہرست امیدواروں کی رکھتے ہیں اس میں ہمارا نام درج کر لیا گیا۔ یہ خط و کتابت ڈسمبر کے مہینے سے شروع ہوئی تھی۔ بڑی کوشش کے بعد صرف ایک شخص کے لئے جگہ کا انتظام ہو سکا۔ مگر ہم نے انکار کیا۔ کیونکہ تینوں بھائی ایک ہی جہاز میں جانا چاہتے تھے۔ وسط اپریل میں قطعی طور پر جواب ملا کہ

جہاز میں جگہ نہیں ہے اگر تینوں آدمی ایک جہاز میں جانا چاہتے ہوں تو کولمبو سے جو جہاز جاتے ہیں ان میں جگہ مل سکتی ہے ۳۰ر اپریل کو اورینٹ لاین کا ایک جہاز پیس اورنیٹس ORENTES روانہ ہونے والا تھا معلوم ہوا کہ اس جہاز کے تیسرے درجہ میں چھ مسافروں کا جو کمرہ ہوتا ہے اس میں جگہ خالی ہے تیسرے درجے کا نام سُن کر انواع و اقسام کی تکالیف کا تصور پیدا ہوا مگر صورت مجبوری کی تھی۔ آخر کار تار کے ذریعہ اس جہاز میں جگہ محفوظ کرائی گئی کیونکہ وقت بہت تنگ تھا۔ اور کچھ دنوں بعد ہی سمندر میں طغیانی کا زمانہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہم کو جہاز کے ذریعہ صرف پورٹ سعید تک جانا تھا اس لئے تین ٹکٹ پورٹ سعید کے لئے فی شخص بائیس پونڈ کے قریب کرایہ ہوا۔ ایک پونڈ تقریباً پندرہ روپیہ سکہ عثمانیہ کے برابر ہوتا ہے۔ کک کمپنی نے ہم کو اطلاع دی تھی کہ جہاز پر سوار ہونے سے قبل چیچک کا ٹیکہ لگانا ضروری ہے یا اس امر کا صداقت نامہ چاہئے کہ زمانۂ حال ہی میں ٹیکہ لگوایا تھا۔ روانگی سے کچھ دنوں قبل ہم لوگوں نے ٹیکہ لگوا لیا۔

حیدرآباد تا مدراس

۲۵ر اپریل ۱۹۳۰ء کو ہم تینوں حیدرآباد کے اسٹیشن نامپلی سے رات کو نو بجے کے قریب کولمبو روانہ ہوئے ریل کے ٹکٹ بھی کک کمپنی کی معرفت پہلے سے خرید لئے تھے اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اس کمپنی نے حیدرآباد اور مدارس کے اسٹیشن ماسٹروں کو تین برتھ محفوظ رکھنے کے واسطے لکھ دیا تھا ہم کو فکر کرنی نہ پڑی۔ اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے کے لئے اعزا و احباب کا ایک کثیر مجمع تھا۔ پھولوں اور امام ضامنوں سے ہم لد گئے تھے۔ جب ریل چلی تو سلیم بھائی نے کسی قدر جوش کے ساتھ یہ شعر پڑھا۔

اب تو جاتے ہیں میکدہ سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

خوش قسمتی سے درجہ میں کوئی اور مسافر نہ تھا اس لئے آرام رہا سنا تھا
کہ یورپ کے سفر میں بستر ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اس لئے حیدرآباد ہی
میں ہوا بھرنے کے تین تکیے خرید لئے ۔ اور ایک چادر ساتھ رکھی ان ہوائی تکیوں
نے بہت آرام دیا ۔ نصف شب کے قریب ریل قاضی پیٹھ اور ورنگل پہنچی کچھ
احباب یہاں بھی خدا حافظ کہنے کے واسطے آئے ۔ بجواڑے پر مدراس کے
لئے ٹرین تبدیل کرنی ہوتی ہے ۔ مگر ہم کو اپنے درجے سے اُترنے کی ضرورت
نہ ہوئی ۔ کیونکہ راست جاتا تھا ریل علی الصباح بجواڑہ پہنچی تو معلوم ہوا کہ مدراس
جانے والی ریل دو گھنٹے لیٹ ہے ۔ اس خبر سے یہ فکر پیدا ہوئی کہ مدراس پر
ہم کو کولمبو میل ملتا ہے ۔ یا نہیں ۔ راستہ میں اسٹیشن پر دوپہر کا کھانا کھایا فی شخص
ڈیڑھ روپیہ دیا گیا مگر کھانا اچھا نہیں ملا سمندر کی قربت کی وجہ سے گو تپش تھی
بلکہ ہوا میں کسی قدر خنکی معلوم ہوئی ۔ اس جانب اسٹیشنوں پر رونق نہیں ہے لوگ
عام طور پر سُرخ تہبند باندھتے اور سر پر بال رکھتے ہیں ۔ ڈاڑھی اور مونچھ
منڈوا دیتے ہیں ۔ اس لئے دور سے عورت مرد کی تمیز مشکل سے ہوتی ہے ۔
سب ننگے پاؤں پھرتے ہیں کسی اسٹیشن پر ایک بزرگ اپنی داڑھی میں سرخ
کنگھا کر رہے تھے ۔ ہم لوگوں کو ہنسی آئی ۔ انہوں نے دیکھ لیا ۔ اور جلدی سے
اپنے ڈبے میں داخل ہو گئے ۔ رات کو ۸ بجے مدراس کے سنٹرل اسٹیشن پر پہنچے
کچھ احباب ہمارے انتظار میں پلیٹ فارم پر موجود تھے ایک صاحب نے اپنے
مکان پر کھانے کا بھی بندوبست کیا تھا ۔ لیکن ریل کے لیٹ ہونے کی وجہ سے
اتنا وقت نہ تھا کہ ان کے مکان پر جاتے اس لئے معذرت کی گئی

سنٹرل اسٹیشن سے موٹروں میں سوار ہوکر اگمور اسٹیشن گئے۔ کولمبو میل تیار کھڑا تھا۔ ہمارے لئے جگہ محفوظ تھی۔ اسٹیشن پر کچھ میوہ خریدا۔ کھانے کی کچھ چیزیں ہمارے ساتھ بھی تھیں اس پر قناعت کی گئی۔

مدراس تا دھنسکوڑی

اس ریل کے کمپارٹمنٹ چھوٹے ہوتے ہیں ہر ڈبہ میں دو برتھ تھے۔ سامان کے لئے جگہ بہت کم تھی۔ منہ ہاتھ دھونے کا بیسن ڈبہ میں لگا ہوا تھا۔ رات آرام سے گذری۔ البتہ ایک ناگوار واقعہ پیش آیا۔ نصف شب کے قریب بیت الخلا جانے کی ضرورت معلوم ہوئی سب کمرے ایک قطار میں تھے روشنی بند ہونے کی وجہ سے اندھیرا تھا۔ میں ایک ایسے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جس میں دو انگریز میاں بیوی سو رہے تھے۔ آہٹ سن کر دونوں بیدار ہو گئے۔ اگرچہ معذرت کر لی گئی لیکن شرمندگی کی وجہ سے بڑی کوفت ہوتی رہی۔ یہ حصہ ملک کا سرسبز اور شاداب معلوم ہوا۔ دوپہر کا کھانا ایک اسٹیشن پر کھایا۔ معمولی تھا۔ رفیق بیگ کو ناف ٹلنے کا مرض ہے۔ کسی وجہ سے ان کی ناف ٹل گئی۔ کچھ دیر تک تکلیف رہی پھر ٹھیک ہو گئی سرِ شام سمندر کا کنارہ قریب ہوتا گیا۔ دھنسکوڑی نزدیک آیا تو ریل سمندر کے ایک حصہ میں سے گذری۔ پل پر سے منظر اچھا تھا۔ کسی اسٹیشن پر ریل کے اندر کچھ بندر آ گئے۔ مسافروں نے میوے اور بسکٹوں وغیرہ سے ان کی ضیافت کی۔ شام کو ساڑھے چار بجے دھنسکوڑی پہنچے۔ یہ مقام سمندر کے کنارے واقع ہے۔ ہندوستان کی سرحد یہاں ختم ہوتی ہے۔

دھنسکوڑی تا تالائمنار

ریل اسٹیمر کے قریب تک جاتی ہے اسٹیمر پر ایک سو کے قریب مسافر تھے اکثر ہمارے جہاز میں لندن جانیوالے تھے۔ ریل میں تو ملاقات کا موقع نہیں ہوا۔ مگر یہاں دو ایک

آدمیوں سے تعارف ہو گیا۔ ایک بنگالی ہیں کر جی نامی باتیں کرتے کرتے مجھ کو
بار روم میں لے گئے وہسکی اور سوڈا خود پیا۔ اور مجھ کو بھی پلانا چاہتے تھے بڑی
دیر تک انکار اور اصرار ہوتا رہا۔ بالآخر لیمونیڈ پر یہ قصہ ختم ہوا۔ آدمی خلیق معلوم
ہوتے ہیں۔ اِن صاحب نے شراب کی تعریف میں فرمایا۔ کہ اگر استعمال کیجائے تو
یہ انسان کو چست و چالاک صحت مند حاضر دماغ رکھتی ہے۔ میں نے کہا
یہ صحیح ہے بشرطیکہ اعتدال سے نہ بڑھ جائے۔ لیکن یہی چیز مشکل ہے نیز اس
کے مقابلہ میں اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن سے یہی فوائد حاصل ہو سکتے
ہیں۔ ایک صاحب بہادر ہیں جن کے ساتھ ان کی دو نوجوان لڑکیاں بھی ہیں۔
یہ لندن جا رہے ہیں۔ اسٹیمر پر سوار ہونے کے بعد پاسپورٹ اور ٹیکے کے
صداقت نامے دیکھے گئے ہم نے اپنے پاسپورٹ کک کمپنی کو بھجوا دیے تھے
کیونکہ ان پر مختلف ممالک کا ویسا ہونا تھا۔ کمپنی نے ہم کو لکھا تھا کہ پاسپورٹ
کولمبو کے دفتر پر راست بھجوا دیے جائیں گے۔ وہاں سے لے لینا ہم نے وہی خط
جہاز کے افسر کو بتلا دیا۔ کسی قدر پس و پیش کے بعد اس نے منظور کر لیا یہ
بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ پاسپورٹ میں جن ممالک کا ذکر ہے وہاں
کے سفیروں سے پاسپورٹ پر ویسا کروانا لازمی ہے یہ ایک قسم کی اجازت
ہے اس ملک میں داخل ہونے کے واسطے کک کمپنی یا امریکن اکسپرس کے توسط
سے یہ کام آسانی کے ساتھ ہو جاتا ہے بعض چھوٹے ممالک ویسا کی فیس بھی
لیتے ہیں۔

تالامینار تا کولمبو

رات کو ۸ بجے تالامینار اسٹیشن پر پہنچے۔ یہاں سے
سیلون کی سرحد شروع ہوئی ہے کولمبو کی ٹرین تیار کھڑی
ملی۔ مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جگہ کم تھی ایک کمپارٹمنٹ

میں بمشکل بیٹھ گئے۔ اس میں دو برتھ تھے۔ دو مسلمان مسافر سیلون کے رہنے والے
پہلے ہی سے اس میں بیٹھے ہوئے تھے یہ نہ تو انگریزی جانتے تھے۔ نہ اُردو
اشاروں کے ذریعہ جو کچھ بات چیت ہوئی۔ اس سے پتہ یہ چلا کہ دونوں آدمی رات
کا بڑا حصہ ریل ہی میں بسر کریں گے۔ یہ معلوم کر کے تشویش ہوئی۔ کیونکہ کمپارٹمنٹ
چھوٹا تھا۔ پانچ مسافر آرام کے ساتھ رات نہیں گزار سکتے تھے۔ اسی فکر میں
کھانے کی گاڑی میں چلے گئے۔ ہمارے قریب کی میز پر وہ ہی صاحب بہادر
مع اپنی لڑکیوں کے موجود تھے جن سے اسٹیمر پر ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے
ساتھ معمولی بات چیت ہوتی رہی۔ یہ صاحب آل انڈیا سروے میں ملازم تھے
وظیفہ پر سبکدوش ہو کر وطن جا رہے ہیں۔ ہم کھانے سے فارغ ہو کر اپنے
کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ چونکہ ساری رات ریل میں گذارنی تھی اس لئے
جگہ تلاش کرنے لگے۔ درجۂ اول کا ایک کمپارٹمنٹ خالی تھا۔ گارڈ کو اطلاع
دے کر اس میں منتقل ہو گئے۔ اس میں صرف دو برتھ تھے۔ اس نے سلیم بھائی
درجۂ دوم ہی میں رہے انھوں نے ترکیب کی کہ خود پوری برتھ پر قبضہ کر لیا
اور بقیہ دو مسافروں کو ایک پر رکھا۔ خدا دلی والوں سے محفوظ رکھے۔ کسی
موقع پر بھی نہیں چوکتے۔ رات آرام سے گذری۔ پچھلی شب کسی قدر خنکی
محسوس ہوئی۔ صبح کو مناظر قدرت دکھائی دیئے۔ جس طرف دیکھو سرسبزی اور
شادابی ریل کے دونوں طرف ناریل پپیتا۔ موز اور کٹھل وغیرہ کے درخت
کثرت سے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ باغ میں سے ریل جا رہی ہے۔

کولمبو

آٹھ بجے کے قریب کولمبو پہنچے۔ اسٹیشن کے پاس وکٹوریہ
ہوٹل میں قیام ہوا۔ خاصا آرام کا ہوٹل ہے۔ البتہ بجلی
کے پنکھوں کی کمی ہے۔ کولمبو میں لو تو نہیں چلتی لیکن گرمی ایسی ہوتی ہے جیسے

برسات کے موسم میں ہمارے ہاں کھانا شامل کر کے اس ہوٹل کا کرایہ پانچ روپیے فی کس ہے۔ کھانے کا کمرہ کشادہ اور ہوادار ہے۔ کھانا بھی اچھا ہوتا ہے۔ سوپ۔ مچھلی۔ انڈا۔ پیف۔ خشکہ۔ سالن وغیرہ سب کچھ دیتے ہیں۔ کرایہ کے لحاظ سے بہت غنیمت ہے۔ ابر کی وجہ سے شدید حبس تھا۔ پسینے چھوٹنے لگے۔ مجبور ہو کر ایک بجلی پنکھا کرایہ پر منگوایا۔ ہمارے کمرے کا رُخ بھی اچھا نہیں تھا۔ اس لئے ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ہوٹل میں بلیرڈ روم بھی ہے۔ ہوٹل کا مالک سیلون کا باشندہ ہے۔ ہمارے جہاز کے کئی مسافر اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

کولمبو سیلون کا دارالسلطنت اور جدید شہر ہے اس کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہوگی۔ یورپ۔ آسٹریلیا۔ امریکہ اور چین و جاپان سے جہاز یہاں پر آتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے شہر کی تجارت کو فروغ اور رونق ہے اس کا بندرگاہ جس کا شمار اچھے بندرگاہوں میں کیا جاتا ہے زر کثیر کے صرفہ سے تیار ہوا ہے۔ قریب کی آبادی کو فورٹ یعنے قلعہ کہتے ہیں یہ کاروباری حصہ ہے۔ اس میں بڑی بڑی دکانیں ہیں ہر قسم کا مال دوکانوں میں بھرا ہوا ہے۔ بازاروں میں رونق رہتی ہے سڑکیں اچھی اور جدید وضع کی ہیں۔ شہر کے اس حصہ میں گورنر کا محل اور سرکاری دفاتر ہیں۔ ڈاک خانہ کی عمارت خوبصورت ہے۔ اس کے متصل جوبلی باغ ہے۔ ویسی آبادی کا حصہ الگ ہے۔ جس میں مختلف اقوام کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ آب و ہوا صحت بخش ہے۔ البتہ کسی قدر گرمی رہتی ہے۔ مقیاس الحرارت کا اوسط (۸۲) ڈگری معلوم ہوا۔ کولمبو کے قریب ایک پہاڑ پیڈرو نامی ہے اس پہاڑ کی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک مقام نیوریلیا ہے یورپین لوگ موسم گرما میں

وہاں جاکر رہتے ہیں اس ملک میں زیادہ تر آبادی سنہالیوں کی ہے۔ جن کا مذہب بودھ ہے۔ ٹامل قوم کے لوگ بھی بہت زیادہ ہیں۔ یہ پستہ قد اور جفاکش ہوتے ہیں ان کی عورتیں چاء کے باغوں میں کام کرتی ہیں۔ اور مرد رکشا کھینچتے ہیں۔ رکشا کا رواج یہاں عام ہے۔ کچھ آبادی مسلمانوں کی بھی ہے جن کے آباؤ اجداد عرب تھے۔ اکثر مسلمان ٹامل لوگ سمندر میں غوطہ مار کر سیپ نکالنے کا پیشہ کرتے ہیں۔ غوطہ مارنے میں ان کو کمال حاصل ہے۔ یہاں کے باشندے عام طور پہ تہبند باندھتے ہیں۔ بقیہ جسم یا تو برہنہ رہتا ہے یا کوٹ پہنتے ہیں مردوں کے سر کے بال لمبے ہوتے ہیں جن کو وہ عورتوں کی طرح سر کے پیچھے لپیٹ لیتے ہیں۔ سکہ یہاں کا ہندوستان سے مختلف ہے

پہلے دن حوائج سے فارغ ہو کر کک کمپنی کے دفتر گئے۔ آل انڈیا ریڈیو کے صاحب بہادر مع اپنی دونوں لڑکیوں کے یہاں پھر ملے۔ سلام اور مزاج پرسی ہوئی۔ دفتر سے اپنے پاسپورٹ اور جہاز کے ٹکٹ لئے کچھ روپیہ کے پونڈ بنوائے یہاں سے فارغ ہو کر امریکن اکسپرس کے دفتر گئے ہندوستان واپس آنے کا بندوبست ابھی سے کر لیا گیا۔ لائڈ ٹرسٹو کمپنی کا جہاز ریس پس گینجے چوبیس سپٹمبر کو وینس سے روانہ ہونے والا تھا۔ اس میں دو برتھ محفوظ کرا دیے۔ رفیق بیگ کو اپنی واپسی کے زمانہ کا اطمینان نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی سیٹ محفوظ نہیں کرائی۔ اس کمپنی کی معرفت اپنے سامان کا بیمہ بھی کرا لیا۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ بیمہ کرا لینا قرین احتیاط ہے آئندہ کسی موقع پر اس کے فوائد کا ذکر کیا جائے گا۔ یہ بھی یاد رہے کہ نقد روپیہ ساتھ نہ رکھنا چاہیئے۔ کک کمپنی اور امریکن اکسپرس کے چیک بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ مختلف مالیت کے چیک کی کتابیں ہوتی ہیں۔ اگر پانچ پونڈ والی کتاب لی جائے تو بہتر ہوگا طریقہ

یہ ہے کہ ہر چک پر کمپنی کے دفتر میں اپنی دستخط کرنی پڑتی ہے اس کے بعد جب کبھی چک بھنواتا ہو اس وقت اپنی دستخط کر کے دیدو۔ لینے والا دونوں دستخطوں کی مطابقت کر لے گا۔ ان دونوں کمپنیوں کے چک ہر شہر میں بڑی بڑی دکانوں اور ہوٹلوں میں لے لئے جاتے ہیں۔ اس کے ماسوا خود ان کمپنیوں کے دفاتر جملہ اہم مقامات پر موجود ہیں۔ وہاں سے بلا زحمت رقم لے سکتے ہو۔ نقد روپیہ ساتھ رکھنے میں سرقہ کا اندیشہ رہتا ہے۔ انہی کمپنیوں کی معرفت آپ اپنے ڈاک کا بھی بندوبست کرا سکتے ہیں۔ اس کے لئے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ البتہ مسافر کو چاہئے کہ خود ہی کمپنی کے دفتر پر جا کر اپنی ڈاک وصول کر لے اگر پہلے سے ہدایت کر دو تو ڈاک محفوظ بھی رکھی جاتی ہے یا جس پتہ پر کہو بھجوا دی جائے گی۔ ہم اپنی ڈاک امریکن اکسپرس کے ذریعہ منگوایا کرتے تھے۔

شام کو ایک موٹر میں سوار ہو کر سیر کے واسطے نکلے۔ اس میں شک نہیں کہ کولمبو ایک تفریح کا مقام ہے اچھے اچھے باغ اور چمن ہیں۔ جدھر دیکھو سبزہ ہی سبزہ ہے سمندر سے ٹھنڈی ہوا آتی رہتی ہے مگر دوپہر میں حبس کی وجہ سے پسینے آتے رہے۔ رات کو ۸ بجے کے قریب ہوٹل واپس ہوئے۔ بارہ روپیہ موٹر کا کرایہ ہوا۔ یہاں اجنبی آدمی سے قیمت بھی زیادہ لے لیا کرتے ہیں۔ موٹر کا کرایہ بڑی مشکل سے طے ہوا۔ اصل یہ ہے کہ جن مقامات پر سیاح زیادہ آتے رہتے ہیں۔ وہاں کے لوگ بہت کچھ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش میں رہتے ہیں سمجھتے ہیں کہ غیر ملک کی سیاحت کو یہ شخص نکلا ہے تو اس کے پاس روپیہ بھی وافر ہوگا۔

ایک دلچسپ واقعہ کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں سونے کے غرض سے لیٹے تو ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا ہمارے پہلو میں

تین کمرے اور تھے ایک کمرے میں ایک صاحب بہادر، اور ایک میم صاحبہ تھیں دونوں میں جھگڑا شروع ہوا۔ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے تھے میم صاحبہ کہتی تھیں کہ دروازہ کھول دو میں دوسرے کمرے میں جاؤں گی۔ بڑی دیر تک حجت ہوتی رہی۔ آخر کو کسی طرح دروازہ کھلا اور میم صاحبہ نے پہلو کے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے بند کر لیا۔ کچھ دیر بعد صاحب بہادر کو بیچینی ہوئی۔ اپنے کمرے سے نکل آئے اور میم صاحبہ کے کمرے پر جا کر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ غل بھی مچاتے تھے اور عاجزی بھی کرتے تھے۔ اندر سے میم صاحبہ جواب دیتی تھیں کہ میں دروازہ نہیں کھولتی۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ غل مچا کر دوسرے مسافروں کی نیند مت خراب کرو۔ صاحب بہادر نے اصرار کیا۔ تو میم نے دروازہ کھول دیا۔ دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ ہوٹل کے ملازم کھڑے تماشا دیکھتے مگر کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ کہ ان کو منع کرے۔ رات زیادہ ہو گئی اور ہم لوگوں کی نیند خراب ہونے لگی۔ سلیم بھائی نے صاحب بہادر کو منع کیا۔ کہ غل نہ مچاؤ اور میم صاحبہ کو نہ ستاؤ مگر وہ شخص اپنے ہوش میں نہ تھا۔ دونوں خوب نشہ میں تھے۔ صاحب بہادر کہنے لگے تم کو اس معاملہ سے کیا تعلق ہے۔ تم خاموش رہو۔ جھگڑا حد سے متجاوز ہونے لگا۔ تو میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ میں نے صاحب بہادر سے کہا کہ میں مقامی پولیس افسر ہوں اور ڈیوٹی پر ہوں۔ اگر تم خاموش نہ ہو گے اور اس جھگڑے کو ختم نہ کرو گے تو میں تم کو تھانہ پر بھجوا دوں گا۔ یہ سن کر صاحب کسی قدر مرعوب ہوئے اور کہنے لگے کیا واقعی تم پولیس افسر ہو۔ میں نے کہا ہاں یہ واقعہ ہے۔ سلیم بھائی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کون ہیں؟ میں نے کہا یہ میرے مددگار ہیں۔ میم کہنے لگی دیکھو پولیس کمشنر یہ شخص مجھ کو ستا رہا ہے۔ اسکے پاس

میرا روپیہ اور پاسپورٹ ہے۔ یہ دونوں چیزیں دلوادو۔ میں الگ کمرے میں
سونا چاہتی ہوں مگر یہ مجھے سونے نہیں دیتا۔ میں نے میم صاحب کو الگ لیجاکر
پوچھا اگر تم اس کی بیوی ہو تو پاسپورٹ دونوں کے الگ الگ کیوں ہیں۔ اس
نے کہا اصل بات یہ ہے کہ ہم دونوں لکھنؤ سے آئے ہیں۔ لندن جائیں گے
اس شخص کی بیوی مرچکی ہے اور اس کے دماغ میں کچھ خلل بھی ہے کُک کمپنی
نے مجھ سے یہ خواہش کی کہ تم بطور نرس اس کے ساتھ رہو اور نگرانی رکھو
اس لئے میں اس کے ساتھ ہوں۔ مگر یہ بد سلوکی کرتا ہے۔ اس قصّہ کو سننے
کے بعد میں نے صاحب بہادر سے کہا اس عورت کا پاسپورٹ اور روپیہ
دیدو۔ جب یہ تمھاری بیوی نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تمھارے کمرے
میں رہے بڑی حجت اور پس وپیش کے بعد اس نے جہاز کا ٹکٹ اور پاسپورٹ
نکالا۔ اور رسید لے کر میرے حوالہ کیا۔ البتہ رقم نہیں دی۔ ہم نے بھی اس
وقت زیادہ اصرار نامناسب خیال کیا۔ ٹکٹ اور پاسپورٹ تو میں نے
اپنے پاس رکھے اور میم سے کہا کہ تم دوسرے کمرے میں سوجاؤ صاحب
بہادر کو ایک کمرے میں بند کر کے کنجی میم کے حوالہ کر دی گئی وہ پہلو
کے کمرے میں سوگئی۔ لیکن صاحب خاموش نہ ہوئے اندر ہی سے غل
مچاتے رہے۔ میم کا نام لے کر روتے بھی تھے۔ میں نے کمرے کے پاس
کھڑے ہو کر اونچی آواز میں فرضی احکام دیئے کہ دو کانسٹبل اس کمرے کے
سامنے سوجائیں اگر صاحب غل مچائیں تو ان کو ہوٹل کے باہر کر دیا جائے
یہ احکام سُن کر بالکل خاموشی ہوگئی۔ اسی ہنگامے میں رات کے دو بج گئے بمشکل
نیند آئی۔ صبح کو معلوم ہوا کہ دونوں ایک کمرے میں تھے شاید رات کو کسی وقت ملاپ
ہوگیا۔ ہم لوگ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر جانے والے تھے کہ میم صاحبہ

ہمارے کمرے میں تشریف لائیں ان کے پیچھے صاحب بہادر بھی تھے مگر میم نے
صاحب کو اندر آنے سے روک دیا اور دروازہ بند کر لیا۔ اس کے بعد مجھ سے
کہنے لگی۔ کہ میرا روپیہ بھی اس کے پاس ہے وہ مجھے دلوا دو۔ میں نے کہا
تم ہوٹل کے منیجر سے کہو وہ کوئی بندوبست کرے گا۔ مجھ کو رقمی معاملات سے
کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ تمہارا پاسپورٹ اور جہاز کا ٹکٹ میرے پاس ہے
روانگی کے وقت دیدوں گا۔ یہ سن کر وہ چلی گئی ہم لوگ سیر کرنے کو چلے گئے
لیکن ہوٹل کے منیجر سے تمام واقعات پچھلی رات کے بیان کر کے یہ کہہ دیا کہ
رات کو پھر ہنگامہ ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ مقامی پولیس کو اطلاع دے دو بازار میں
کچھ خرید و فروخت کر کے دو بجے کے قریب ہوٹل واپس ہوئے۔ کھانے کے
کمرے میں صاحب اور میم دونوں ایک میز پر تھے۔ بظاہر ملاپ معلوم ہوتا
تھا۔ ہوٹل کے منیجر سے معلوم ہوا کہ ایک مقامی یوروپین پولیس افسر کو بلوایا
تھا اس نے میم کا پاسپورٹ طلب کیا۔ صاحب نے کہا اس ہوٹل میں ایک
پولیس کمشنر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پاسپورٹ ان کے پاس ہے افسر مذکور کو
تعجب ہوا منیجر نے الگ لیجا کر اصلی حقیقت سنائی وہ بہت محظوظ ہوا۔ اس نے
یہ انتظام کیا کہ پچاس روپیہ صاحب سے لے کر میم کے واسطے جمع کروا دیے
اور یہ وعدہ لے لیا کہ جہاز پر سوار ہونے کے بعد اور پچاس روپیہ دیدیے جائینگے
کھانے سے فارغ ہو کر صاحب بہادر میرے پاس آئے۔ رات کو جو بدتمیزی کی گئی
تھی اس کے متعلق معذرت کی اور آئندہ کے لئے مشورہ کے طالب ہوئے چونکہ
یہ شخص نشہ میں تھا۔ میں نے اس وقت ٹال دیا اور بلیرڈ روم میں چلا گیا وہ میرے
پیچھے وہاں بھی آیا اور لگا عاجزی کرنے کہ تم پولیس افسر ہو اور جہاز پر بھی
ڈیوٹی پر رہو گے۔ میں تم سے امداد چاہتا ہوں میرے ساتھ ہمدردی کرو

بڑی مشکل سے میں نے پیچھا چھڑایا اس کے بعد کچھ دیر تک رفیق بیگ کے
ساتھ میں بلیرڈ کھیلتا رہا۔

لطیفہ میرے ایک اسٹروک پر پیچھے سے آواز آئی (WELL
PLAYED SIR) خوب کھیلے جناب پلٹ کر دیکھا تو ہوٹل
کے دھوبی صاحب کھڑے تعریف کر رہے ہیں۔ یہ دھوبی کسی قدر انگریزی
جانتا ہے۔ بلیرڈ سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں لیٹنے کے واسطے گیا۔
صاحب بہادر نے مجھکو کمرے میں جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ فوراً آ کر پلنگ پر
بیٹھ گئے۔ اور اپنا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ میں نے بڑی مشکل سے ایک ملازم کے
ذریعہ اس کو اپنے کمرے سے نکلوایا۔ وہ چلا جاتا تھا کہ مجھ کو پولیس کمشنر سے ضروری
بات کرنی ہے۔ لیکن اس کو کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس مصیبت سے نجات
ملی تو بیم صاحبہ نے حملہ کیا۔ وہ بے تکلف کمرے میں داخل ہو گئیں اور پلنگ
پر بیٹھ گئیں۔ ان کو بھی کوشش کر کے نکالا گیا۔ شام کو سیر کے واسطے نکلے
کولمبو میں ایک مندر دیکھنے کے لائق ہے اس میں اچھی مورتیں اور تصاویر
ہیں۔ رات کو صاحب بہادر نے پھر وہی ہنگامہ کیا۔ منیجر نے ان کو سب سے
اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں تنہا بند کر دیا۔ رات بھر وہاں غل مچاتے رہے
ہم ۲۸ اپریل کو صبح کے وقت کولمبو پہنچے تھے۔ اور جہاز کی روانگی ۳۰ اپریل
کو شام کے وقت ہوئی۔ اس طرح تین روز کولمبو میں رہنے کا موقع ملا۔ ہر
رات بارش ہوئی جس کی کیفیت بالکل طوفانی تھی۔ موسم کی یہ حالت دیکھکر
مجھ کو یہ تشویش ہوئی کہ سمندر میں اگر طغیانی رہی تو ضرور متلی اور دوران سر
کی شکایت ہوگی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ نوبت نہ آئی۔ لیکن بعد کو جرمنی میں
غلام یزدانی صاحب کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ ہماری روانگی کے

بعد ہی کولمبو کے قریب ایک سخت طوفان آیا تھا جس نے کسی جہاز کو نقصان بھی پہنچایا۔ ۳۰ راپریل کو صبح کے وقت میم صاحبہ کمرے میں آئیں اور اپنا پاسپورٹ وغیرہ لے گئیں۔ کہتی تھی کہ ہم دونوں میں صلح ہو گئی ہے۔ میں نے کہا یاد رکھو! کہ میں جہاز پر بھی ڈیوٹی پر ہوں۔ کوئی بدعنوانی نہ ہونی چاہیئے اس نے وعدہ کیا کہ اب جھگڑا نہ ہوگا۔

آج جہاز کی روانگی کا دن ہے اس لئے سب مسافر اسباب باندھنے میں مصروف ہیں۔ کھانے کے وقت تک ہم نے اسباب باندھ لیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر شہر میں گئے۔ کولمبو میں ہم اکثر رکشا میں سوار ہوتے تھے۔ اور کرایہ کے متعلق ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔ بازار میں ہم کو خیال ہوا کہ تین کرسیاں خرید لیں تاکہ جہاز پر آرام رہے۔ لیکن کسی نے کہا کہ جہاز پر کرسیاں ملتی ہیں خریدنے کی ضرورت نہیں۔ ماسوا اس کے بازار میں کرسیوں کی قیمت زیادہ طلب کی جا رہی تھی۔ اس لئے ہم خاموش ہو گئے البتہ کک کمپنی کے دفتر سے میں نے ایک کتاب بول چال کے متعلق خریدی جو اس سفر میں مفید ثابت ہوئی۔ اس کتاب میں انگریزی الفاظ اور جملوں کا ترجمہ۔ فرانسیسی۔ جرمنی اور اطالوی زبانوں میں کر دیا گیا ہے۔ مسافر کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اکثر اوقات اس سے مدد لینے کی ضرورت ہوئی۔ شہر میں معلوم ہوا کہ جہاز اسٹریلیا سے آ چکا ہے چنانچہ جہاز کے بہت سے مسافر شہر میں پیدل اور موٹر پر سیر کرتے پھرتے تھے۔ جو لوگ پیدل تھے ان کی جان گائیڈ کے ہاتھ سے مصیبت میں تھی۔ ہر دکاندار اصرار کے ساتھ اپنی دکان پر بلاتا تھا۔ بعض مسافر ایسے بھی تھے جنہوں نے کبھی ممالک مشرقی میں قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ اس طریقہ پر تعجب کرتے تھے۔ چنانچہ بعد میں جہاز پر دو تین آدمیوں نے مجھے

ابوالہول اور اہرام مصری

پوچھا کہ کیا ہندوستان کے شہروں میں یہی دستور ہے کولمبو میں اردو رائج نہیں ہے۔ تامل اور انگریزی عام طور پر بولتے ہیں۔ کچھ دیر شہر میں سیر کرنے کے بعد ہوٹل کو واپس آئے۔ اور چائے پی کر سہ پہر میں بندرگاہ روانہ ہو گئے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اسباب کسی قدر بھیگ گیا۔ اگر ہوٹل کا ملازم جس کے سپرد اسباب کیا گیا تھا غفلت نہ کرتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ اس کا توسط اختیار کرنے میں سہولت یہ ہوئی کہ ہم کو جہاز پر اسباب مل گیا۔ ورنہ اجنبی آدمی پریشان رہتا ہے۔ بندرگاہ سے اسٹیمر کے ذریعہ جہاز پر گئے۔

جہاز کا سفر

یہ جہاز بیس ہزار ٹن کا ہے اور بالکل نیا بنا ہوا ہے یورپ سے ہندوستان کی طرف آنے جانے والے بڑے جہازوں میں اس کا بھی شمار کیا جاتا ہے دنیا کے جو بڑے جہاز ہیں وہ ہندوستان نہیں آتے۔ سنتے ہیں کہ سب سے بڑا جہاز آجکل میجسٹک ہے جو چھپن ہزار چھ سو بیس (۵۶۶۲۰) ٹن کا ہے۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ کتنا ہی بڑا جہاز کیوں نہ ہو۔ سمندر میں ایک تنکا معلوم ہوتا ہے۔ آسٹریلیا سے یورپ کو ڈاک اسی کمپنی کی معرفت جاتی ہے۔ جہاز پر چیچک کا صداقت نامہ۔ اور پاسپورٹ دیکھا گیا۔ روانگی سے قبل کک کمپنی نے ہم کو اطلاع دی تھی کہ مصر کے مسافروں سے جہاز والے بیس پونڈ بطور ضمانت لیتے ہیں اور یہ رقم بعد کو جہاز سے اترنے کے وقت واپس کر دی جاتی ہے تعجب ہے کہ ہم سے اس رقم کا مطالبہ نہیں ہوا۔ ہمارا کیبن یعنی کمرہ چھ مسافروں کا ہے۔ تین برتھ اوپر اور تین نیچے۔ ایک جانب منہ دھونے کا بیسن لگا ہوا تھا کانچ کی صراحی اور گلاس۔ صابن اور فی مسافر دو دو تولئے۔ غرض آسائش کا پورا سامان تھا البتہ پنکھے نہیں تھے۔ جس کی موسم گرما میں بہت ضرورت ہے

گرمی کے مارے کیبن میں ٹھہرنا مصیبت ہو جاتا ہے۔ ہماری خدمت کیواسطے
ایک ملازم مقرر ہے۔ یہ انگلستان کا باشندہ ہے۔ ایک تجربہ کار مسافر نے مشورہ
دیا کہ اپنے خدمت گار کو شروع ہی میں کچھ انعام دیدو تاکہ دلدہی سے تمھارا
کام کرتا رہے۔ فی الحقیقت یہ ترکیب مفید ثابت ہوئی۔ ؏
کہ مزدور خوشدل کند کار بیش

ہمارے ساتھی دو مسافر لکھنؤ سے لندن جا رہے تھے یہ دونوں فارغ التحصیل
ڈاکٹر ہیں۔ اور سرکاری ملازم ہیں۔ مزید تعلیم کے لئے رخصت لے کر دو سال کے
واسطے جا رہے ہیں۔ یہ دونوں ہندو ہیں۔ صرف گائے کا گوشت
نہیں کھاتے باقی سب چیزیں کھاتے ہیں۔ تیسرا مسافر رنگون کا باشندہ ہے
اس کا رنگ سیاہ ہے۔ قومیت معلوم نہیں ہوئی۔ لکھنؤ والوں کے ساتھ
پان اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں بھی ہیں۔ ہم بھی شریک حال ہو گئے
جہاز میں کمرے زیادہ وسیع نہیں ہوتے اس لئے اپنے ساتھ سامان
کم رکھنا چاہیئے وزنی اور غیر ضروری سامان کے لئے گودام الگ ہوتا ہے
ڈاکٹروں کے ساتھ سامان زیادہ تھا۔ مجبوراً کچھ سامان گودام بھجوا دینا
پڑا۔ اس جہاز پر تقریباً پندرہ سو مسافر ہیں۔ پانچسو کے قریب درجہ اول
میں ہے اور بقیہ تیسرے درجہ میں۔ درجۂ دوم اس کمپنی کے جہازوں
میں نہیں ہوتا تیسرا درجہ خاصا آرام دہ ہے۔ گھر سے چلتے وقت تیسرے
درجہ کا نام سن کر جو فکر ہوئی تھی وہ جاتی رہی۔ متوسط درجہ کے ہندوستانیوں
کے لئے بہت موزوں ہے صرف ایک بات اعتراض کے لائق ہے وہ
یہ کہ ہندوستانیوں کے لئے کھانے کی میز علحدہ ہے اور اسی لحاظ سے
کیبن میں بھی جگہ دی جاتی ہے۔ ہندوستانیوں کو اس برتاؤ کی کچھ عادت سی

ہو گئی ہے۔ اس لئے بیچارے اس فرق کو زیادہ محسوس نہیں کرتے۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ کہیں دوسری دنیا میں بھی یورپین لوگوں کے لئے بہشت اور دوزخ الگ نہ ہو۔ ہم کو تو اللہ میاں کے انصاف پر ہر طرح بھروسہ ہے مگر ایک صاحب کا اعتقاد یہ تھا کہ گوری قوم کے لئے جو دوزخ ہوگا وہ کالوں کی بہشت کے مساوی ہوگا۔ کہتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال موجود ہے۔ یوروپین قیدیوں کے جیل خانوں کو دیکھو اور اس کا مقابلہ کالے قیدیوں کے جیل خانوں سے کرو۔ ایک بہشت ہے اور دوسرا دوزخ۔

جہاز پر کھانا

تقریباً بیس ہندوستانی مسافر تیسرے درجہ میں ہیں۔ سب ایک ہی میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ صبح کی چائے کمرے ہی پر مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ چار دفعہ کھانا ملتا ہے ایک بڑا ڈائننگ ہال یعنے کھانے کا کمرہ ہے مسافروں کی کثرت کی وجہ سے تین دور ہوتے ہیں۔ میز پر مکھن۔ روٹی۔ مربا۔ چائے۔ کافی اور بسکٹ یہ چیزیں یا ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی کھانا برا نہیں ہوتا۔ مذہبی لحاظ سے جو چیز قابل اعتراض ہو اس کو چھوڑ دینے کے بعد بھی انسان بھوکا نہیں رہ سکتا۔ کبھی کبھی کھانے کے ساتھ آیسکریم بھی ملی۔ اور اکثر میوہ بھی کھانے میں آیا۔ رفری جیرٹر میں ٹھنڈا کیا ہوا پانی ہر وقت ملتا ہے۔ کھانے کے کمرے کے قریب ایک نل بھی لگا ہوا ہے جس وقت جی چاہے ٹھنڈا پانی پی سکتے ہو۔ تیسرے درجہ کے مسافروں کے لئے ایک بڑا کمرہ نشست کا علحدہ ہے یہ دیوانخانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے اس میں اعلیٰ درجہ کا فرنیچر اور برقی پنکھے موجود ہیں۔ ماسوا اس کے ایک پیانو اور ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ہے اگر جہاز کے دفتر میں ایک قلیل رقم جمع کرا دو۔ تو کتابیں ملجاتی ہیں۔ بعد میں رقم

واپس کردی جاتی ہے۔ لکھنے پڑھنے کیلئے قلم دوات اور میز لگی ہوئی ہے
جہاز کے مونوگرام کے کاغذ اور لفافے مفت ملتے ہیں۔ ایک اور بڑا کمرہ ہے
جس کو بار روم کہتے ہیں۔ یہاں ایک طرف شراب۔ لیمونیڈ۔ اور سگریٹ وغیرہ
کی دوکان ہے۔ میز کرسیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ برقی پنکھے چلتے رہتے
ہیں۔ اکثر مسافر یہاں تاش کھیلنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ ایک دکان
عام اشیاء کی ہے اس کو ڈیوٹی شاپ کہتے ہیں اس میں ضرورت کی اکثر
چیزیں ملتی ہیں۔ تیسرے درجہ کے واسطے چار ڈک ہیں۔ جہاز کی جس منزل
میں رہنے کے کمرے ہوتے ہیں اس کی چھت کو ڈک کہتے ہیں۔ ڈک پر سے
سمندر دکھائی دیتا رہتا ہے۔ اور خوب ہوا آتی ہے۔ اس لئے لوگ زیادہ تر
ڈک پر بیٹھے رہتے ہیں۔ کرسیاں ڈال لی جاتی ہیں اور دن سارا ڈک پر
گزر جاتا ہے۔ اس جہاز کے تیسرے اور چوتھے ڈک پر لوگ زیادہ
بیٹھتے ہیں۔ وہیں کھیل کود بھی ہوتا ہے مختلف اقسام کے کھیل مہیا کئے
جاتے ہیں۔ میں زیادہ تر ٹینس کھیلا کرتا تھا۔ خاصی چہل پہل رہتی ہے۔ ہم کو
باوجود کوشش کے کرسی نہیں ملی۔ جواب یہ ملا کہ سب کرسیاں ہو گئی ہیں۔ پہلے تو
ہم کو افسوس ہوا مگر بعد میں ہم نے آرام کی ایک جگہ نکال لی۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ اکثر
کرسیاں خالی پڑی رہتی ہیں۔ کیونکہ لوگ ادہر ادھر پھرتے رہتے
ہیں اگر کسی کرسی پر تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاؤ تو ہرج نہیں ہے
یہاں کچھ ایسا ہی قاعدہ پڑ گیا ہے۔ بعض لوگوں کی کرسیاں اسی جھگڑے
میں کھو بھی گئیں۔ نام کا لیبل یا تو گر جاتا ہے یا کوئی صاحب نکال بھی لیتے
ہیں۔ جس طرح کتاب کے سرقہ کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ وہی کیفیت ڈک چیر
کی بھی ہے۔ ڈک پر کرسیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ نہ کوئی قاعدہ ہے

اور نہ کوئی ترتیب جس کو سہولت ہوئی۔ وہیں اس نے کرسی ڈال لی۔ مسافر زیادہ اور جگہ کم۔ راستہ چلنا مشکل ہو گیا۔ اگرچہ چہل پہل رہتی ہے مگر بعض لوگ ہجوم سے پریشان بھی ہوتے ہیں۔

جہاز کے مسافر

زیادہ تر مسافر اسٹریلیا کے رہنے والے ہیں۔ بعض انگریز ہیں اور اپنے وطن کو واپس جا رہے ہیں لندن میں آسٹریلیا کے ساتھ جو کرکٹ میچ ہونے والا ہے اس کو دیکھنے کی غرض سے بہت سے لوگ جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کو سیر و سیاحت کا کس قدر شوق ہے سب سے زیادہ تعجب ان عورتوں پر ہوتا ہے جن کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں مگر کچھ پروا نہیں بچے بھی کیسے تربیت یافتہ ہیں نہ شور و غل ہے نہ مار پیٹ۔ ہندوستان کے لوگ سفر کے نام سے جس قدر پریشان ہوتے ہیں اتنا ہی ان لوگوں کو اس میں لطف آتا ہے۔ آسٹریلیا کے لوگ انگریزوں کی طرح متین اور کم سخن نہیں ہوتے بلکہ بہت جلدی بے تکلف ہو جاتے ہیں عورت مرد جس سے جی چاہے باتیں کرو۔ تعارف کی ضرورت نہیں۔ دو ایک آدمیوں نے تو ہم سے شکایت بھی کی کہ تم لوگ ضرورت سے زائد الگ الگ رہتے ہو۔ بعض نے زبردستی اپنے ساتھ کھیل میں شریک کیا۔ چند انگریز ایسے تھے جو آسٹریلیا والوں کی عادات اور بے تکلفی کو پسند نہیں کرتے تھے اور اپنے کو ان لوگوں سے الگ الگ ہی رکھتے تھے۔ چنانچہ آل انڈیا سروے والے صاحب بہادر کو دیکھا کہ سب سے الگ اپنی دونوں لڑکیوں کو لئے ہوئے رہتے تھے۔ نہ کسی سے بات نہ چیت۔ دو ایک دفعہ مجھ سے گفتگو کا موقع ہوا کہتے تھے کہ آسٹریلیا کے لوگ مجھ کو پسند نہیں میں ناحق اس جہاز سے آیا۔ مگر ہم کو آسٹریلیا والوں کی سادگی بہت پسند آئی۔ گرمی کی وجہ سے

سب نے کوٹ اتار دیے تھے۔ کھانے کے وقت بھی لباس کی پابندی نہ تھی۔ صرف
قمیص اور پتلون پہنے ہوئے چلے جاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ گرمی میں
ٹائی اور کالر بہت تکلیف دہ ثابت ہوئے۔ اکثر لوگ ہندوستان کے سیاسی
حالات پر ہم سے گفتگو کرتے تھے۔ ہندوستان کے متعلق ان کے معلومات
بہت محدود ہیں۔ بعض تو یہ بھی پوچھتے تھے کہ ہندو مسلمان میں کیا فرق ہے
اور گاندھی مسلمان ہے یا ہندو۔ ایک انگریز سے ملاقات ہوئی جس کی عمر
ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔ اسٹریلیا میں اپنے بچوں کو دیکھنے کے لئے گیا
تھا۔ لندن سے چار پانچ گھنٹے کی مسافت پر اس کا مکان ہے لیکن اس نے
کبھی لندن نہیں دیکھا یہ سن کر مجھ کو حیرت ہوئی۔

رات کو ڈک پر سونے کی اجازت تھی۔ ایک جانب مرد سوتے ہیں
اور دوسری جانب عورتیں۔ سب لوگ کیبن سے نیچے اپنے بستر اٹھا لائے
تھے۔ لیکن علی الصباح اٹھنا پڑتا تھا۔ کیونکہ اس وقت جہاز کا فرش دھویا جاتا
ہے۔ ہاتھ دھونے کیلئے ایک بہت وسیع کمرہ ہے۔ اس میں متعدد سیلاپچیاں
لگی ہوئی ہیں۔ سیلاپچی میں گرم اور ٹھنڈے پانی کے نل لگے ہوئے ہیں اس
کمرہ میں متعدد بیت الخلا اور حمام ہیں پہلے سمندر کے پانی سے نہانا پڑتا ہے
اس کے بعد تازہ پانی سے جسم دھونے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ سمندر کا
پانی کھاری ہوتا ہے۔ ایک بالٹی تازہ پانی کی جہاز کا ملازم دے دیتا ہے۔
ہندوستانی حضرات کو معلوم رہنا چاہئے کہ یہاں بیت الخلا میں پانی کا بندوبست
نہیں ہوتا۔ البتہ کاغذی گھوڑے، جتنے چاہو دوڑاتے رہو۔ بہتر ہوگا کہ اپنے
ساتھ ایک چھوٹی بوتل رکھ لی جائے ایک تماشہ یہ دیکھنے میں آیا کہ جب حمام
خالی نہیں ہوتا تو بعض بے شرم برہنہ ہو کر حمام کے باہر سب کے سامنے

نہانے لگتے ہیں عجیب تمدن اور معاشرت ہے غور کرنے کی بات ہے کہ اگر انسان شرم کو بالائے طاق رکھ دے۔ تو اشرف المخلوقات کیسے ہوسکتا ہے بے شرمی جانوروں کی خاصیت ہے۔ خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رض کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تنہائی میں بھی برہنہ ہوکر غسل نہیں کرتے تھے۔

مرد عورت کا ایک حوض میں نہانا

ایک بڑا حوض ہے اس میں عورت مرد ساتھ نہاتے اور تیرتے ہیں۔ بعض لوگ اطراف کھڑے ہوکر تماشہ دیکھتے رہتے ہیں نہانیوالی عورتوں کو مطلق حجاب نہیں ہوتا حالانکہ انکے جسم کا زیادہ حصہ برہنہ ہوتا ہے مشرقی تہذیب کے لحاظ سے یہ انتہا درجہ کی بیحیائی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ملک میں اخلاق کا معیار جداگانہ ہوتا ہے البتہ کچھ زمانہ پہلے یورپ میں بھی یہ طریقہ معدوم تھا۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ نئی نئی باتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ آل انڈیا سروے کے صاحب بہادر سے ایک دفعہ بسبیل تذکرہ میں نے پوچھا کہ تم اس طریقہ کو پسندیدہ نظر سے دیکھتے ہو انہوں نے نہایت جوش کے ساتھ مخالفت کا اظہار کیا۔ کہتے تھے ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے ذرا صبر کرو۔ یورپ میں قدم رکھنے کے بعد اس سے زیادہ دیکھوگے ہندوستان میں ایک مدت تک بود وباش رکھنے کی وجہ سے ان صاحب کے خیالات میں مشرق کی جھلک پائی جاتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی قوم کے دستور کے خلاف اپنی لڑکیوں پر سخت نگرانی رکھتے تھے باپ کی اجازت بغیر یہ لڑکیاں نہ تو کہیں جاتی تھیں اور نہ کسی سے بات کرتی تھیں۔

دلچسپی کا سامان

جہاز پہ سینما کا بھی بندوبست ہے رات کو کھانے کے بعد تماشا ہوا کرتا ہے۔ کچھ دینے کی ضرورت نہیں

اسکے علاوہ مسافر خود بھی ناچتے اور گاتے رہتے تھے۔ مختلف کھیلوں کے ٹورنمنٹ ہوئے ہیں۔ برج کے ٹورنمنٹ میں شریک ہوا۔ ایک لڑکی مس ہوپر نامی میری پارٹنر تھی۔ دو بازیاں ہم جیتے تیسری بازی میں اچھے پتے نہ آئے اور ہم ہار گئے۔ کھیل کے پہلے دور میں ہمارے مخالف ایک پادری صاحب تھے۔ پادری کا نام سُن کر ہندوستانی مولوی صاحبین کے غالباً کان کھڑے ہوجائینگے کہ آخر جنت کے اس ٹھیکہ دار کو لہو ولعب میں شریک ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اعتراض واجبی ہے لیکن یہ معلوم رہنا چاہئے کہ یوروپین مولوی ہمارے ہاں کے مولوی صاحب سے مختلف ہوتا ہے۔ باطن کی خبر تو عالم الغیب کو ہے۔ لیکن صورتِ ظاہری دیکھو تو زمین آسمان کا فرق پاؤگے۔ یوروپین مولوی اکثر ڈاڑھی موچھ کا جھگڑا نہیں رکھتا۔ اور کوٹ پتلون تو یہ کمبخت رات دن پہنے رہتا ہے۔ اب رہی صفت کی تو اس میں بھی اس کو دستگاہ نہیں۔ اس کے نزدیک عورتوں کے ساتھ ناچنا بھی داخل عیب نہیں ہے۔ غرض یہ کہ جنت کے راستے میں یوروپین مولوی زیادہ رکاوٹیں پیدا نہیں کرتا۔ دلچسپی کی ایک اور چیز یہ تھی کہ روزانہ جہاز کی رفتار پر شرط لگائی جاتی تھی۔ ایک بورڈ پر جہاز والے کچھ نمبر لکھ دیا کرتے تھے ان پر ٹکٹ خریدا جاتا تھا جو نمبر صحیح ہوتا اس پر جیت ہوتی۔ آخر میں ہم نے حساب ڈالا تو دس بارہ آنہ کی جیت رہی۔

تندرستی

سمندر میں سکون رہا کسی روز تھوڑی دیر کے لئے تموج بھی رہا جس کی وجہ سے جہاز کسی قدر ہلتا تھا۔ چند مسافروں کو دوران سر بھی ہوا مجھکو کچھ بھی محسوس نہ ہوا۔ سلیم بیگ کو بدہضمی کی شکایت ہوگئی۔ جہاز کے ڈاکٹر نے مسہل دیدیا۔ طبیعت ٹھیک ہوگئی۔ مجھ کو خلافِ عادت جہاز پر

نیند بہت معلوم ہوتی تھی۔ دن کے وقت میں کبھی نہیں سوتا تھا۔ یہاں ہر وقت نیند موجود رہتی تھی۔ سمندر کی ہوا نے میری صحت پر بہت اچھا اثر کیا۔ خلاف معمول بھوک معلوم ہوتی تھی اور خوب کھاتا تھا۔ البستہ حقہ کی یاد ہردم تازہ رہتی تھی ہرچند سگریٹ سگار پیتا۔ لیکن تشفی نہ ہوتی۔ متعلقہ دشواریوں کو نظر انداز کردیا جائے تو واقعی حقہ ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جہاز پر دس روز ہنسی خوشی کے ساتھ گذر گئے۔ ایک روز پھر رفیق بیگ کی ناف ٹل گئی۔ میں نے ہدایت کردی ہے کہ آئندہ ایسا نہ ہونے پائے۔ کیونکہ یورپ کے سفر میں ناف کا ٹلنا فیشن کے خلاف ہے۔ سلیم بھائی نے کہا شاید تم کو خبر نہیں کہ تمھارے پاسپورٹ میں بھی لکھا ہے کہ اس سفر میں ناف ٹلنے کی اجازت نہیں ہے اس کے خلاف اگر ہو تو پاسپورٹ منسوخ ہوجائے گا۔ غرض اس طرح کی دل لگی بھی ہوتی رہتی تھی۔ اس کا نام لطفِ صحبت ہے۔ یہ بات نہ ہو تو سفر دو کوڑی کا ہے۔ سلیم بیگ کو کسی قدر ہاتھ دیکھنا آتا ہے۔ انھوں نے اتفاق سے کسی مسافر کا ہاتھ دیکھ کر اس کو کچھ بتادیا۔ پھر کیا تھا پچاسوں آدمیوں نے ان کو گھیر لیا خصوصاً عورتوں نے بہت پریشان کیا۔ آخر کو ہاتھ دیکھتے دیکھتے گھبرا گئے۔ اور ایک روز کیبن ہی میں بند رہے مگر جان نہ بچی۔ عورتوں نے تقاضا کرکے باہر بلوا ہی لیا۔ غنیمت کہ سوئز قریب آگیا تھا ورنہ جان مصیبت میں رہتی۔ عورتیں زیادہ تر شادی اور اولاد کے متعلق سوالات کرتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ اعتقاد ہندوستان تک محدود ہے لیکن معلوم ہوا کہ یورپ کی عورتیں اس معاملہ میں ہندوستان کی عورتوں سے کچھ کم نہیں۔

لطیفہ

جہاز اور انسان کی حقیقت

کبھی کبھی کوئی جہاز بھی آتا جاتا نظر آتا تھا۔ مسافر مطمئن اسکو دیکھتے رہتے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ دوسرے جہاز کو دیکھنے کے بعد ہی اس بات کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ کہ سمندر میں اس کی کیا حقیقت ہے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ بڑے سے بڑا جہاز ایک حقیر ترین مچھلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان ضعیف البنیان کو دیکھو اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت کس کس طرح دیتا ہے۔ سمندر میں جہاز کا چلانا تو ایک پرانی اور بھولی ہوئی بات ہوگئی ہے مگر اب تو وہ ہوائی دنیا میں بھی قدم جمانے لگا۔ لیکن قدرت کا کارخانہ کچھ اور ہے۔ اس کی ماہیت کو اب تک کوئی سمجھ نہ سکا۔ انسان اپنی حد تک تو سب کچھ کر لیتا ہے مگر پھر بھی غیر مکمل ہے۔ یاد ہوگا کہ دنیا کے سب سے بڑے جہاز ٹیٹانک کا کیا حشر ہوا۔ جہاز بنانے والوں کو اپنی کاریگری پر بڑا ناز تھا۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ وہ فن جہاز سازی کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ لیکن تھا تو انسان ہی کا بنایا ہوا۔ اپنے پہلے سفر میں برف کی ایک سل سے ٹکرا کر چشم زدن میں معدوم ہوگیا۔ دنیا کے نامی گرامی اور ذی اثر لوگ اس میں سفر کر رہے تھے کسی کی عقل نے کچھ کام نہ کیا۔ اللہ میاں نے جب دیکھا کہ انسان اس عبرتناک واقعہ کو بھولتا جاتا ہے اور اس کو اپنی عقل پر روز بروز غرور ہوتا جاتا ہے تو انھوں نے پھر اس کی گوشمالی کردی۔ حال ہی میں انگریزوں کا سب سے بڑا ہوائی جہاز (آر۔ ا۔ ۱) ہندوستان کی طرف لندن سے روانہ ہو کر تیز رفتاری کے ساتھ عالم بالا میں چلا جا رہا تھا۔ کارکنان قدرت نے طعنہ زن ہو کر یہ شعر پڑھا۔

تو کار زمیں را نکو ساختی

کہ با آسماں نیز پرداختی

یکایک جہاز میں کچھ خرابی پیدا ہوئی اپنی بلند پروازی کو بھول گیا اور بیک بینی و دو گوش زمین کی طرف رجوع ہوا۔ اس جہاز کی بڑی دھوم دھام تھی مگر آناً فاناً میں کچھ سے کچھ ہو گیا۔ انسان کو چاہئے کہ اپنی حقیقت کو پہچانے۔

پانچویں مئی کو افریقہ کا کنارا قریب آ گیا۔ فاصلہ پر کچھ پہاڑ دکھائی دینے لگے۔ لوگ اپنی اپنی دوربینوں کو لگا کر بڑے شوق سے ان پہاڑوں کو دیکھتے رہے۔ بات یہ ہے کہ پانی کو دیکھتے دیکھتے طبیعت گھبرانے لگتی ہے اور کبھی زمین نظر آئے تو بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس کو دیکھتے رہتے ہیں چھٹی مئی کو شام کے وقت باب المندب کے قریب پہنچے۔ جزیرۂ بیرم کے چراغ دکھائی دیتے تھے۔ درجۂ اول کا ایک مسافر قلب کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے مر گیا۔ اس غریب کو کیا خبر تھی۔ بیچ سمندر میں حضرت عزرائیل نمودار ہوں گے۔ اس بھید سے انسان بالکل بے خبر رکھا گیا ہے

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ٥

(اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کہاں مرے گا۔ بے شک اللہ ہی جاننے والا باخبر ہے)

اس کی لاش سمندر میں ڈال دی گئی۔ خدا ایسی موت سے محفوظ رکھے۔ رات کو کسی وقت بحر احمر میں داخل ہو گئے۔ یہاں کی گرمی مشہور ہے۔ پہلے دن تو بڑی تکلیف رہی۔ پسینے چھوٹتے رہے۔ لیکن دوسرے روز خنکی تھی۔ اور سمندر میں کسی قدر جوش تھا۔ جہاز میں روزانہ اخبار تقسیم ہوتا ہے۔ چھٹی مئی کو گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر ملی۔ ایک دن کچھ دیر کے لئے

بڑی تفریح رہی ہر مسافر کو ایک لائف بلٹ دی جاتی ہے۔ یہ ایک قسم کی
پیٹی ہے۔ جس میں خاص قسم کے تکیے لگے ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ کسی وجہ
سے جہاز ڈوبنے کی نوبت آئے تو اس پیٹی کو باندھ لینا چاہئے۔ اس کے
سہارے انسان پانی پر بہتا رہتا ہے۔ جہاز والے ایک روز جملہ مسافروں کو
اس پیٹی کے ساتھ مقررہ جگہ پر جمع ہونے کی ہدایت دیتے ہیں۔ سب مسافر
پیٹی باندھ کر جمع ہوتے ہیں اس وقت کی کیفیت تصویر لینے کے لائق ہوتی
ہے۔ میں نے مذاقیہ طور پر کپتان سے پوچھا "کیا ڈوبتے وقت پاسپورٹ بھی
جیب میں رکھنا لازمی ہے"۔ اس پر بڑی ہنسی ہوئی۔ نو مئے کو سہ پہر کے
وقت خلیج سوئز میں داخل ہوئے دائیں جانب خلیج اکابہ ہے۔ دونوں جانب
پہاڑیوں کا سلسلہ دکھائی دیتا ہے یہ منظر خوش نما تھا۔ ہم نے اسباب
باندھنا شروع کر دیا۔ اگرچہ ٹکٹ پورٹ سعید کا لیا ہے۔ مگر سوئز پر اترنے کا
ارادہ کر لیا۔ کیونکہ یہاں سے قاہرہ قریب پڑتا ہے۔ جہاز کے افسر کو اپنے
ارادے سے مطلع کیا۔ وہ حجت کرنے لگا۔ کہ سوئز پر اترنے کی اجازت نہیں
مل سکتی۔ کیونکہ وہاں کروڑگیری کا دفتر نہیں ہے اس کی لاعلمی پر ہم کو تعجب ہوا
ہم کو یہ معلوم تھا کہ سوئز پر مسافر اترا کرتے ہیں آخر کو اس نے جواب دیا کہ
کل سوئز پہنچنے کے بعد تصفیہ کروں گا۔

سوئز

دس مئے صبح آٹھ بجے کے قریب سوئز پہنچے کنارہ سے کچھ فاصلہ پر
جہاز ٹھہر گیا مصری سوداگر کشتیوں میں مختلف قسم کا سامان لیکر
جہاز کے قریب آگئے۔ اکثر مسافروں نے مہنگے داموں پر خریدیں۔ لطف
یہ تھا کہ خریدنے والے عربی سے ناواقف اور بیچنے والے انگریزی سے کورے
چند الفاظ ان لوگوں نے سیکھ لئے ہیں۔ اسی سے کام نکالتے ہیں جس وقت

جہاز نے لنگر ڈالا۔ عجیب ہنگامہ برپا ہوا۔ کچھ مسافر جو سوئز پر اُترنے والے تھے وہ اپنے اسباب کی فکر میں اِدہر سے اُدہر پھرتے تھے کچھ لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ بہت سے مصری سوداگروں کا تماشہ دیکھتے تھے ایک بڑی تعداد ایسے مسافروں کی تھی جو ایک روز کے لئے قاہرہ کی سیر کو جانے والے تھے۔ یہ لوگ دوسرے دن پورٹ سعید پر جہاز میں سوار ہو جائیں گے غرض یہ کہ جہاز پر ایک تہلکہ پڑ گیا۔ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں تھا۔ ایک سیاہ رنگ کے ہندوستانی پادری صاحب اِدہر سے اُدہر مارے مارے پھرتے تھے۔ اس بیچارے کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ مذہبی پیشوا ہیں تو ہوا کریں آجکل مذہب ہی کو کوئی نہیں مانتا پیشوا کو کون پوچھے گا۔ ہم کو اپنا اسباب اُتروانے کی جلدی تھی۔ کمرے کا خادم جہاز کے دروازے تک ہمارا اسباب لایا۔ دستور کے مطابق اس کو انعام دیا گیا۔ ڈائننگ ہال کا ملازم جو ہماری میز پر کام کرتا تھا انعام کی امید میں دروازے پر ملا۔ اس کو بھی ہم نے کچھ دیدیا ہندوستانیوں کی قسمت دیکھو کہ جہاز پر سوار ہوتے ہی یورپین خادم کام کرنے کو ملتے ہیں۔ جہاز کے قریب کئی ایک کشتیاں کرایہ کی آ گئیں۔ جہاز کے افسر نے ہمکو اترنے کی اجازت دے دی ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ اس میں سات مسافر اور تھے۔ تین عورتیں اور چار مرد۔ عورتوں میں ایک لڑکی امر یکن تھی۔ اس کی عمر بائیس سال کے قریب ہوگی۔ ایک خاتون مسز کروک کسی قدر سن رسیدہ اور بیوہ ہیں۔ تیسری مسز لشائی ہیں جن کے خاوند مسٹر لشائی بھی ساتھ ہیں۔ بقیہ تین آدمی ان کے دوست ہیں۔ یہ سب اسٹریلیا سے لندن جا رہے ہیں۔ محض قاہرہ کی سیر کے واسطے سوئز پر اُترے ہیں۔ مسٹر اور مسز لشائی سے جہاز پر کسی قدر روشناسی ہو گئی تھی ان سب نے کہا کہ

تم لوگوں کی وجہ سے ہم کو تقویت ہو گی۔ اگر سب ساتھ رہیں تو اچھا ہے۔ ہم نے بھی اس بات کو منظور کر لیا۔ کنارے پر پہنچنے کے بعد ایک بڑی مہم پیش آئی یعنے کسٹم ہوز میں اسباب کا معائنہ کرانا لازمی تھا۔ اس میں کوئی نصف گھنٹہ لگ گیا۔ اسباب کا معائنہ بہت تفصیل کے ساتھ ہوا۔ حتیٰ کہ سگریٹ کیس بھی کھول کر دیکھا۔ ہمارے پاس کوئی چیز محصول طلب نہ تھی۔ پاسپورٹ کی جانچ پڑتال بھی ہوئی۔ اس کا خیال رہے کہ پاسپورٹ سرحد کے مقام پر ضرور دیکھا جاتا ہے اس کو اپنے جیب میں بہت حفاظت کے ساتھ رکھنا چاہیئے۔ اگر خدانخواستہ یہ کھو جائے تو بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا یمعائنہ کے بعد افسر متعلقہ پاسپورٹ پر مہر کر دیتا ہے اس کام سے فارغ ہونے کے بعد موٹروں کی فکر ہوئی۔ سوئز سے ریل کے ذریعہ بھی قاہرہ جا سکتے ہیں لیکن ریل کا وقت نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ اس میں عرصہ بھی زیادہ لگتا ہے اس لئے ہم نے موٹروں کے ذریعہ جانا پسند کیا۔ متعدد موٹریں موجود تھیں۔ لیکن کرایہ ٹھہرانے میں بڑی تکرار رہی نصف گھنٹے کے قریب وقت ضائع ہوا۔

غیر متعلق اشخاص کی مداخلت

دو ایک غیر متعلق آدمی جن کو بظاہر دنیا میں کوئی دوسرا کام نہ تھا ناخواندہ دخیل ہو گئے۔ یہ چاہتے تھے کہ موٹران کے توسط سے کرایہ پر لیجائے اور کچھ رقم بطور محنتانہ ان کی نذر کیجائے۔ ہر چند ان کو ٹالنا چاہا۔ لیکن روزانہ اس کام کو کرتے کرتے یہ لوگ بے حیا ہو گئے ہیں ان کے دخیل ہونے کی وجہ سے اور بھی طوالت ہوتی تھی۔ ہمارے بھائی سلیم بیگ بڑے حکمت عملی کے آدمی ہیں انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ اس مصیبت کو ٹالا۔ ہم کو تین موٹروں کی ضرورت تھی۔ بڑی ردوقدح کے بعد فی موٹر تین پونڈ کرایہ طے پایا۔ سوئز

سے قاہرہ ایک سو تین میل ہے کچھ دیر شہر میں کھانے پینے کی چیزیں خریدیں
سوئز ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ سمندر کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے کسی قدر
رونق رہتی ہے ہم جس روز پہنچے عید الضحیٰ کا دن تھا۔ نماز سے لوگ واپس
ہو رہے تھے چہل پہل تھی اگر ہم کو بمبئی سے جگہ مل جاتی تو قاہرہ میں عید کی نماز
پڑھتے وقت کی تنگی نے اس کا بھی موقع نہ دیا۔

سوئز تا قاہرہ

تقریباً دس بجے سوئز سے روانہ ہوئے۔ دھوپ تیز تھی اور ہوا میں
گرمی تھی۔ تمام راستہ ریگستان ہی میں سے گذرا۔ اچھی سڑک
بنانے کی کوشش کیجا رہی ہے ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ گرمی کی وجہ سے
پیاس شدت کے ساتھ معلوم ہونے لگی اپنے ساتھ سوائے نان پاؤ کے اور کچھ نہ تھا
سنگترے کی قسم کا ایک میوہ پرتغال ہوتا ہے۔ چند پرتغال سوئز سے خرید لئے گئے
پانی کی طرف سے بالکل مایوسی تھی کیونکہ آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ چاروں
طرف ریت کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ موٹر والے انگریزی سے ناواقف اور
ہم عربی سے محروم۔ اس لئے ان سے کوئی مدد نہ ملی۔ بالآخر اس چٹیل میدان میں
ایک چھوٹا سا کمرہ سڑک کے کنارے نظر آیا۔ قرینہ سے معلوم ہوتا تھا کہ سڑک
کی تعمیر میں یہ کوئی چوکی ہے یہاں موٹروں کو ٹھہرایا گیا۔ میں پانی کی فکر
میں چوکی کے اندر گیا۔ وہاں دو حبشی خوفناک شکل کے بیٹھے ہوئے تھے
ان کے گلوں پر داغ کے لمبے لمبے نشان تھے۔ پانی کی چھاگلیں دیوار پر
لٹک رہی تھیں۔ زمین پر ایک جانب برف کی بہت بڑی سل پڑی ہوئی
تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو خوشخبری سنائی۔ سب جمع ہو گئے۔ ایک حبشی
کے ہاتھ میں ایک شلنگ رکھ دیا اور اشاروں سے اپنا مطلب سمجھایا۔ پانی
خود ہی ٹھنڈا تھا۔ ریگستان کی گرم ہوا چھاگل میں پانی کو سرد رکھتی ہے تاہم

پتھر سے برف توڑ توڑ کر خوب کھائی۔ حبشی معترض بھی ہوا کہ پانی ٹھنڈا ہے تو برف کیوں خراب کرتے ہو۔ لیکن محض پانی سے تسکین نہ ہوئی۔ اس جگہ نصف گھنٹہ کے قریب ٹھہر کر روانہ ہو گئے۔ ہمارا شوفر فیشن ایبل ہے۔ ہم کو اپنے پاس سے سگریٹ پلاتا جاتا تھا۔ بات چیت اشاروں میں ہوئی۔ گرم ہوا سے تکلیف ہونے لگی۔ اس لئے ہوا کے رُخ پر پردے لگا دیے۔

قاہرہ ڈیڑھ بجے کے قریب قاہرہ پہنچے۔ سلیم بھائی یہاں پہلے آ چکے تھے اپنے سابقہ ہوٹل کا پتہ ان کو معلوم تھا وہیں چلے گئے۔ یہ ہوٹل قاہرہ کے ممتاز محلہ ازبکیہ میں ہے۔ اس کو برسٹل ہوٹل کہتے ہیں عمارت بڑی اور ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ صرف قیام اور ناشتہ کے فی کس سات شلنگ روزانہ دینے پڑے۔ دونوں وقت کا کھانا اور سہ پہر کی چائے اس سے الگ ہے۔ جس وقت ہوٹل پہنچے گرمی اور موٹر کے سفر کی وجہ سے طبیعت کسلمند تھی۔ ہوٹل میں اسباب رکھوایا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ بھوک بھی معلوم ہو رہی تھی۔ اسی ہوٹل میں کھانا کھایا۔ انگریز مسافروں کو اس روز کے لئے ہم نے مہمان کر لیا۔ نہانے کو دل چاہتا تھا لیکن وقت نہ ملا۔ انگریز احباب اسی دن سب کچھ دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ صبح کی ریل سے دوسرے دن ان کو پورٹ سعید جانا تھا۔

اہرام مصری چار بجے موٹروں میں سوار ہو کر اہرام مصری دیکھنے گئے۔ جس زمانہ میں موٹریں نہیں تھیں لوگ اونٹوں اور گدھوں پر جایا کرتے تھے اب بہت کم لوگ اس سواری کو اختیار کرتے ہیں وہاں تک ٹرام بھی جاتی ہے عید کا روز تھا اس لئے بازار میں کسی قدر غیر معمولی گھما گھمی تھی۔ اہرام مصری قاہرہ کے قریب رتیلے میدان میں واقع۔

مصر کا ایک شربت بیچنے والا

ہیں۔ان کی تعداد بہت ہے لیکن تین مینار سب سے بڑے ہیں یہاں جہاز کے اکثر مسافر ہم کو اونٹوں پر سوار ملے۔موٹر سے اترنے کے بعد کچھ دور ریت میں پیدل جانا پڑا۔سوئز کی طرح یہاں بھی بعض لوگوں نے پریشان کیا یہ لوگ اپنے کو ترجمان یا رہبر ظاہر کر کے ساتھ ہو جاتے ہیں لمبے لمبے چغے پہنتے ہیں بعض ترکی ٹوپی استعمال کرتے ہیں اور بعض شملہ باندھتے ہیں۔مادری زبان عربی ہے۔کام نکالنے کی غرض سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی سیکھ لی ہے۔ آپ ہزار ان کو ساتھ لینے سے انکار کریں یہ کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ چار پانچ آدمی ہو لئے۔ان کے ساتھ ہونے سے صرف ایک فائدہ ہوا یعنی پیاس کا جب زور ہوا تو ان ہی میں سے ایک شخص لیمو نیڈ کی بوتل کہیں سے لے آیا مگر دام بھی اس نے من مانے لئے۔اہرام کے قریب ایک جگہ سایہ تھا۔گرمی کی وجہ سے آرام لینے کی ضرورت تھی اس لئے کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے وہاں سے چاروں طرف کا منظر بھی دکھائی دیتا تھا۔دنیا کے عجائبات میں ان میناروں کا بھی شمار ہے۔جغرافیہ میں اہرام مصری کا ذکر پڑھا تھا اور یہ معلوم تھا کہ دنیا کے سات عجائبات میں ان کو ممتاز حیثیت حاصل ہے اس تصور نے ایک قسم کی دلچسپی پیدا کر دی۔ورنہ بہت کم لوگ اس پتھر اور چونے کے تودہ دیکھ کر خوش ہوتے ہوں گے۔البتہ ان ارباب فن کا ذکر نہیں جو چشم بصیرت سے ان چیزوں کو نہ صرف دیکھتے ہیں بلکہ اپنا قیمتی وقت صرف کر کے ان میناروں کی اصلیت دریافت کرتے رہتے ہیں۔مگر معمولی سیاح کے لئے یہ عجائبات چنداں دلچسپ نہیں ہیں۔نہ تو اس مقام پر کوئی فرحت ہوتی ہے۔اور نہ کوئی عجیب بات محسوس ہوتی ہے۔اس کے مقابلہ میں کوئی جاہل سے جاہل آدمی آگرہ کا تاج محل دیکھے تو ضرور اس کے دلدادہ ہو

خاص اثر ہوگا۔

برادر عزیزم غلام یزدانی صاحب (ناظم آثار قدیمہ سرکار عالی) اس موقعہ پر بہت یاد آئے۔ وہ ہوتے تو ایک ایک نکتہ پر روشنی ڈالتے۔ ہم کو اتنی بات تو ضرور محسوس ہوئی کہ جن لوگوں نے ان میناروں کو بنایا وہ بڑے باہمت اور مستقل مزاج تھے۔ یہ مینار دراصل مصر کے قدیم بادشاہوں کی قبروں کے گنبد ہیں اس وقت اندر جانے کی ممانعت تھی اور دروازہ پر سپاہی کھڑا تھا۔ ان میناروں میں سب سے اونچا مینار چار سو پچاس فیٹ بلند ہے خیال کرنے کی بات ہے کہ جن بادشاہوں کی قبریں عجوبہ روزگار رہوں۔ انہوں نے کس شان و شوکت کے ساتھ زندگی بسر کی ہوگی مگر اب ان کے نام صرف قدیم تاریخوں میں باقی رہ گئے ہیں۔ سہ

نوبت بوم میزند بر گنبد افراسیاب ۔۔۔ پردہ داری میکند بر طاق کسریٰ عنکبوت

اسی مینار کے قریب ایک زبردست سو فیٹ اونچی پتھر کی مورت ہے جس کو ابوالہول کہتے ہیں۔ یہ بہت قدیم مورت ہے۔ اس کا جسم اور پنجے شیر ببر کے جسم اور پنجوں سے مماثلت رکھتے ہیں لیکن چہرہ اور سینہ عورت کا ہے بحیثیت مجموعی یہ ایک باشوکت مجسمہ ہے۔ امتداد زمانہ کی وجہ سے کہیں کہیں شکستہ ہوگیا ہے سر مغرب ہمارا قافلہ یہاں سے روانہ ہوا۔ ترجمان لوگوں کو کچھ دے دلا کر جان چھڑائی۔ قریب میں ایک اونٹ بیٹھا ہوا تھا مسز لشائی نے چاہا کہ اونٹ کے قریب کھڑے ہو کر اپنی تصویر لیوائیں مگر یہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ اونٹ والے نے میم صاحب کے شوق کا اندازہ کر لیا وہ پانچ شلنگ لئے بغیر اونٹ کے پاس بھی آنے نہیں دیتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک شلنگ پر راضی ہوا۔

یہاں سے روانہ ہو کر محمد علی پاشا کی مسجد گئے جو قلعہ میں ہے راستہ میں کئی جگہ آبشورہ پیا۔ دن بھر کی گرمی نے پیاس میں زیادتی کر دی تھی یہ مسجد شہر کے اندر بلند مقام پر واقع ہے قلعہ میں انگریزی فوج رہتی ہے یہ مسجد عالیشان اور دیکھنے کے لائق ہے۔

تھیٹر میں ہنگامہ

مسجد دیکھنے کے بعد بازاروں میں پھرتے رہے۔ کھانا بھی بازار میں کھایا۔ رسٹورا ن میں بڑا مجمع تھا۔ ایک جانب موسیقی بھی ہو رہی تھی۔ انگریز مسافروں نے کچھ خرید و فروخت کی۔ رات کو ایک عربی تھیٹر میں گئے سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اور تماشہ بھی معمولی تھا۔ بیچ تماشہ میں ایک ہنگامہ ہوا۔ شائد کوئی شخص بلا ٹکٹ اندر آنا چاہتا تھا۔ مارپیٹ شروع ہو گئی۔ ہم لوگ تھیٹر کے باہر چلے گئے۔ پولس نے دو ایک آدمیوں کو پکڑ کر خوب کوڑے لگائے۔ تھوڑی دیر میں سکون ہو گیا۔ تماشہ دیکھ کر ہوٹل واپس آ گئے تکان غالب تھی اور نیند کا زور تھا علی الصبح اٹھنا بھی تھا کیونکہ انگریز دوست پورٹ سعید جانے والے تھے۔

ایک پریشانی

صبح چھ بجے ان کو اسٹیشن پہونچایا۔ وہاں ایک فکر پیدا ہو گئی جہاز پر سے ایک بہت بڑی پارٹی قاہرہ کی سیر کو کک کمپنی کی معرفت آئی تھی اس کمپنی نے خاص اپنے مسافروں کے لئے اسپشل ٹرین کا انتظام کیا تھا جو یقینی طور پر جہاز کی روانگی سے قبل مسافروں کو پورٹ سعید پہونچا دیتی ہمارے دوستوں نے کک کمپنی کا توسط اختیار نہیں کیا تھا۔ بلکہ اپنے طور پر چلے آئے تھے۔ اگر معمولی ریل سے یہ لوگ پورٹ سعید جاتے تو جہاز کے ملنے میں احتمال تھا۔ کک کمپنی کا ایجنٹ پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ اس نے ہمارے دوستوں کو اسپشل ٹرین سے جانے کی اجازت

نہیں دی۔ یہ سب لوگ پریشان ہوے اور بات بھی پریشانی کی تھی کیونکہ اس امر کا اطمینان نہ تھا کہ معمولی ریل سے وقت پر پہونچیں گے۔ اگر نہ پہونچے تو پورے پندرہ روز پورٹ سعید پر دوسرے جہاز کے انتظار میں پڑے رہو۔ کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی اور اسپشل ٹرین کی روانگی کا وقت قریب تھا میری نظر جہاز کے ایک افسر پر پڑی جو مسافروں کے ساتھ آیا تھا۔ اس سے سرسری ملاقات جہاز پر ہوگئی تھی۔ میں نے اس سے حالات بیان کئے اور امداد چاہی۔ آدمی بامروت تھا معلوم نہیں اس نے کمپنی کے ایجنٹ سے کیا کہا مگر اس نے ہمارے دوستوں کو اسپشل میں جانے کی اجازت دیدی مسز لشائی اور مسز کردک نے ہم سے یہ وعدہ کیا کہ لندن میں ہمارے قیام کے لئے کوئی اچھی جگہ معلوم کرکے ہم کو اطلاع دیں گے۔ ہم نے برلن کے پتہ پر خط لکھنے کے واسطے کہہ دیا۔ اسٹیشن سے سیدھے ہوٹل واپس آئے۔ گزشتہ دن ضرورت سے زائد گردش رہی تھی۔ اس لئے آرام لینے کی ضرورت ہوئی۔ پورا دن ہوٹل ہی میں گذار دیا شام کو نہا دھو کر تازہ دم ہوئے۔

قاہرہ کی تاریخ

قاہرہ ایک دلچسپ شہر ہے۔ متعدد قدیم عمارتیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ دریائے نیل کے دائیں کنارے پر یہ شہر واقع ہوا ہے۔ آبادی سات لاکھ سے اوپر ہوگی اس شہر کی ابتدا ساتویں صدی عیسوی کے درمیان اس طرح ہوئی تھی کہ خلیفہ دوم کے سپہ سالار عمرو ابن العاص نے مصر کو فتح کرکے اپنا مرکز اس جگہ قائم کیا۔ اُس وقت اس شہر کا نام الفسطاط رکھا گیا۔ روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ سپہ سالار موصوف نے اپنا خیمہ اس نواح میں نصب کرکے اسکندریہ کی جانب کوچ کیا اور اس شہر کو فتح کرنیکے

بعد اس مقام پر واپس ہوئے۔ اسی زمانہ سے شہر کی ابتداء ہوئی۔ عربی زبان میں فسطاط خیمہ کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اس مناسبت سے یہ شہر موسوم ہوگیا۔ رفتہ رفتہ عالیشان مکانات اور مساجد تعمیر ہوئیں لیکن ۹۶۹ء میں ایک دوسرے عرب فاتح نے الفسطاط کے شمال و مشرق میں قاہرہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۱۵۱۷ء میں ترکوں نے اس شہر کو فتح کر کے تقریباً تین سو برس تک حکومت کی۔ درمیان میں نپولین بوناپارٹ نے مصر کو فتح کر کے قاہرہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۰۱ء میں انگریزوں کی مدد سے ترک دوبارہ قابض ہوئے۔ مگر یہ حکومت پائدار ثابت نہ ہوئی۔ انگریزوں کا اثر روز بروز زیادہ ہوتا گیا۔ ترکوں کی حکومت باقی نہ رہی اب اگرچہ مصری سلطنت ہے لیکن انگریزوں کا اثر قائم ہے۔ اس تاریخی کایا پلٹ کی وجہ سے فرانسیسی اور انگریزی زبان بھی رائج ہے۔ مادری زبان عربی ہے۔

قاہرہ کے بازار

شہر کا ایک حصہ قدیم ہے جس کے بازار تنگ اور عمارتیں بوسیدہ ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن دوسرا حصہ نسبتاً جدید ہے مثلاً اُزبکیہ۔ اسماعیلیہ اور قصر الدُّبارہ۔ اس حصہ میں یوروپین وضع کی شاندار عمارتیں اور چوڑی سڑکیں ہیں۔ ایک اور حصہ حال ہی میں تعمیر ہوا ہے بلکہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا۔ یہ قاہرہ جدید کے نام سے موسوم ہے۔ عالیشان عمارتیں اور وسیع سڑکیں ہیں۔ یورپ کی قربت اور موقع کی خوبی نے اس شہر کی ترقی میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ ہر سال ہزارہا سیاح یورپ و امریکہ سے یہاں آتے ہیں جن کی خاطر دوکانوں میں کثرت سے ہر قسم کا مال بھرا پڑا ہے۔ کھانے کی دکانیں کثرت سے ہیں۔ زبان کی اجنبیت کی وجہ سے کھانے کے انتخاب میں دقت ضرور ہوگی۔ سگریٹ فروش ہر جگہ ملتے ہیں۔ ایک بڑا تختہ ہوتا ہے جس میں

انواع و اقسام کے سگریٹ کے بکس جا لیتے ہیں۔ یہ تختہ گلے میں لٹکا رہتا ہے
سگریٹ کے ساتھ دیا سلائی کی چھوٹی سی ڈبیا مفت ملتی ہے آبشورہ بیچنے والے
بھی بازاروں میں پھرتے ہیں۔ کانچ کا ایک بڑا برتن مرتبان کی شکل کا ہوتا ہے
اس میں ٹونٹی لگی رہتی ہے۔ مرتبان میں برف کا ٹکڑا آبشورہ کو ٹھنڈا رکھتا ہے چمڑے
کی مشک والا سقہ اب کم دکھائی دیتا ہے۔ دکاندار راستہ چلنے والوں کو بلاتے بھی
ہیں۔ خرید و فروخت میں مسافروں کو احتیاط چاہئے۔ کیونکہ قیمتوں کا کچھ بھروسہ
نہیں ہے۔ امریکن سیاحوں نے عادت بگاڑ دی ہے ایک دکاندار مجھ سے کسی چیز
کی قیمت بہت مانگنے لگا میں نے کہا میں امریکن نہیں ہوں بلکہ ہندوستانی ہوں
اس نے بلا تکلف جواب دیا کہ پھر تو آپ کے لئے دوسری قیمت ہے یہی کیفیت
قلیوں اور گاڑی والوں کی ہے۔ اجنبی آدمی کو لوٹنے کی فکر میں رہتے ہیں کمسن
لڑکے اکثر جوتا صاف کرنیکا سامان لیے پھرتے ہیں۔ آپ کو ضرورت نہ ہو تو بھی
وہ اصرار کرتے ہیں کہ پالش کروالو۔ یہاں کے بازاروں میں ایک نئی بات یہ بھی
دیکھنے میں آئی کہ پچاسوں آدمی لاٹری کے ٹکٹ فروخت کے واسطے لئے پھرتے
ہیں۔ اور بہت اصرار کرتے ہیں۔ یہ ٹکٹ مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔

لباس وغیرہ

باشندوں کے تمدن اور معاشرت پر مغرب کا اثر روز بروز گہرا ہوتا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ متوسط درجہ کے لوگ
کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ البتہ ترکی ٹوپی کو استقلال کے ساتھ اب تک قائم رکھا
ہے۔ یہاں کی ترکی ٹوپی ہندوستان کی ترکی ٹوپی سے کسی قدر اونچی ہوتی ہے
نرم ٹوپی پہننے کا رواج نہیں ہے قدیم وضع کا لباس ادنیٰ طبقہ میں زیادہ تر
پایا جاتا ہے مسلمان عورتیں اگرچہ نقاب پوش ہیں۔ لیکن یہ نقاب برائے نام ہوتی ہے
نصف حصہ چہرے کا کھلا رہتا ہے۔ بقیہ نصف پر باریک کپڑے کی نقاب

ہوتی ہے۔لیکن صورت پہچانی جاتی ہے اس پردہ سے نہ ہونا بہتر ہے نقاب کو
قائم رکھنے کے لئے ایک بدنما چیز ناک پر لگاتے ہیں جو لکڑی کی بنی ہوئی
ہوتی ہے اس پر سونے کا ملمع کر لیتے ہیں۔ برقعہ ہمیشہ سیاہ رنگ کا پہنا جاتا ہے
ہندوستان کی عورتوں کی طرح رنگ برنگ کا برقع نہیں پہنتے۔اکثر عورتیں پردہ
ترک کرکے یوروپین لباس اختیار کر رہی ہیں۔عوام میں سیاہ رنگ کے کپڑے کا
رواج زیادہ ہے۔ کالے اور گورے دونوں رنگ کے آدمی پائے جاتے
ہیں۔لیکن آنکھیں انکی خراب ہوتی ہیں۔شاید ریگ کا اثر ہے۔قدیم حصہ ہو یا جدید
بازار میں ہر جگہ رونق اور گہما گہمی رہتی ہے۔

بے رُوزگار لوگ

یہاں ہر قوم و ملت کا آدمی ملتا ہے۔اِس شہر میں
ایک بڑا گروہ ایسے لوگوں کا ہے جن کا کوئی
خاص پیشہ نہیں ہے۔ بازاروں میں آوارہ پھرتے رہتے اور اجنبی مسافر کو
پریشان کرتے ہیں۔ان سے راستہ پوچھنا بھی ایک عذاب ہے۔ہمیشہ کسی
مہذب آدمی سے راستہ پوچھنا چاہیئے۔ دو ایک دفعہ ہم کو تلخ تجربہ ہوا۔قدیم وضع
کے آدمی سے ہوٹل کا راستہ پوچھا وہ ایک چکر کے راستہ سے لے گیا۔ اور اس
محنت کے معاوضہ میں اچھی خاصی رقم مانگنے لگا۔ بڑی حجت کے بعد اِس کو ٹالا
ایک دفعہ مجھ کو ایک خاص قسم کے بسکٹ خریدنے تھے اور میں کسی بڑی دکان
کی تلاش میں تھا لیکن نہ ملی۔ آخر کار ایک قدیم وضع کے آدمی سے پوچھا وہ بہت
مستعدی کے ساتھ میرے ہمراہ ہو لیا۔ دکان قریب ہی میں تھی۔ میں دکان کے اندر
گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ داخل ہوا۔ بسکٹ خریدنے کے بعد میں ہوٹل کی طرف
جانے لگا۔ یہ شخص ساتھ ہو گیا۔اور کہنے لگا کہ میں تم کو ہوٹل تک پہنچا دوں گا۔ میں
نے کہا مجھ کو راستہ معلوم ہے۔ تمہاری ضرورت نہیں اور تم نے جو امداد کی اس پر

شکرگزار ہوں لیکن وہ باتیں بناتا ہوا میرے برابر چلنے لگا۔ ہوٹل پہنچنے پر وہ بھی اندر آگیا۔ میں نے ہوٹل کے منیجر سے کہا کہ اس کو باہر کردو۔ منیجر نے کہا کہ آپ نے ناحق اس سے راستہ دریافت کیا۔ یہ اب کچھ لئے بغیر نہیں جائے گا۔ کسی قدر تکرار کے بعد وہ ایک شلنگ لے کر ہٹا۔ ایک دفعہ پیشاب خانہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی۔ رات کا وقت تھا جگہ اگرچہ قریب ہی میں تھی۔ لیکن ہم کو پتہ نہ چلا۔ ایک آدمی ساتھ ہولیا۔ فارغ ہو کر باہر نکلے تو وہ شخص ہمارے انتظار ہی میں کھڑا تھا ہم نے اس کو کچھ دیا۔ مگر اس کی تشفی نہ ہوئی۔ وہ بہت زیادہ مانگتا تھا۔ بڑی دور تک اس نے ہمارا پیچھا کیا۔ کچھ اور دے کر اس سے جان چھڑائی۔

آثار قدیمہ

آثار قدیمہ میں زیادہ تر مساجد ہیں بعض اچھی حالت میں ہیں۔ جملہ مساجد کی تعداد نو سو سے اوپر ہوگی۔ سب سے خوبصورت مسجد سلطان حسن ہے اس کے اندر سلطان کی قبر بھی ہے۔ یہ مسجد ۱۳۵۹ء میں مکمل ہوئی۔ اس کا ایک مینار (۲۶۷) فیٹ اونچا ہے۔ گنبد کی بلندی (۱۸۰) فیٹ ہے۔ اس مسجد سے متعلق ایک مدرسہ بھی ہے۔ سب سے مشہور مسجد جامع ازہر ہے۔ جس کی تعمیر ۹۸۸ء میں ہوئی۔ دروازے پر نقش و نگار خوبصورت ہیں۔ اس مسجد کی شہرت یونیورسٹی کی وجہ سے ہے۔ دس ہزار سے زائد طالب علم یہاں پڑھتے ہیں۔ ہندوستان سے بھی طالب علم یہاں آتے رہتے ہیں۔ اب جدید قواعد مرتب ہوئے ہیں زمانہ حال کی ضرورتوں کے مدنظر بہت کچھ اصلاح کی گئی ہے۔ مسجد المراونی ۱۳۴۰ء میں تیار ہوئی۔ اس کو سلطان الناصر کے خاصہ بردار نے بنوایا تھا۔ ایک مدرسہ بھی اس سے متعلق ہے۔ مسجد احمد ابن خلدون ایک قدیم مسجد ہے جس کی تعمیر ۸۷۶ء میں ہوئی مسجد عمرو ابن عاص سب سے قدیم ہے ۶۳۹ء میں فاتح مصر نے اس کو

بنوایا۔ اور اس کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس مسجد کے متعلق یہ روایت مشہور ہے
کہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مسلسل تین سال تک امساک باراں کی وجہ
سے قحط رہا۔ مسلمانوں۔ عیسائیوں اور یہودیوں نے اس مسجد میں نماز استسقاء پڑھی
دوسرے ہی روز خوب بارش ہوئی۔ ایک اور مسجد لایق تذکرہ ابراہیم آغا کی
مسجد ہے۔ اس میں نیلے رنگ کی چینی کاری بہت اچھی معلوم ہوتی ہے جامع
ازہر کے قریب حضرت امام حسینؓ کا مزار ہے۔ سنا ہے کہ سر مبارک یہاں دفن ہے
عمارت اچھی اور آراستہ ہے قیمتی قالینوں کا فرش ہے۔ تلاوت قرآن کے واسطے
کچھ لوگ منجانب سرکار مقرر ہیں۔ چند اور مقدس مقامات ہیں جو اہل اسلام کے
واسطے موجب دلچسپی ہیں۔ مثلاً اہل بیت سے مزار حضرت زینب۔ مزار حضرت
عایشہ و امام شافعی وغیرہ۔

مصری عجائب خانہ

مصری عجائب خانہ لایق دید ہے یوں تو سینکڑوں
نادر الوجود اشیاء اس مکان میں موجود ہیں۔ جن کو
تفصیل کے ساتھ دیکھنے کے لئے عرصہ درکار ہے۔ مگر چند خاص چیزیں ہیں۔ ان کو
ضرور دیکھنا چاہیئے۔ فرعون کی لاش کے علاوہ توت عنخ آموں اور اس کی ملکہ
کی لاش اس عجائب خانہ کی خاص چیزیں ہیں۔ توت عنخ آموں مصر کا ایک بادشاہ
تھا۔ یہ حضرت عیسیٰ کی پیدایش سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو برس قبل فوت ہوا
قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان کی روح قبر کے اندر رہتی ہے
اور اس کو ان تمام چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو انسان کی ذات کے ساتھ وابستہ
ہیں۔ اس اعتقاد کی مدنظر یہ لوگ قبر کے اندر ضرورت کی سب چیزیں رکھدیا کرتے تھے تاکہ روح کو تکلیف نہ ہو
بلکہ چوبی پتلوں رنگ و روغن کرکے کھڑا کردیتے تھے خیال تھا کہ ان پتلوں میں انسانی روح موجود رہیگی اور
یہ بادشاہ کی روح کی خدمت کرینگے جس رتبہ کا انسان ہوتا تھا اس کے لحاظ سے قبر

آراستہ کی جاتی تھی۔ لاش کو ایک خاص مصالحہ کے ذریعہ ایسا محفوظ کر دیتے تھے کہ
ہزاروں برس اصلی حالت میں رہتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ اندر کی آلائش کو کسی طرح
نکال لیتے اس کے بعد اس کو ریشمی دھجیوں سے لپیٹ کر چوبی صندوق میں
محفوظ کر دیتے۔ ان صندوقوں پر مرنے والوں کی حیثیت کے مطابق نقش و نگار
ہوتا تھا۔ اس قسم کی متعدد لاشیں عجائب خانہ میں رکھی ہوئی ہیں۔ جن کو ممی کہتے
ہیں۔ باحیثیت لوگوں کے واسطے مقبرے بھی بڑے بڑے بنائے جاتے تھے
چنانچہ اہرام مصری کو دیکھ لو۔ توت عنخ آمون کے گنبد سے بیش بہا سامان انواع
واقسام کا برآمد ہوا۔ یہ چیزیں عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔

کتب خانہ

ایک کتب خانہ سرکاری بہت اچھا ہے۔ قرآن شریف کے
متعدد قدیم نسخے لایق دید ہیں۔ بہت سی قلمی کتابیں اور
تصاویر بھی ہیں۔ اندرونی انتظام معقول ہے۔ جابجا عربی میں نوٹس لگے ہوئے
ہیں۔ "ممنوع الحدیث مع الخدم" یعنے ملازمین سے باتیں نہ کرو۔ اسی طرح باغوں
میں یہ نوٹس لگے ہوئے ہیں۔ "ممنوع قطف الزہور" یعنے پھول توڑنا منع ہے
ہندوستان میں اس قسم کے نوٹس انگریزی زبان میں لگائے جاتے ہیں۔ اس کا
لحاظ مطلق نہیں رکھتے کہ عوام زیادہ تر کس زبان سے واقف ہیں۔

ہم وطن لوگ

ہندوستان کے ایک صاحب قادیانی ملت کے یہاں مقیم
ہیں۔ ایک اخبار اردو میں شایع کرتے ہیں۔ انھوں نے
ہم کو اپنے مکان پر مدعو کیا تھا۔ آدمی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ دو ہندوستانی
طالب علم ہم سے ملنے کی غرض سے ہوٹل پر آئے۔ ایک حیدر آباد کے ہیں دوسرے
بنارس کے۔ یہ دونوں جامع ازہر میں تعلیم پاتے ہیں۔ یہاں کی رسم کے مطابق
ہم نے قہوہ سے ان کی ضیافت کی۔ یہ بغیر دودھ کے پیا جاتا ہے۔ کڑوی چیز ہے

اس ملک میں یہ رسم عام ہے کہ جو ملنے آتا ہے اُس کو قہوہ پلاتے ہیں یوں سمجھو کہ یہ ہمارے ہاں کے پان کا قائم مقام ہے۔ مجھ کو یہ چیز پسند نہیں۔ مگر پینا پڑتا ہے

مصری پاشا

ایک مصری پاشا سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ایک علمی انجمن قائم کی ہے۔ جس کا دفتر ایک بڑے مکان میں ہے یہاں کئی حضرات سے ملنا ہوا۔ ایک صاحب انگریزی جانتے تھے اس مقام پر ہم دو دفعہ گئے۔ ہر دفعہ قہوہ پینا پڑا۔ پاشا بہت خلیق آدمی ہیں۔ قاہرہ میں ان کی حیثیت ممتاز ہے۔ ان کا ایک لڑکا استنبول میں ہے۔ اور دوسرا برلن میں زیر تعلیم ہے۔ پاشا نے ہم کو ان دونوں کے نام خط لکھ کر دئیے۔ اور کہا کہ میں نے دونوں کو تاکید کے ساتھ علیحدہ بھی لکھ دیا ہے۔ اگر یہ لوگ تمھاری خاطر مدارات نہ کریں تو مجھ کو لکھنا میں ان کی خبر لوں گا۔ میری خواہش پر پاشا نے ایک رقعہ قاہرہ ہائیکورٹ کے منتظم کو بھی لکھ دیا کہ ان کو مکان عدالت کی سیر کرادو۔ اپنا ایک خادم بھی ساتھ کر دیا۔ کہ وہاں تک ہم کو پہنچا دے۔ افسوس ہے کہ منتظم کو بات کرنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ اہل مقدمات کا مجمع تھا۔ زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ عمارت وسیع اور عالیشان ہے۔

قاہرہ کے قریب ایک جگہ شیرہ بلد ہے۔ وہاں اس غرض سے گئے کہ دیہاتی زندگی دیکھیں۔ جاکر افسوس ہوا بہت غلیظ جگہ ہے۔ لوگ بھی میلے کچیلے ہیں۔ لبِ سڑک پیشاب پاخانہ کرتے ہیں۔ کھانے کی دکانیں اس قدر ناپاک کہ ایک منٹ بھی ٹھہرنے کو دل نہ چاہے۔ دیکھنا چاہئے کہ مشرقی اقوام میں صفائی اور ستھرائی کا خیال کب پیدا ہوگا۔

قاہرہ کا ایک مسلمان فوٹوگرافر

قاہرہ میں ایک مسلمان فوٹوگرافر کے ہاں تصویر کھنچوائی۔ اور کچھ تصویریں دھلنے کو

دیں۔ آدمی شریف ہے۔ قہوہ یہاں بھی پینا پڑا۔ اس کی لڑکی نوجوان ہے لیکن پردہ مطلق نہیں کرتی۔ لباس بھی یوروپین پہنے ہوئی تھی۔ قہوہ لے کر آئی تو ہم کو مخاطب کر کے کہا "السلام علیکم" فوٹوگرافر نے اُجرت لینے سے انکار کیا۔ کہتا تھا کہ تم لوگ مسافر ہو اور مسلمان ہو اس لئے تم سے کچھ نہیں لونگا ہم نے بہت اصرار کے ساتھ اس کو اُجرت دیدی۔ ان کا نام ریاض شہاطہ ہے۔

شراب خانے

قاہرہ میں شراب خانے کثرت سے ہیں۔ رات بھر ان میں ہنگامہ رہتا ہے۔ ایک روز نصف شب کے قریب شور و غل کی وجہ سے آنکھ کھل گئی۔ ہوٹل کی پشت پر ایک گلی تھی۔ کھڑکی میں سے منظر دیکھا تو عجیب تماشہ نظر آیا۔ سڑک پر مار پیٹ ہو رہی تھی اور شراب کے برتن ادھر اُدھر ٹوٹے پڑے تھے چند لوگ نشہ میں چور آپس میں دست و گریبان ہو رہے تھے پولیس موقع پر پہنچی اور کوڑے بازی شروع ہوئی۔ اس کے بعد کچھ آدمیوں کو گرفتار کر کے ایک چھوٹی موٹر میں اُوپر تلے لادیا۔ پولیس کے دو تین سپاہی خود بھی سوار ہوئے۔ اب لطیفہ سنو کہ موٹر اپنی جگہ سے ہلتی نہیں۔ ہر چند شوفر انجن کو طاقت پہنچاتا ہے لیکن بے سود۔ بات یہ تھی کہ کوئی پچاس ساٹھ شرابی جمع ہو گئے اور ان سب نے موٹر کو روک لیا۔ کئی ایک تو پہلو کے تختوں پر کھڑے ہو گئے اور کچھ لوگ موٹر کے پیچھے لٹکے ہوئے تھے۔ پولیس نے کوڑے مار مار کر سب کو سیدھا کر دیا۔ پھر بھی چار پانچ آدمی موٹر سے لپٹے ہوئے چلے ہی گئے۔

فاحشہ عورتوں کا بازار

چند بازار فاحشہ عورتوں کے ہیں۔ ان مقامات پر دیسی اور یورپین دونوں قسم کی عورتیں ہوتی ہیں۔ اجنبی آدمی کو تنہا ان مقامات پر جانے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ گلی کے داخلہ پر ایک سپاہی پولیس کا کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اجنبی

مسافروں کو گلی کے اندر جانے سے روکتا بھی ہے۔ ایک شلنگ نذر کرنے پر اس نے ہم کو گلی میں جانے کی اجازت دیدی۔ ہم چکر لگاکر دوسری طرف سے نکل آئے۔ عورتوں کی گرم بازاری تھی۔ رقص و سرود کے چرچے تھے۔ بعض عورتیں لب سڑک راستہ چلنے والوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ بڑی بدصورت ہستیاں دیکھنے میں آئیں۔

قاہرہ میں ہندوستان کی ڈاک امریکن اکسپرس کے ذریعہ وصول ہوئی یہاں پہنچنے کی اطلاع بذریعۂ تار برقی دیدی تھی۔ تقریباً آٹھ روپے خرچ ہوئے برادر مکرم مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا ایک دلچسپ خط وصول ہوا۔ بھائی صاحب کی ظرافت طبع کے کیا کہنے۔ کسی موقع پر بھی اس کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں کہ تمھارے جانے کے بعد ایک شعر ذہن میں آیا جو یہ ہے ؎

کوئی جاکر بتانِ مغربی کو یہ خبر کردے
چلے ہیں تین مجنوں گھر سے اوڑھے لیلیٰ بنکر

شعر کی نزاکت آفرینی میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر خدا کرے کہ یہ مضمون شاعرانہ خیال کی حد سے متجاوز نہ ہو۔ چلتے وقت حیدرآباد کے اسٹیشن پر جو گل پوشی ہوئی تھی غالباً اس منظر نے برادر موصوف کے ذہن میں یہ خیال پیدا کیا۔ ہمارے زمانہ قیام میں ہوٹل کا مقیاس الحرارت دوپہر کو (۸۰) درجہ تک پہنچتا تھا۔ سنا ہے کہ جون اور جولائی میں گرمی زیادہ ہوا کرتی ہے۔ لیکن پارہ (۹۰) ڈگری سے اونچا نہیں جاتا۔ دھوپ میں تیزی ہونے کی وجہ سے ہم لوگ ٹھنڈے سوٹ پہنتے رہے۔ مگر یہاں سے روانگی کے دن ٹھنڈے کپڑوں کو ایک سوٹ کیس میں محفوظ کر کے امریکن اکسپرس کے حوالہ کردیا۔ اور یہ ہدایت دیدی کہ واپسی کے وقت پورٹ سعید پر سوٹ کیس

مل جائے۔ معاوضہ میں کمپنی کچھ فیس بھی لیتی ہے جو زیادہ نہیں ہوتی۔ البتہ کبھی ان کے حوالہ کردینی پڑتی ہے۔ اس کمپنی کی معرفت بیت المقدس تک تین ٹکٹ درجۂ دوم کے خرید لئے۔ کرایہ فی شخص دو پونڈ اٹھارہ شلنگ ہوا جو چھیالیس روپیہ سکہ عثمانیہ کے قریب ہوتا ہے مصری پونڈ انگریزی پونڈ سے قیمت میں کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ ایک پونڈ کے سو پیاسٹر ڈھائی آنہ کے برابر ہوتا ہے یہ سکہ چاندی کا ہے اس کے علاوہ تانبے کے پیسے بھی چلتے ہیں۔

قاہرہ سے بیت المقدس کو روانگی

پندرہ مئی کو شام کے ۶ بجے قاہرہ سے روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر ہمارے قادیانی دوست اور دونوں ہندوستانی طالب علم خدا حافظ کہنے آئے تھے۔ مسافروں کی کثرت تھی۔ رات کو سوا نو بجے کے قریب قنطرہ پہنچے یہاں مصر کی ریل ختم ہوتی ہے۔ درمیان میں نہر سوئز حائل ہے۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی نہر تقریباً اسی میل لمبی ہے۔ صرف دو ایک مقامات پر اس قدر چوڑی ہے کہ دو جہاز وقتِ واحد میں گزر سکتے ہیں مگر ایسے موقع پر ایک جہاز کھڑا ہو جاتا ہے۔ ۱۸۶۹ء میں اس نہر کا افتتاح ہوا تھا۔ ایک فرانسیسی انجنیر کی کوشش اور اہتمام سے تیار ہوئی۔ ۱۸۷۵ء میں خدیو مصر نے اپنی جائداد کو فروخت کیا جس کے سلسلہ میں نصف نہر کے قریب حکومت انگریزی نے خریدلی۔ اسی نہر کی برکت ہے کہ ہندوستان سے یورپ کو پندرہ روز کے اندر پہنچنا ہو جاتا ہے۔ نہر کے جنوب میں بحر احمر اور شمال میں بحر روم ہے۔ اس نہر نے دونوں سمندروں کا اتصال کردیا۔ ایک اسٹیمر کے ذریعہ تھوڑی سی دیر میں اس کو عبور کرلیا۔ فلسطین کی سرحد پر پاسپورٹ اور سامان دیکھا گیا۔ کنارہ پر ریل تیار ملی۔ دو دو برتھ کے چھوٹے چھوٹے کمپارٹمنٹ تھے ہم تین آدمیوں کے

علاوہ ایک مسافر اور تھا۔ رات کو تکلیف رہی۔ ایک سوزنی ساتھ تھی دو آدمی اسکو بچھا کر فرش پر سو گئے۔

لِد

صبح سات بجے کے قریب لِد جنکشن پہنچے۔ یہاں ریل تبدیل کیجاتی ہے اسٹیشن پر چاء پی اور کچھ کھایا۔ دو ایک آدمی حسب معمول پیچھے پڑے کہ بیت المقدس میں قیام کا بندوبست کر دیتے ہیں انھوں نے رفرش منٹ رُوم میں بھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑا بلکہ چائے میں بھی شریک ہو گئے۔ ایک شخص نے تو اسی وقت قدس کے کسی ہوٹل کو تار بھی دیدیا کہ تین مسافر تمھارے ہاں ٹھہرینگے ہم نے کوئی وعدہ قطعی کسی سے نہیں کیا۔ یہی جواب دیتے رہے کہ جہاں آرام ملے گا وہیں ٹھہرینگے۔ یہاں کے لوگ بیت المقدس کو قدس کہتے ہیں۔

لِد سے ریل لیٹ ہو گئی۔ بجائے سوا نو بجے کے گیارہ بجے کے قریب قُدس پہنچے۔ لدا اور قدس کے درمیان قدرتی مناظر اچھے تھے دونو طرف سرسبز پہاڑیاں تھیں۔ ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی تھی۔ ایک اسٹیشن پر ٹوکریوں میں شہتوت بک رہے تھے۔ ایک ٹوکری ہم نے بھی خرید لی۔ یہاں کا شہتوت بڑا ہوتا ہے۔

بیت المقدس کے ترجمان

دو اسٹیشن پہلے سے کچھ ترجمان ریل میں آئے۔ ہر شخص کی یہ کوشش تھی کہ اس کے توسط سے سیر کیجائے اور اس کے بتلائے ہوئے ہوٹل میں قیام کیا جائے کئی ایک آدمیوں کو ہم نے ٹال دیا۔ لیکن ایک ترجمان ہمارے درجہ میں بیٹھ گیا سگریٹ سے ہماری تواضع کی۔ انگریزی جانتا تھا۔ گورے رنگ کا نوجوان آدمی ہے۔ سوٹ پہنے ہوئے تھا اور سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ خوش پوش اور مہذب آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کو اپنے پیشہ کے متعلق اچھے ڈھنگ یاد تھے۔ جب اس کو

معلوم ہوا کہ ہم مسلمان ہیں تو اس نے یہودیوں کی مذمت شروع کی دریافت پر
معلوم ہوا کہ یہ خود عیسائی ہے۔ بار بار کہتا تھا کہ مسلمان اور عیسائی آپس میں دوست
ہیں۔ یہودی ہمارے دشمن ہیں۔ نہ تو ان کے ہوٹل میں ٹھہرنا چاہئے اور نہ اس قوم
کا ترجمان لینا چاہئے ہم بالکل انجان رہے۔ قدس کے اسٹیشن پر اور بھی ترجمان ملے
کسی ہوٹل کے ملازم نے ایک تار پیش کیا جو ایک احمق نے لدسے دیدیا تھا۔ ہم
نے بھی جواب دیا کہ ہم کو اس کی خبر نہیں اور نہ ہم اس کے پابند ہو سکتے ہیں اسٹیشن
سے باہر نکلے تو عجب مصیبت اور کشمکش میں گرفتار ہوئے۔ ترجمانوں اور ہوٹل
کے ملازموں نے ناک میں دم کر دیا۔ اسباب تتر بتر ہو گیا۔ یہ لوگ من مانے اپنی
اپنی گاڑیوں میں رکھنے لگے۔ بہت وقت ضایع ہو گیا۔ ہم کو جلدی اس لئے
تھی کہ جمعہ کی نماز کے لئے تیار ہونا چاہتے تھے۔ بمشکل سامان ایک جگہ کیا اور
ایک وکٹوریہ گاڑی کرایہ پر ٹھہرائی۔ ریل میں ایک شخص سے اولیویٹ ہوٹل
(OLIVET) کا پتہ معلوم ہوا تھا سیدھے وہاں چلے گئے اسٹیشن سے
قریب تھا۔ عیسائی ترجمان جو ریل میں ہمارے پاس بیٹھ گیا تھا۔ پیچھے پیچھے
یہاں بھی آیا۔ لیکن ہوٹل کے باہر کھڑا رہا معلوم ہوا کہ ہوٹل والے اس ترجمان
کے خلاف ہیں۔ ہوٹل کا مالک عیسائی ہے وہ کہتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو ترجمان
مقرر کر دیں گے۔ وہ آپ کو سیر کرا دے گا اس آدمی کو ہم اندر نہیں آنے دیتے ہوٹل
والے کی ضد ہم کو ناپسند تھی۔ اس سے ہم نے صاف صاف کہدیا کہ ان شرائط کے
ساتھ ہوٹل میں ٹھہرنا پسند نہیں کرتے۔ جس کے ذریعہ سہولت معلوم ہوگی۔ سیر کرینگے
اس معاملہ کو ہوٹل سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے اس پر وہ خاموش ہو گیا۔ ترجمان کو
یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس وقت ہم کو نماز کی جلدی ہے۔ تم پھر کسی وقت ملنا۔

ہوٹل | ہوٹل خاصا آرام دہ ہے۔ کھانا بھی اچھا تھا۔ دو نوجوان عیسائی

قبۃ الصخرا - بیت المقدس

عورتیں کھانا کھلانے پر مقرر ہیں۔ تیسری عورت دھوبن ہے۔ ہوٹل کا کرایہ فی شخص (۸) شلنگ روزانہ تھا۔ ایک شلنگ تقریباً ۱۲ر سکہ عثمانیہ کے برابر ہوتا ہے حتی المقدور جلدی کر کے غسل وغیرہ سے فارغ ہوئے اور نماز جمعہ کی غرض سے بیت الحرم گئے جس وقت وہاں پہنچے لوگ نماز سے فارغ ہو کر نکل رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ساڑھے گیارہ بجے یہاں نماز ختم ہو جاتی ہے۔ بہت افسوس ہوا۔ اُلٹے پاؤں ہوٹل کو واپس ہوئے۔ ترجمان صاحب خدا معلوم کہاں سے تاک لگائے کھڑے تھے۔ فوراً ساتھ ہو گئے۔ ان کو پھر ٹال دیا کہ اب فرصت نہیں ہے کسی اور وقت ملنا۔ ہوٹل آکر کھانا کھایا گزشتہ رات ریل میں جو تکلیف رہی اس کی وجہ سے تکان تھی۔ تین گھنٹے خوب سوئے۔ ہوٹل کی پشت پر اچھا نظارہ ہے۔ بڑی بڑی جدید عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ کشادہ اور اچھی سڑکیں بن گئی ہیں۔ سُنا ہے کہ گزشتہ دس سال کے عرصہ میں انگریزوں نے بیت المقدس کو کچھ سے کچھ کر دیا۔ تمام دن سردی رہی، حیدرآباد کا انتہائی جاڑا معلوم ہوتا تھا۔ مگر یہ کیفیت قائم نہ رہی۔ بعد گرمی بھی ہوئی۔ شام کو چائے سے فارغ ہو کر سیر کے واسطے نکلے۔ ہوٹل کے باہر حضرت ترجمان بے زبان کھڑے ہوئے تھے۔ ہم کو اس کی مستقل مزاجی بہت پسند آئی یہ بھی جانتے تھے کہ یہاں کی سیر بلا کسی رہبر کے نہیں ہو سکتی۔ آخر کار اس سے معاملہ طے کیا۔ دو روز میں ضروری مقامات دکھانے کا اس نے وعدہ کیا تصفیہ چار پونڈ پر ہوا۔ جس میں موٹر اور محنتانہ سب شریک تھا۔ صبح موٹر لانے کے واسطے ہم نے اس سے کہدیا وہ چاہتا تھا کہ اس وقت بھی ہمارے ساتھ رہے لیکن ہم نے ٹال دیا۔ شہر میں دو ایک مقامات پر موٹر کے کرایہ وغیرہ کا حال دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ہم نے سودا سستا کیا ہے۔ ہوٹل والا زیادہ مانگتا تھا

ہمارے ترجمان نے ہوٹل والے کی ضد میں اپنا نرخ کم کر دیا۔ سکہ یہاں کا خاص ہے لیکن انگریزی اور مصری سکہ بھی چلتا ہے۔

تاریخی حالات بیت المقدس کو اگر تاریخی پہلو سے دیکھا جائے تو دنیا میں اس نوعیت کا دوسرا شہر نہ ملیگا۔ مسلمان عیسائی اور یہود۔ یہ سب اپنا متبرک مقام مانتے ہیں۔ اسی مقام پر حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ نے بنی اسرائیل پر حکومت کی۔ یہیں پیدا بھی ہوئے۔ حضرت موسٰیؑ کا وطن بھی یہی سرزمین ہے۔ اس نواح میں حضرت عیسٰیؑ پیدا ہوئے اور عیسائیوں کے اعتقاد کے موافق یہیں ان کا مزار بھی ہے۔ نبی آخر الزماں یعنی پیغمبر اسلام پر معراج یہیں سے ہوئی۔ بھلا ایسا مقام متبرک کیوں نہ مانا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس تقدس کی آڑ میں بڑی بڑی خونریزیاں ہوئیں۔ عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے۔ برسوں آپس میں لڑتے رہے۔ حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش سے (۶۴) سال پہلے رومیوں نے بنی اسرائیل کو شکست دے کر اس شہر میں اپنا قبضہ کرلیا۔ یہودیوں نے کئی دفعہ بغاوت کر کے اپنا ملک رومیوں سے واپس لینے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ رومیوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں اچھے اچھے مکانات اور عبادت گاہ بنائے۔ قاعدہ ہے کہ زمانہ ایک حالت پر نہیں رہتا۔ رومتہ الکبریٰ کا ستارہ گردش میں آیا۔ اور اس کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ آزمائی کرنی پڑی۔ یرموک کی خونریز لڑائی نے عربوں کے واسطے بیت المقدس کا راستہ کھول دیا یہ جنگ بھی تاریخ اسلام میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کی شجاعت۔ استقلال۔ اور ہمت کو دیکھو کہتے ہیں کہ لشکر اسلام میں (۲۵۰۰۰) سے زیادہ سپاہی نہ تھے۔ دشمن کی فوج دو لاکھ (۲۰۰۰۰۰) سے کم نہ تھی۔ ماسوا اس کے رومیوں نے بھی

جان توڑ لڑائی کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ہزاروں آدمیوں نے اپنے کو پابہ زنجیر کر لیا تاکہ میدان جنگ سے بھاگ نہ سکیں۔ حالت جنگ میں کئی دفعہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس موقع پر عورتوں نے بڑی ہمت افزائی کی۔ مردوں کو غیرت دلا کر ان کو جوش میں لاتی تھیں۔ اسلام کے مشہور سپہ سالار خالد بن ولید۔ ابو عبیدہ اور عمرو ابن عاص وغیرہ نے حسب عادت غیر معمولی شجاعت کا ثبوت دیا۔ صرف تین ہزار آدمیوں کے نقصان سے مسلمانوں نے فتح پائی۔ ۶۳۶ء میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا گیا۔ حضرت عمرؓ بہ نفس نفیس تشریف لائے اور عیسائیوں نے اطاعت قبول کی۔ جب تک عربوں کی حکومت رہی عیسائیوں کو شکایت پیدا نہ ہوئی لیکن ترکوں کے زمانہ میں خصومت کا آغاز ہوا۔ عیسائیوں کو شکایت رہی کہ زائرین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ یہی چیز جنگ صلیبی کے واسطے بہانہ ہو گئی۔ چنانچہ ۱۰۹۹ء میں عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا لیکن سلطان صلاح الدین نے ۱۱۸۷ء میں نمایاں فتح حاصل کر کے حکومت اسلام کو دوبارہ قائم کیا۔ اس کے بعد تقریباً تین سو برس تک سلاطین مصر نے حکومت کی مگر ۱۵۱۷ء میں بزمانہ سلطان سلیم اول ترکوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا جن کی حکومت جنگ عظیم تک باقی تھی۔ ڈسمبر ۱۹۱۷ء سے یہ ملک سرکار انگریزی کی نگرانی میں ہے۔

حرم شریف ۱۷ مئی کو صبح کے وقت ہمارے ترجمان صاحب وقت مقررہ پر آ گئے سب سے پہلے حرم شریف میں حاضر ہوئے۔ یہ ایک وسیع احاطہ ہے یہاں متعدد و متبرک آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں۔ سب سے اہم دو عمارتیں ہیں۔ قبتہ الصخرا اور مسجد اقصیٰ۔ عام طور پر داخلہ جس دروازہ سے ہوتا ہے اس کو باب الخطا بین کہتے ہیں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے۔

کہ بعض ناواقف لوگ قبۃ الصخرا کو مسجد عمرؓ سے موسوم کرتے ہیں۔ دراصل یہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ زمانہ قدیم میں اس جگہ یہودیوں کی بہت بڑی عبادت گاہ تھی۔ جس کی ابتداء حضرت داؤد کے زمانہ میں ہوئی لیکن حضرت سلیمان نے اس کو مکمل کیا۔ اس عمارت کا اب نام و نشان باقی نہیں ہے۔ اس مقام پر مسلمانوں نے یہ گنبد تعمیر کیا۔ یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ جو عبادت گاہ حضرت سلیمان نے اس جگہ بنائی تھی۔ اس کا احترام مسلمان بھی کرتے تھے۔ چنانچہ شروع زمانہ میں کچھ عرصہ تک پیغمبر خدا صلعم بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے اس کے بعد وحی نازل ہوئی۔ کہ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر لیا کرو۔ (ملاحظہ ہو سورۂ بقر رکوع ۱۱۶)

قبۃ الصخرا عرب مورخین کا بیان ہے کہ سلطان عبدالملک بن مروان نے اس گنبد کو تعمیر کیا تھا اور اسی پر غلبہ آرا ہے۔ لیکن گنبد کے اندر ایک کتبہ بہ خطِ کوفی یہ خبر دیتا ہے کہ ۷۲ھ مطابق ۶۹۱ء میں گنبد کی تعمیر ہوئی۔ مشکل تو یہ ہے کہ اس کتبے میں بانی کا نام عبداللہ الامام المامون دیا ہوا ہے۔ جن کا زمانہ حکومت ۸۱۳ء میں شروع ہوا۔ تواریخ کے اس اختلاف کی وجہ سے کتبے کی صحت پر اعتبار نہیں ہو سکتا۔ ماسوا اس کے پتھر کا رنگ بھی عمارت کے دوسرے پتھروں کے رنگ سے مطابق نہیں ہوتا۔ پس ہر طرح قیاس سلطان عبدالملک کے حق میں قائم ہوتا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس گنبد کی تعمیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ خاندان بنی امیہ کا داخلہ کعبہ شریف میں ممنوع ہو گیا تھا۔ سلطان عبدالملک کو ضرورت محسوس ہوئی۔ کہ اپنی حدود اراضی میں ایک عبادت گاہ اس رتبہ کی قائم کریں کہ مرجع خلائق عام ہو جائے۔ دروازے کی بالائی چوکھٹ پر جو کتبہ ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امون رشید کے زمانہ میں گنبد کی مرمت

ہوئی تھی۔ قبۃ الصخرا کی پوری عمارت ایک وسیع چبوترے پر ہے۔ یہ سطح زمین سے دس فیٹ بلند ہے۔ چبوترے کے کنارے سیڑھیوں کے ختم پر خوبصورت اور عالیشان کمانیں بنی ہوئی ہیں۔ جن کو عربی میں موازین کہتے ہیں اور عقیدہ یہ ہے کہ قیامت کے دن میزان عدل ان ہی کمانوں میں لٹکائی جائے گی۔ خیر یہ روایت صحیح ہو یا غلط لیکن اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ قیامت کے دن ہر شخص کے گناہوں کا محاسبہ ہوگا۔ خواہ ترازو میں تولے جائیں یا کسی اور طریقہ سے توازن ہو۔ نتیجہ واحد ہے چنانچہ قیامت کا ذکر فرماتے ہوئے قرآن شریف میں رب العالمین کا ارشاد یوں ہوتا ہے فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ؕ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ ؕ (تو جس کے اعمال تول میں زیادہ ٹھہریں گے وہ خاطر خواہ عیش میں ہوگا اور جس کے اعمال تول میں کم ٹھہریں گے اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

گنبد ہشت پہل ہے۔ ہر پہلو (۶۶) فیٹ لمبا ہے۔ دیوار کے ذیلی حصہ میں سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ لیکن کھڑکیوں سے اوپر رنگین چینی کی اینٹیں خوش اسلوبی کے ساتھ پیوست کی گئی ہیں۔ گنبد کے چاروں طرف دیواروں پر قرآن شریف کی آیات خط طغرا میں بہت خوبی کے ساتھ لکھی ہوئی ہیں اس عمارت میں چار دروازے اور متعدد کھڑکیاں ہیں۔ ہمارا ترجمان عیسائی ہونے کی وجہ سے گنبد کے اندر جا نہ سکا۔ ایک عرب شیخ قدیم وضع کے لباس میں ہمارے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے اندر جا کر سب کچھ بتایا گنبد وسیع اور آراستہ ہے۔ قطر اس کا (۵۸) گز ہے قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں دیواروں پر اعلیٰ درجہ کی پچی کاری ہے۔ اور

قرآن شریف کی آیات بخط کوفی سنہری حروف میں لکھی ہوئی ہیں بحیثیت مجموعی یہ آرائش بہت دل آویز ہے۔ ستونوں کی دو قطاروں نے گنبد کو تین درجوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ سنا ہے کہ اِس عمارت کی آرائش میں سلطان صلاح الدین نے بھی بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ گنبد کے بیچ میں مقدس چٹان ہے۔ اطراف ایک رنگین چوبی دیوار ہے۔ چٹان کا طول (۵۰) فیٹ اور عرض (۴۴) فیٹ ہے۔ بلند ساڑھے چھ فیٹ ہوگی۔ یہ چٹان اندر سے کھوکھلی ہے۔ روایت ہے کہ اِس مقام سے آنحضرت صلعم کو معراج حاصل ہوئی۔ اور اسی جگہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسحاق کو قربانی میں دینا چاہا مگر عیسائی لوگ اِس مقام کی نشاندہی اپنے گرجا میں کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق حضرت اسمٰعیل مکہ معظمہ کے قریب مقام منیٰ پر قربانی میں دیے گئے۔ چٹان کے اندر پتھر کی بنچیں بنی ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت داؤد۔ حضرت سلیمان و حضرت ابراہیم عبادت کیا کرتے تھے گنبد کے ایک جانب کچھ تبرکات محفوظ ہیں۔ مثلاً موئے مبارک وغیرہ۔

باب السلسلہ کے سامنے ہی ایک مختصر لیکن خوبصورت گنبد ہے جس کو قبۃ السلسلہ کہتے ہیں سنا ہے کہ قدیم زمانہ میں یہاں ایک زنجیر لٹکی رہتی تھی جس کی تاثیر یہ تھی کہ اگر کوئی جھوٹا گواہ اس کو پکڑتا تو ایک کڑی ٹوٹ کر گر جاتی قبۃ الصخرا کے متصل شمال و مغرب میں قبۃ المعراج ہے۔ خانہ کعبہ سے بیت المقدس پیغمبر اسلام صلعم ایک رات میں پہنچے۔ اس سفر کی یادگار میں یہ گنبد تعمیر ہوا۔ قرآن شریف میں بھی اس سفر کا حوالہ موجود ہے۔

سُبحٰنَ الَّذِیْ اَسْریٰ بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی (وہ خدا پاک ہے۔ جو اپنے بندے (محمد) کو راتوں رات مسجد حرام

(یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنے بیت المقدس) تک لے گیا۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ رکوع پہلا۔ آیت پہلی۔)

قریب ہی میں چند چھوٹے چھوٹے گنبد اور ہیں۔ مگر سب کے حالات لکھنا خالی از طوالت نہیں۔ البتہ جنوب میں ایک خوبصورت حوض لائق تذکرہ ہے اس کو ملک الاشرف ابو النصر قائت بے نے بنوایا تھا۔ چنانچہ اس حوض کو سبیل قائت بے کہتے ہیں۔ جنوب مشرق میں ایک منبر ہے اس کو قاضی برہان الدین نے بنوایا تھا۔ اس کے خوبصورت ستون اور کمانیں عربی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔

مسجد اقصیٰ یہاں سے فارغ ہو کر مسجد اقصیٰ میں گئے جو بالکل مقابلے میں ہے اس کو اقصیٰ اس لئے کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں مکہ معظمہ سے بعید ترین مسجد یہی تھی۔ عمارت وسیع اور شاندار ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک قدیم عبادت گاہ ہے۔ جس کا سنگ بنیاد قیام کعبہ سے صرف چالیس سال بعد رکھا گیا تھا۔ اس کو مسلمانوں نے مسجد کر لیا۔ سلطان عبدالملک نے مسجد کے دروازوں پر سونے چاندی کے پتر چڑھوائے۔ ان کا وجود اب نہیں ہے۔ سلطان ابو جعفر المنصور کے زمانہ میں زلزلہ سے پہلی دفعہ جب اس مسجد کو نقصان پہنچا تو اس کی مرمت کے واسطے وہ قیمتی دھات جو آرائش کی غرض سے اس میں لگے ہوئے تھے سکہ کی شکل میں تبدیل کر لئے گئے دوسرے زلزلہ نے پھر کچھ حصہ منہدم کر دیا۔ اس دفعہ مرمت سلطان المہدی نے کسی قدر تغیر کے ساتھ کر دی۔ مگر امتداد زمانہ اور زلزلوں کے جھٹکوں نے عمارت کی بنیادوں کو کمزور کر دیا۔ اندر کے چوبی کھم اور شہتیر بھی پوشیدہ ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک مجلس انتظامی قائم ہوئی اسلامی طریقہ تعمیر کے ماہر فن جمع

ہوئے۔ اور تصفیہ یہ ہوا کہ اصل عمارت کو قائم رکھ کر اس کی بنیادوں کو مضبوط کر دینا چاہیئے اس کے علاوہ اور بھی کام مسجد کے اندرونی حصہ میں تکمیل طلب تھے۔ اس مجلس نے ممالک اسلام میں چندہ کے لئے وفد روانہ کئے۔ بہت کچھ کامیابی ہوئی۔ خود ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیحضرت حضور نظام نے گراں بہا چندہ عنایت فرمایا۔ مرمت کا کام ابھی تک جاری ہے۔ مسجد کی اندرونی آرایش نے ہم کو موحیرت کر دیا۔ پہلو کے حصول کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو اصل مسجد (۸۸) گز لمبی اور (۶۰) گز چوڑی ہے۔ گنبد کی سنہری زمین پر نقش نگاری نے عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے یہ کام سلطان صلاح الدین کے زمانہ تک کا ہے۔ اسی وقت کی بنی ہوئی ایک محراب جانب جنوب سنگ مرمر کے خوبصورت ستونوں پر قائم ہے۔ خط کوفی میں دیوار پر قرآن شریف کی آیات اور رنگین پھول پتوں کی بیل عمارت کی شان کو دوبالا کرتی ہیں۔ مسجد کے شمالی حصہ میں دروازہ کے قریب حضرت موسیٰ کے بھتیجوں کی قبریں ہیں۔ جنوب میں محراب کے قریب نہایت خوبصورت چوبی منبر ہے اس پر ہاتھی دانت اور سیپی کا کام عرب دستکاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ منبر سلطان نورالدین نے بنوایا تھا۔ جنوب مغربی گوشہ میں ایک عمارت کو مسجد عمر کہتے ہیں حرم الشریف کی مشرقی دیوار پر سے وادی النار اور جبل الزیتون کا منظر دیکھنے کے لائق ہے کہتے ہیں کہ قیامت کے روز اس مقام پر عدل کیا جائے گا۔ پیغمبر اسلام جبل الزیتون پر اور حضرت عیسیٰ حرم الشریف کی دیوار پر بیٹھیں گے۔ درمیان میں ایک باریک تار باندھا جائے گا۔ جو گنہگار ہیں وہ وادی النار میں گر جائینگے اور جو اچھے ہیں وہ اس تار پر سے تیزی کے ساتھ گزر جائیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بیت الحرم کی دونوں عمارتیں اچھی حالت میں رکھی گئی ہیں۔ دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ عیسائیوں کے مقامات کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ احاطہ کے ایک گوشہ میں مجلس انتظامی کا دفتر ہے۔ بیت الحرم کی پوری نگرانی اس مجلس سے متعلق ہے۔ یہاں کچھ دیر بیٹھے قہوہ سے ہماری تواضع کی گئی۔

حمام الشفاء حرم الشریف کی زیارت سے فارغ ہو کر اس کے شمالی مشرقی دروازے باب الناظر سے باہر نکلے۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک بازار میں پہنچے جس کو سوق القطانین کہتے ہیں۔ یہاں ایک محصور چشمہ گنبد کے اندر حمام الشفا کے نام سے ہے۔ اعتقاد یہ ہے کہ اس چشمہ کا پانی اکثر امراض کے واسطے صحت بخش ہے۔ داخلہ کے دروازے کے قریب دیواروں پر دنیا کی ہر زبان میں اس چشمہ کے متعلق ایک روایت لکھ کر چوکھٹے میں آویزاں کر دی گئی ہے۔ چنانچہ اردو، تلنگی اور مرہٹی وغیرہ میں بھی کیفیت لکھی ہوئی ہے۔ خلاصہ اس روایت کا یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اس چشمہ کے اطراف سینکڑوں بیمار اور معذور لوگ پڑے رہا کرتے تھے ایک مقررہ وقت پر آسمان سے فرشتہ اُتر کر پانی کو ہلا دیا کرتا تھا اس عمل کے بعد ہی سب سے پہلے جو آدمی اس چشمہ میں نہاتا اس کی شکایت دور ہو جاتی۔ ایک دن حضرت عیسیٰ کا گذر اس جانب ہوا انہوں نے دیکھا کہ ایک لنگڑا آدمی یہاں پڑا ہوا ہے جو (۳۸) سال سے اس شکایت میں مبتلا ہے اس سے حضرت نے دریافت کیا کہ تو چشمہ میں کیوں نہیں نہاتا۔ اس نے جواب دیا کہ مجبور ہوں کہ ہر شخص اپنی فکر میں رہتا ہے کوئی ایسا نہیں ہے جو ٹھیک وقت پر مجھ کو چشمہ تک پہنچا سکے۔ حضرت کو اس کی حالت پر رحم آیا فرمایا کہ اپنا بستر اٹھا لے اور اپنے پاؤں سے چلتا ہوا جا۔ لنگڑا جو اٹھا تو پاؤں بالکل اچھے تھے۔ خوش خوش چلا گیا۔

جبل الزیتون

شام کو بسواری موٹر شہر کے باہر ایک پہاڑی پر گئے جس کو جبل الزیتون کہتے ہیں۔ سطح سمندر سے یہ پہاڑی تقریباً ڈھائی ہزار فیٹ بلند ہے۔ حضرت عیسیٰ کی زندگی کے آخری زمانہ سے متعلق اکثر روایات اس پہاڑی سے منسوب کیجاتی ہیں۔ بیت المقدس کا منظر یہاں سے قابل دید ہے۔ پہاڑی کے ڈھلاؤ پر انجیر اور خوبانی کے درخت جابجا دکھائی دیتے ہیں جبل الطور کے نیچے دامن کوہ میں بی بی مریم کا مزار ہے۔ قریب ہی میں ایک باغ ہے۔ جس میں زیتون کے آٹھ درخت دیکھنے کے لائق ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ کے وقت سے چلے آتے ہیں۔ ان درختوں سے جو روغن نکالا جاتا ہے وہ تبرکاً گراں قیمت پر فروخت ہوتا ہے اور ان کے پھلوں کی گٹھلیوں سے تسبیح کے دانے بنائے جاتے ہیں۔ اسی نواح میں حضرت داؤد کا مزار ہے گنبد معمولی ہے۔ جس میں کوئی خاص بات نہیں۔

عیسائیوں کا مشہور گرجا

شہر کے اندر عیسائیوں کا ایک بڑا مشہور گرجا ہے اس کو انگریزی میں (CHURCH OF THE HOLY SUPULCHRE) کہتے ہیں۔ عربی میں اس کا نام کنیستہ الجنتہ ہے اگرچہ ابتداء اس کی زمانہ قدیم میں ہوئی تھی۔ مگر کئی دفعہ یہ منہدم ہوا اور بنتا رہا۔ قدیم عمارت کا کچھ حصہ اب تک باقی ہے۔ یہ عبادت گاہ بہت وسیع ہے اور اس کے اندر متعدد مقامات دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن اندھیرے کی وجہ سے روشن موم بتیاں ہاتھ میں لیکر جانا پڑتا ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ داخلہ کے دروازے کی کنجی ایک مسلمان دربان کے پاس رہتی ہے یہ رسم قدیم سے چلی آتی ہے۔ مسلم دربان دروازہ پر بیٹھا رہتا ہے۔ گرجا کی نگرانی کے متعلق عیسائیوں کے متعدد فرقے آپس میں اختلاف رکھتے ہیں رفع فساد کی

خاطر دربان مسلمان رکھا گیا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اسی مقام پر حضرت عیسیٰ کو سولی دی گئی اور کچھ عرصہ یہاں دفن رہنے کے بعد آسمان پر گئے۔ ایک تنگ و تاریک حجرے میں قبر کی نشاندہی کی جاتی ہے دروازہ اس قدر چھوٹا ہے کہ کبڑے ہو کر اندر جاتے ہیں۔ گرجا کے ایک حصہ میں حضرت مریم کی ایک بڑی مورت کانچ کے فریم میں محفوظ ہے۔ مورت پر بیش بہا زیورات زائرین کے چڑھائے ہوئے موجود ہیں۔ عمارت کا اکثر حصہ خراب حالت میں ہے عیسائیوں کے فرقہ واری اختلاف کی وجہ سے مرمت کی نوبت نہیں آتی۔ بیت المقدس کی فتح کے وقت اسی گرجا کی سیڑھیوں پر نماز پڑھنے کے لئے بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ کو رائے دی تھی لیکن حضرت نے اس خیال سے انکار فرمایا کہ آئندہ چلکر مسلمان اس کو مسجد بنالیں گے قریب میں ایک مقام پر نماز ادا کی۔ عیسائیوں نے رواداری کی یادگار میں وہاں چھوٹی سی ایک مسجد بنا دی۔

دیوار گریہ

بیت الحرم کی ایک دیوار کی پشت کے کچھ حصہ کو دیوار گریہ کہتے ہیں۔ یہ دیوار (۵۲) گز طویل اور (۶۰) فیٹ اونچی ہے بعض پتھر اس میں بہت بڑے ہیں۔ خاص خاص اوقات میں یہاں یہودیوں کا مجمع ہوتا ہے۔ بالخصوص جمعہ کے دن کثرت سے آتے ہیں۔ عورت مرد یکساں طور پر دیوار کو بوسہ دیتے اور آنسو بہا دیتے ہیں بعض یہاں بیٹھ کر اپنی مذہبی کتابیں پڑھتے ہیں اور گزشتہ شان و شوکت یاد کر کے اس کا ماتم کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ اس مقام پر کشت و خون ہوا تھا۔ تقریباً پانچ سو یہودیوں کو مسلمانوں نے قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد سے خصومت زیادہ ہوگئی۔ ہر وقت فساد کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ انگریزی فوج کے مسلح سپاہی پہرہ دیتے ہیں ہم لوگ جس وقت پہنچے پہرہ موجود تھا اس موقع پر ہمارے رہبر نے غالباً ہم کو

خوش کرنے کے لئے ایک احمقانہ حرکت کی جھگڑے کے حالات بیان کرتے کرتے کہنے لگا کہ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے صرف پانچ سو یہودیوں کو مارا اگر چاہتے تو ہزاروں کو قتل کر دیتے۔ میں نے فوراً اس کو روک کر چپکے سے پوچھا کیا تم اس وقت دوسرا ہنگامہ کرانا چاہتے ہو وہ اس اشارے کو سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

الخلیل

بیت المقدس سے تقریباً تیس میل پر ایک مشہور زیارت گاہ الخلیل ہے جو سطح سمندر سے تین ہزار فیٹ بلند ایک پہاڑ پر واقع ہے۔ اطراف کا منظر خوشنما ہے یہاں زیادہ تر انگور اور خوبانی وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ اس قصبہ میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے مقام زیارت ایک عالیشان عمارت ہے جس کو حرم کہتے ہیں۔ داخلہ کے دروازے پر ایک عرب نگہبان نے ہم کو روکا کیونکہ ہم انگریزی لباس میں تھے۔ معلوم ہوا کہ عیسائیوں کو اندر جانے کی ممانعت ہے۔ ہمارے رہبر نے کہا یہ لوگ مسلمان ہیں مگر نگہبان کو یقین نہیں آتا تھا۔ ہم نے پاسپورٹ بتائے اور کلمہ بھی پڑھا۔ تب اندر جانے کی اجازت ہوئی۔ ترجمان چونکہ عیسائی تھا اس کو باہر ہی ٹھہرنا پڑا۔ اندر زائرین کا مجمع تھا مسجد اور مزارات ایک ہی عمارت میں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی بیوی حضرت سارہؑ۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت اسحاقؑ۔ اور ان کی بیویوں کے مزارات یہیں ہیں۔ عمارت کے باہر ایک دو منزلہ مکان میں حضرت یوسفؑ کا مزار ہے۔ نماز عصر کا وقت تھا۔ جماعت میں ہم بھی شریک ہوئے۔ رواج کے مطابق یہاں کے مجاوروں کو کچھ دیا۔ یہ لوگ زائرین کو گھیر لیتے ہیں اور پریشان کرتے ہیں۔ بعد نماز ایک صاحب ملے جو کسی قدر اردو جانتے تھے۔ ان کا اردو جاننا ہمارے لئے موجب پریشانی ثابت ہوا۔ کچھ رقمی امداد کے خواستگار تھے۔ ہندوستان کے

سیاسی حالات پر گرم جوشی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ گاندھی جی کے متعلق سوالات کر کے ہماری رائے پوچھنے لگے۔ ہم نے ٹالنے کی خاطر کہدیا کہ بہت دنوں سے ہندوستانی اخبارات نہیں دیکھے۔ اس لئے کچھ معلوم نہیں۔ مگر یہ حضرت پیچھے پڑ گئے۔ کہتے تھے کچھ نہ کچھ ضرور بتایئے موٹر میں سوار ہونے کے بعد ان سے نجات ملی۔

بیت اللحم

واپسی پر بیت اللحم گئے۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت داؤد کی پیدایش کا مقام ہے۔ یہاں کثیر تعداد میں یورپین سیاح ملے۔ حضرت عیسیٰ کی پیدایش کے مقام پر قدیم وضع کا گرجا بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں اس سے قدیم کوئی گرجا نہیں۔ دروازہ اس قدر نیچا ہے کہ جھک کر اندر جانا پڑتا ہے۔ اندھیرے کی مصیبت یہاں بھی ہے۔ اندر متعدد کمرے ہیں حضرت عیسیٰ کی پیدایش کا مقام ایک چھوٹے سے کمرے میں بتلایا جاتا ہے جس میں سنگ مرمر کا فرش ہے۔ دیواروں پر نقش و نگار کے آثار نمایاں ہیں۔

گرجا کے قریب پہاڑ کے دامن میں ایک غار ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بی بی مریم اور حضرت عیسیٰ نے پناہ لی تھی۔ اس وقت حضرت مریم کے دودھ کا قطرہ یہاں گر گیا۔ عیسائی یہاں کی مٹی کو متبرک خیال کرتے ہیں اور عقیدہ ہے کہ اس میں دودھ بڑھنے کی تاثیر ہے۔

بیت المقدس کے شمال مغرب میں ایک چھوٹا سا گاؤں البنی سمویل ہے یہاں حضرت اسمٰعیل کا مزار ہے۔ عمارت معمولی ہے لیکن قریب کے مینار پر سے اطراف کا منظر دلکش ہے۔

قدس کی آبادی

بیت المقدس کی آبادی ستر ہزار سے کچھ اوپر ہوگی شہر میں یہودیوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن اطراف و

اکناف میں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ شہر کے چاروں طرف ایک قدیم فصیل شکستہ حالت میں ہے۔ اس کی بلندی چالیس فیٹ کے قریب ہو گی۔ اس میں آٹھ دروازے اور متعدد برج ہیں۔ شہر کا اصل حصہ قدیم حالت میں ہے۔

تنگ راستوں کے دونوں طرف پتھر کے مکانات ہیں۔ سنگ بستہ سڑک امتداد زمانہ کی وجہ سے ناہموار ہو گئی ہے۔ اکثر گلیاں اوپر سے پٹی ہوئی ہیں کہیں کہیں روشنی کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ شہر کا محل وقوع چند پہاڑیوں پر ہے۔ جن کی وجہ سے نشیب و فراز ہر جگہ پایا جاتا ہے انتہائی بلندی سطح سمندر سے ڈھائی ہزار فیٹ کے قریب ہو گی۔ قرب و جوار میں غربا کے مکانات مٹی کے بنے ہوئے ہیں جن کی چھتیں دعا لے کی ہیں۔ کاروبار زیادہ تر یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ انگریزوں کا اثر قائم ہونے کے بعد سے تجارت میں ترقی ہو گئی یورپ اور امریکہ کے سیاح بکثرت آنے لگے ہیں۔ دکانیں ہر قسم کے سامان سے مالامال ہیں سیب اور زیتون کی لکڑی کا سامان یہاں اچھا بنتا ہے بازاروں میں مختلف اقوام کے لوگ مختلف لباس میں نظر آتے ہیں۔ مذہب کے پابند یہودی ڈاڑھی اور زلفیں رکھتے ہیں۔ اور اونچی اونچی ٹوپیاں خاص قسم کی پہنتے ہیں۔ لوگ عام طور پر لمبے لمبے چوغے پہنتے اور کمر کے اطراف پٹکہ باندھتے ہیں۔ ترکی ٹوپی کا رواج زیادہ ہے۔ مسلمان عورتیں نقاب پوش ہو کر بازاروں میں نکلتی ہیں۔ ان کا پردہ مصر کی عورتوں کی نسبت زیادہ گہرا ہے۔ باہر سے چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ عورتیں بلاتکلف کاروبار میں مصروف رہتی ہیں۔ کیا خوب ہو جو ہندوستان میں بھی اس قسم کا پردہ رائج ہو جائے اور موجودہ چار دیواری کے پردہ سے ہمارے ملک کی عورتیں نجات پائیں۔ اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہندوستان میں مذاہب کے اختلاف کی وجہ سے

چار دیواری کا پردہ مناسب ہے مگر غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ دلیل نہایت کمزور ہے۔ ان ممالک اسلامی میں بھی جہاں نقاب کا رواج ہے غیر مسلم اقوام کثرت سے آباد ہیں مسلمان عورتیں بلا کسی خوف و خطر کے کاروبار کرتی رہتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ قدامت پسند ہیں۔ قدیم رواج کو قائم رکھنے کے لئے اس کی تائید میں کوئی نہ کوئی دلیل پیدا کر لیتے ہیں لیکن زمانہ کی رفتار اپنا اثر قائم کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایک روز وہ بھی آئے گا کہ ہماری عورتیں چار دیواری سے باہر نکل آئیں گی۔ بحالت موجودہ پردہ کی جکڑبندی نے ان کی صحت کو خراب کر رکھا ہے ورزش اور تازہ ہوا سے بالکل محروم ہیں۔ ماسوا اس کے روزمرہ کے کام کاج میں ہر وقت بیرونی امداد کی محتاج رہتی ہیں خود کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔

بحر لوط شہر سے کچھ فاصلہ پر بحر لوط ہے اس کو انگریزی میں (DEADSEA.) کہتے ہیں۔ یہ سمندر تقریباً (۴۷) میل لمبا اور دس میل چوڑا ہے پانی اس کا اس قدر شور ہے کہ مچھلی زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ کنارے پر کاشت ہو سکتی ہے انگریز لوگ اس سمندر سے نمک نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قومی عناد جس روز ہم بیت المقدس پہنچے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کی دکانیں عام طور پر بند تھیں معلوم ہوا کہ یہودیوں کے ساتھ جو جھگڑا ہوا تھا اس کی یادگار میں ہڑتال ہے۔ افسوس ہے کہ قومی عناد روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ایک روز بازار میں ایک اجنبی شخص نے راستہ روک کر مجھ سے سلام علیک کی اور سوال کیا کہ کیا تم مسلمان ہو۔ میں نے جواب میں کہا الحمد للہ اور دریافت کیا کہ تم کون ہو۔ اس نے کہا میں عیسائی ہوں لیکن ہم

مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ یہ بھی کہتا تھا کہ افسوس ہے کہ گزشتہ جھگڑے میں صرف پانچسو یہودی مارے گئے۔ کم از کم پانچہزار تو مارے جاتے اصل یہ ہے کہ یہودیوں نے جو اثر موجودہ حکومت میں قائم کرلیا ہے اس سے عیسائی اور مسلمان دونوں خائف ہوتے جارہے ہیں کیونکہ خود ان کے حقوق معرض خطر میں پڑ گئے ہیں۔ یہودیوں کا تمول اس موقع پر بہت کچھ کام کر رہا ہے۔ دنیا میں روپیہ ہی تو اصل چیز ہے۔ اس سے بڑے بڑے کام نکل آتے ہیں۔ یہاں کے عیسائی اور مسلمان مفلس ہیں۔ مالدار فریق اکثر باتوں میں بازی لیجاتا ہے۔ شہر کے اندر آبادی بھی یہودیوں کی زیادہ ہے۔ پھر بھی جب کبھی موقع آجاتا ہے مسلمان اپنے قوت بازو کو استعمال کرنے میں دریغ نہیں کرتے اور شبانہ روز بارگاہ خداوندی میں دست بدعا رہتے ہیں۔ ؎

اے کریمی کہ از خزانۂ غیب — گبر و ترسا وظیفہ خور داری

دوستاں را کجا کنی محروم — تو کہ با دشمناں نظر داری

زاویۃ الہنود

ہندوستانی مسافروں کے واسطے جو ہوٹل میں قیام ناپسند کرتے ہیں ایک مناسب مقام حرم شریف کے قریب ہے۔ اس کو زاویۃ الہنود کہتے ہیں۔ اصل میں یہ حضرت بابا فرید شکر گنج کا تکیہ ہے۔ ایک ہندوستانی بزرگ ناظر حسن نامی شیخ زاویہ ہیں۔ مسجد اقصیٰ سے دو پونڈ ماہانہ مجلس شرعیہ سے ساڑھے گیارہ پونڈ اور اوقاف سے تقریباً چار پونڈ۔ اس طرح ماہانہ سترہ پونڈ کے قریب اس زاویہ کی آمدنی ہے۔ شیخ الزاویہ چونکہ باسلیقہ آدمی ہیں اس قلیل آمدنی میں انتظام اچھا رکھتے ہیں۔

بیت المقدس سے دمشق کو روانگی

بیت المقدس سے دمشق ریل کے

حضرت یحییٰ کا مقبرہ - دمشق

علاوہ موٹر کے ذریعہ بھی جاسکتے ہیں۔ سڑک اعلیٰ درجہ کی بن گئی ہے انگریزی حدود میں اس سڑک پر (تارکول) ڈابنر ڈالا جا رہا ہے۔ ہم نے موٹر کا سفر اختیار کیا۔ کیونکہ سواری اپنے قابو کی ہے اور مناظر کی سیر بھی اچھی طرح ہو سکتی ایک موٹر پانچ نشست والی کرایہ پر لی گئی۔ (۴½) ساڑھے چار پونڈ کرایہ مقرر ہوا۔ بیت المقدس سے دمشق کا فاصلہ ایک سو تیس میل ہے۔ پروگرام صبح آٹھ بجے روانہ ہونے کا تھا۔ موٹر بھی ٹھیک وقت پر آئی ہم لوگ سامان رکھنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ چند انگریزی پولیس کے افسر سامنے سے گذرے۔ موٹر کے نمبر پر ان کی نظر پڑی۔ انھوں نے موٹر والے سے عربی میں کچھ دریافت کیا۔ اس کے بعد موٹر میں سوار ہو کر کہیں چلے گئے۔ موٹر والے نے اشارے سے کہا کہ ابھی آتا ہوں۔ ہم حیرت میں تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد ہوٹل کے منیجر نے پولیس کے دفتر کو ٹیلیفون دیا۔ معلوم ہوا کہ موٹر علاقہ لبنان کی ہے۔ غیر علاقہ کی موٹر بیت المقدس میں آٹھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتی۔ یہ موٹر دو روز سے ٹھہری ہوئی تھی اس لئے ایک پونڈ جرمانہ دینا پڑا۔ جرمانہ ادا کر کے شوفر صاحب موٹر لے کر آئے۔ نو بجے کے قریب ہم روانہ ہوئے۔ راستہ میں مناظر قدرتی دلکش تھے۔ پہاڑیوں کے ڈھلاؤ پر کاشت کا انتظام بہت خوب ہے۔ پانی کو روکنے کے لئے کیاریاں درجہ بدرجہ اس طرح بناتے ہیں کہ دور سے یہ منظر بہت خوشنما ہوتا ہے۔ پہاڑوں اور گھاٹیوں میں سے گذر ہوا۔

موٹر کی تیز رفتاری

شوفر کی لاپروائی سے کسی قدر تشویش پیدا ہوئی مخدوش مقامات پر بھی موٹر تیز چلاتا تھا ہم اسکو بہت روکتے تھے لیکن وہ مذاق میں اڑا دیتا تھا۔ زبان نہ جاننے کی وجہ سے

اشاروں میں بات چیت ہوتی تھی۔آدمی خوش مذاق تھا اس کے پہلو میں
رفیق بیگ بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتاً نہ معلوم کیا خیال آیا کہ بڑی پھرتی کے ساتھ
رفیق بیگ کے سر سے انگریزی ہیٹ اتار کر خود پہن لی۔ اور اپنی ترکی ٹوپی
اُن کو پہنادی۔ موٹر جارہی تھی تیز۔ شوفر کی اس حرکت سے بیلنس خراب ہوگیا
موقع سڑک کا نہایت نازک تھا۔ ایک جانب گہرے گہرے غار تھے۔ سڑک
بھی زیادہ چوڑی نہ تھی۔ ہم تو یہ سمجھے کہ خاتمہ ہوگیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ شوفر
نے بہت خوبی کے ساتھ حادثہ کو بچالیا اور تعریف یہ ہے کہ بالکل متاثر نہ ہوا
بلکہ ہماری پریشانی دیکھ کر زور زور سے ہنستا تھا۔

الناصرہ دوپہر کے قریب ایک قصبہ میں پہنچے اس کو عربی میں الناصرہ
کہتے ہیں۔ اور انگریزی میں Nazareth کہتے ہیں۔
حضرت عیسیٰ کی نوعمری کا زمانہ یہیں گزرا تھا۔ مردم شماری پندرہ ہزار سے اوپر
بتلائی جاتی ہے۔ ایک رسٹوران میں کھانا کھایا۔ دوکان معمولی تھی۔ مالک اس کا
یہودی ہے۔ خود الگ بیٹھا رہا مگر اس کی عورت سب کام کرتی تھی۔ کھانا منگنے
میں زبان کی وجہ سے مشکل ہوئی۔ عورت کو خوب سوجھی کہ ہم کو باورچیخانہ
میں لے گئی کہ جو چیز پسند ہو بتلادو کھانا چنداں برا نہ تھا۔

ایک ناگوار واقعہ یہاں سے روانہ ہوکر کچھ دور گئے تھے کہ ایک
ناگوار واقعہ پیش آیا۔ ہمارے سوٹ کیس موٹر
کے پیچھے پیٹرول کے خزانے پر بندھے ہوئے تھے۔ بھائی سلیم بیگ نے
سگریٹ پی کر جو پھینکا۔ ہوا کی وجہ سے وہ اسباب پر گرا۔ رفتہ رفتہ سوٹ کیس
جلنا شروع ہوا ہم کو خبر نہ ہوئی۔ حسن اتفاق دیکھو کہ ایک ریلوے گیٹ کے قریب
دو چار دکانیں تھیں۔ کسی نے دھواں نکلتے دیکھ لیا اور غل مچانے لگا۔ موٹر

ٹھہرائی گئی اس وقت اصل کیفیت معلوم ہوئی۔ دوکان سے پانی لے کر آگ کو بجھایا۔ ایک سوٹ کیس کا کچھ حصہ جل گیا۔ اللہ میاں کا انصاف دیکھو کہ جن صاحب نے سگریٹ پھینکا تھا ان کا ہی سوٹ کیس جلا۔

بحر الطباریہ آگے چل کر SEA OF GALLELI پر سے گذرے جس کو عربی میں بحر الطباریہ کہتے ہیں۔ اس کے کنارہ پر ایک قصبہ طباریہ نامی ہے یہ ایک جھیل ہے جس کا طول تیرہ میل کے قریب ہے رستے میں کچھ پہاڑ ایسے دکھائی دیے۔ جن کی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ دو جگہ پاسپورٹ کا معائنہ ہوا اور ایک جگہ شام کے علاقہ میں فرانسیسی افسر نے ایک سوٹ کیس کھلوا کر دیکھا۔

دمشق مغرب کے وقت دمشق پہنچے۔ بیت المقدس کے ہوٹل والے نے دمشق کے ایک ہوٹل کا پتہ دیا تھا۔ یہ پیلیس ہوٹل کے نام سے مشہور ہے۔ آسائش کا ہوٹل ہے۔ کرایہ فی کس دس شلنگ روزانہ طے پایا اس میں کھانا بھی شریک تھا۔ مگر پہلی رات کھانا باہر کھایا۔ ایک رسٹوران میں تین مسلمان ملے جو کسی قدر انگریزی جانتے تھے۔ ہندوستان کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ یہ بھی گاندھی جی کو پوچھتے تھے۔ ہمارے کھانے کی قیمت ان ہی لوگوں نے ادا کی۔ صبح کو جب ہوٹل سے نکلے تو ایک ترجمان چمٹ گیا کچھ اردو بھی جانتا تھا۔ پہلے تو ہم انکار کرتے رہے لیکن وہ کب مانتا تھا۔ مردہ بدست زندہ کا حساب ہوا۔ آخر کو سیر کرانے کے لئے اسے مقرر کرنا پڑا۔

تاریخی حالات دمشق کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہے اس کی موجودہ آبادی تقریباً تین لاکھ ہے۔ شہر کا موقع بہت خوب ہے اور اطراف و اکناف سرسبز اور شاداب ہیں۔ دمشق کی قدامت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں بھی

اس کا وجود تھا۔ تاریخی حالات دلچسپ ہیں۔ لیکن طوالت کے اندیشہ سے
تفصیل کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ۶۳۵ء میں خلیفۂ دوم کے زمانہ میں
عربوں نے اس شہر کو فتح کیا۔ لیکن محاصرہ خلیفہ اول کے عہد میں شروع ہو گیا
تھا۔ یہ بات اس زمانے کی ہے جبکہ مسلمان ملک گیری کے نشہ میں چور ہو رہے
تھے اور ان کی تلوار کی دھاک اطراف و جوانب میں بیٹھ چکی تھی۔ پھر بھی ابتدائی
زمانہ تھا۔ لشکر و ساز و سامان کی قلت کو دیکھ کر دشمن ان کو حقیر سمجھتے تھے چنانچہ فتح
دمشق سے تقریباً دو ہی سال قبل جب یزد جرد شاہ ایران کے دربار میں عرب
کے سپہ سالار سعد بن ابی وقاص کے ایلچی پہنچے تو ان کی ظاہری حالت دیکھ کر
بادشاہ نے تحقیر آمیز گفتگو شروع کی۔ ایران کا نامی گرامی شاعر فردوسی اس گفتگو
کا خاکہ اس طرح کھینچتا ہے بادشاہ نے کہا۔ ؎

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

خداوند کریم کا لطف و کرم مسلمانوں کے شریک حال تھا۔ باوجود دشمنوں
کی کثرت کے فتح ان ہی کے نام پر ہوتی گئی۔ دمشق کی رومی حکومت بھی
اپنی جگہ مطمئن تھی کہ مسلمان کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ لیکن عربوں کی بہادری
نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ اسلامی لشکر خالد بن ولید کے زیر کمان تھا۔
ان کے تحت ابو عبیدہ اور عمرو ابن عاص جیسے نامی گرامی مجاہدین کام کر رہے
تھے۔ ایک رات اہالیان شہر کسی تقریب کے سلسلہ میں جشن منا رہے تھے
خالد بن ولید نے اس موقع کو غنیمت جان کر چند افسروں کو ساتھ لیا۔ ایک
مشک کے ذریعہ خندق کو پار کیا اور کمند لگا کر قلعہ کی دیوار پر چڑھ گئے ان
کے پیچھے کچھ فوج رسی کی سیڑھیوں کے ذریعہ اوپر پہنچی۔ دربانوں کو تہ تیغ

کرنے کے بعد قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ عیسائیوں نے جب شکست کی صورت دیکھی تو خود ہی دوسرا دروازہ کھول کر ابوعبیدہ کو راستہ دیدیا۔ دونوں سپہ سالار شہر کے ایک حصہ میں ایک دوسرے سے ملے اس وقت سے عیسائیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ خاندان بنوامیہ کے زمانہ میں اس شہر کی شان وشوکت دوبالا ہوگئی۔ امیر معاویہ نے اس کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ لیکن جب خاندان بنی عباسیہ کا تسلط ہوا۔ تو خلافت بغداد میں منتقل ہوگئی۔ جنگ صلیبی کے زمانہ میں سلطان صلاح الدین کا مرکز یہی شہر تھا۔ سنہ ۱۲۶۰ء میں ہلاکو خاں نے اپنا قبضہ جمایا۔ اس کے بعد کچھ دنوں مصریوں کی حکومت رہی سنہ ۱۳۰۰ء میں تاتاریوں نے شہر پر حملہ کر کے اس کو لوٹ لیا۔ اچھی اچھی عمارتیں جلادی گئیں۔ سنہ ۱۳۹۹ء میں امیر تیمور نے اس جانب رخ کیا۔ اہالیان شہر نے بہت کچھ مال متاع دے کر اپنی جان بچائی۔ امیر تیمور اپنے ساتھ یہاں کے ہتیار بنانے والوں کو لے گیا۔ اس وقت سے دمشق کی مشہور تلوار سمرقند وخراسان میں بھی تیار ہونے لگی۔ بالآخر سنہ ۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم نے مستقل طور پر ترکوں کی حکومت قائم کرلی۔ جو جنگ عظیم تک باقی تھی اب یہ ملک فرانسیسیوں کے زیر اثر ہے۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں اس شہر میں ایک بڑا کشت وخون مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہوا۔ تقریباً چھ ہزار عیسائی بازاروں میں مارے گئے۔

عام حالات

یہاں کے مکانات اندر سے بہت خوشنما اور دل آویز ہوتے ہیں دیواروں پر نقش ونگار کے علاوہ قرآن شریف کی آیات بھی لکھی جاتی ہیں۔ اکثر مکانوں میں حوض ہوتا ہے۔ اس کے اطراف چمن بندی کرتے ہیں عورت مرد تقریباً ایک نمونہ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتے ہیں

پائجامہ ان کا اس وضع کا ہوتا ہے جو پنجاب میں رائج ہے۔ مسلمان عورتیں نقاب گہری ڈالتی ہیں۔ تعلیم زیادہ نہیں ہے۔ بازاروں میں اکثر منشی دوات قلم لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ نقاب پوش عورتیں ان سے خطوط وغیرہ لکھواتی ہیں۔ بعض عورتیں بھیک مانگتی دیکھی گئیں۔ مادری زبان عربی ہے۔ مگر فرانسیسی کا رواج روز افزوں ترقی پر ہے۔ انگریزی جاننے والے بہت کم ہیں۔ ہمارے ہوٹل کا منیجر انگریزی جانتا ہے۔

جامع الاموی

دمشق میں ڈھائی سو کے قریب مساجد ہیں جن میں ستر بڑی ہیں۔ سب سے بڑی اور مشہور مسجد جامع الاموی ہے۔ یہ سوق الحمیدیہ نامی بازار کے مشرقی گوشہ میں واقع ہے۔ بیت المقدس میں قبتہ الصخرا اور دمشق میں مسجد اموی خاندان بنی امیہ کی شان و شوکت کی دو بڑی یادگاریں ہیں۔ دراصل یہ عمارت عیسائیوں کی عبادت گاہ تھی جس کے مشرقی حصہ کو فتح دمشق کے وقت عربوں نے مسجد بنا لیا۔ بقیہ حصہ جانب غرب بدستور عیسائیوں کے قبضہ میں رہا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک مسلمان اور عیسائی ایک ہی دروازے سے عبادت کے واسطے داخل ہوا کرتے تھے یہ صورت حال خدشہ سے خالی نہ تھی۔ اس لئے باقتضائے مصلحت سلطان ولید نے عیسائیوں سے عمارت کا مغربی حصہ بھی لے لیا۔ اور اس کا معاوضہ کسی اور مناسب طریقہ پر کر دیا۔ اس کے بعد سلطان موصوف نے اس عالیشان مسجد کی تعمیر شروع کی کہتے ہیں کہ بارہ سو کاریگر قسطنطنیہ سے بلائے گئے فرش اور دیواروں کے زیرین حصہ میں قیمتی سنگ مرمر لگایا گیا۔ بالائی حصہ میں بہترین پچی کاری کی گئی۔ جس کے آثار اب تک نمایاں ہیں۔ محرابوں کو قیمتی جواہرات اور انگور کی سنہری بیلوں سے آراستہ کیا گیا۔ مسجد کی چوبی چھت میں

اعلیٰ درجہ کا طلائی کام کر کے اس میں چھ سو سنہری چراغ آویزاں کئے۔ الغرض
کوئی دقیقہ اس کی زینت کو بڑھانے میں باقی نہ رکھا۔ لیکن سلطان عمر ابن عبد العزیز
نے قیمتی چراغوں کو اُتار کر اُن کی جگہ دوسرے چراغ کم قیمت کے آویزاں کئے
گیارہویں صدی عیسوی میں مسجد کا ایک حصہ آتش زدگی سے ضائع ہوگیا۔ اس کے
بعد کسی نے اس کو اصلی حالت میں لانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی مسجد میں حضرت یحییٰ
کا مزار ہے۔ چند اور تبرک مقامات اس مسجد کے اندر تبلائے جاتے ہیں جن کا
ذکر باعث طوالت ہے۔

ہم مسجد کے مغربی دروازے باب البرید سے اندر داخل ہوئے تھے دروازے
کے چاروں ستونوں پر آیات قرآنی لکھی ہوئی ہیں اور قدیم رنگ و روغن کے
آثار اب تک نمایاں ہیں مسجد کے جنوب و مغربی گوشہ میں جو مینار ہے اس کو
مدنیتہ الغربیہ کہتے ہیں۔ مصری اور عرب فن تعمیر کا یہ ایک بہترین نمونہ ہے اس
کے جوابی مینار کو مدنیتہ العیسیٰ کہتے ہیں تیسرا مینار مدنیتہ العروس شمال میں ہے۔

سلطان صلاح الدین کا گنبد

مسجد کے قریب اس نامی گرامی سلطان کا
مزار ہے جس نے جنگ صلیبی میں کارہائے
نمایاں کر کے اسلام کی شان کو باقی و برقرار
رکھا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ گنبد کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوا ہے اگر سلطان
صلاح الدین جیسا شخص یورپ میں پیدا ہوتا تو آج خدا معلوم کتنی یادگاریں اس کے
نام پر قائم ہو جاتیں۔ اس کے کارناموں کا مقابلہ اگر اس گنبد سے کیا جائے
جس کے زیر سایہ وہ میٹھی نیند سو رہا ہے تو خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں۔ یہ
کردی النسل بادشاہ دریائے شط العرب کے کنارہ ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا
ابتدائی زمانہ میں اگرچہ عالی مرتبت نہ تھا مگر لوگ کہتے ہیں۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

چنانچہ رفتہ رفتہ اپنے قوت بازو اور غیر معمولی قابلیت سے مصر و شام کا بادشاہ ہوگیا۔ ۱۸۹۸ء میں قیصر جرمنی جب دمشق کی سیر کو آیا۔ تو اس نے سلطان کی قبر پر پھول چڑھائے۔ گنبد خوبصورت لیکن مختصر ہے۔ ایک نقاب پوش عورت اس کی نگراں کار تھی۔ اس نے ہم کو پانی پلایا۔ کچھ دیر یہاں بیٹھکر مسلمانوں کی پست ہمتی کا مرثیہ پڑھتے رہے مسجد کو دیکھ کر جو کچھ مسرت ہوئی تھی وہ رنج اور تاسف میں تبدیل ہوگئی۔

مدرسہ ملک الظاہر بے بارس

کچھ فاصلہ پر مدرسہ ملک الظاہر بے بارس ہے عمارت کے اندر دیواروں پر منقش تصاویر لائق دید ہیں۔ سلطان اور اُس کے بیٹے کی قبور بھی اسی مقام پر ہیں۔ مدرسہ سے متعلق ایک مختصر کتب خانہ ہے۔ جس کو مدحت پاشا نے جمع کیا تھا۔ بعض قلمی نسخے کمیاب ہیں۔ مقابل میں سلطان کے بیٹے کی بنائی ہوئی ایک مسجد ہے۔ یہ دونوں عمارتیں فن تعمیر کے لحاظ سے ستائش کے لائق ہیں۔ سلطان بے بارس اصل میں ایک مملوک سلطان کا سپہ سالار تھا بعد کو خود مختار ہوگیا۔ عیسائیوں اور تاتاریوں کے مقابلہ میں بہت سی فتوحات اس نے حاصل کیں۔

مزارات

دمشق کے قریب ایک گاؤں الصالحیہ ہے کچھ دور تک ٹرام جاتی ہے۔ مگر ہم موٹر کے ذریعے گئے۔ یہاں ایک مشہور بزرگ محی الدین ابن العربی کا مزار ہے۔ جانب مغرب ایک پہاڑی سطح سمندر سے چار ہزار فیٹ بلند ہے۔ جس کی چوٹی پر ایک گنبد بنا ہوا ہے

س کو قبۃ النصر کہتے ہیں۔ یہاں سے اطراف کا منظر بہت دلفریب ہے۔
قیصر جرمنی بھی اس منظر سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ حضرت بلال۔ امیر معاویہ
حضرت زینب۔ (دختر حضرت علی) اور یزید کی قبریں بھی دمشق کے قریب ہیں۔

بازارات یہاں کے بازارات قدیم سے مشہور ہیں۔ خصوصیت یہ ہے کہ ان پر ٹین کی چھت ہے راستہ چلنے والوں کو موسمی تکالیف سے محفوظ رکھنے کی خاطر یہ بندوبست کیا گیا ہے۔ بازاروں میں خاص رونق رہتی ہے۔ ہندوستان کے بعض شہروں میں جس طرح خوانچے والے آواز لگاتے پھرتے ہیں۔ وہی کیفیت یہاں بھی دیکھی گئی۔ البتہ زبان کی اجنبیت کی وجہ سے ان کی آوازیں عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں۔ کبھی تو پہلو سے یہ آواز آئے گی "بِرد علی قلبکٌ" (اپنے قلب کو ٹھنڈا کرو) یا "اطفی الحرار" (اپنی پیاس بجھاؤ) یہ شخص آشورہ بیچتا ہے اور اگر تمہارے کان میں یہ آواز آئے "اللہ الرزاق یا برازق" تو سمجھو کہ یہ آدمی روٹی بیچ رہا ہے۔ برازق ایک قسم کی روٹی ہوتی ہے جس پر سکہ لگا کر تل چھڑک دیتے ہیں عربی میں بازار کو سوق کہتے ہیں۔ چنانچہ یہاں کے بازاروں کے نام کے ساتھ سوق ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً سوق الحمیدیہ۔ سوق علی پاشا۔ سوق الخیاطین وغیرہ۔ بازاروں کے علاوہ چند مارکٹ ہیں جن کو خان کہتے ہیں۔ خان سعد پاشا سب سے بہتر ہے۔ میوے کی دکانیں کثرت سے دیکھی گئیں۔ ایک بڑی دکان مٹھائی کی دیکھی جس میں انواع و اقسام کی مٹھائیاں خوبصورت بکسوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ دکان والا کہتا تھا کہ اس دکان کی مٹھائی غیر ممالک میں بھی جایا کرتی ہے۔

نقاب پوش عورتیں اپنے کاروبار کے لئے بلا تکلف باہر نکلتی ہیں

ایک روز عجیب لطیفہ ہوا۔ ہم لوگ بازار میں گشت لگا رہے تھے کہ کوئی دیوانہ اِس طرف آ گیا۔ اس کی بعض حرکات سے لوگ سراسیمہ ہو کر اُدھر اُدھر جان چھپانے لگے۔ ایک نقاب پوش عورت ایسی خوف زدہ ہوئی کہ بلا تکلف رفیق بیگ سے چمٹ گئی۔ اِس وقت ان کی پریشانی دیکھنے کے لائق تھی۔ قاہرہ کی طرح یہاں بھی فاحشہ عورتوں کا بازار ہے۔ رات کے وقت وہاں مجمع رہتا ہے۔ البتہ بیت المقدس میں یہ چیز مفقود ہے۔ رات کے وقت سڑکوں پر روشنی کا بندوبست خاطر خواہ نہیں پایا گیا۔ اکثر اندھیرا رہتا ہے لوگ زیادہ تر گورے رنگ کے اور حسین ہوتے ہیں۔

کوہ لبنان

۱۱ مئی کو صبح کے وقت دمشق سے بیروت روانہ ہوئے۔ ترجمان کے ذریعہ موٹر کا بندوبست کیا گیا۔ تقریباً تین گھنٹے کا راستہ ہے۔ کوہ لبنان کی چوٹیوں اور گھاٹیوں میں سے ہو کر سڑک گزرتی ہے مناظر قدرت کی دلفریبی بیان سے باہر ہے۔ یہاں کا ہوشربا منظر دنیا کے بہترین مناظر میں شمار کیا جاتا ہے۔ گھاٹیوں میں چھوٹی چھوٹی آبادیاں بھی ہیں۔ موسم گرما میں اکثر لوگ یہاں آ کر رہتے ہیں۔ کہیں کہیں چھ ہزار فیٹ کی بلندی پر سے گذر رہی ہے۔ ریل کی سڑک بھی ان ہی پہاڑوں پر سے بنائی گئی ہے بعض چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ دیکھنے میں آیا۔ عجیب دلفریب اور دلکش مقام ہے دل چاہتا تھا کہ یہیں ٹھہر جاؤ۔ ایک مقام پر نصف گھنٹے تک بیٹھے تفریح کرتے رہے۔ ان ہی پہاڑوں پر سے سمندر بھی دکھائی دیتا ہے۔

بارہ بجے کے قریب بیروت پہنچے۔ ایک خوبصورت بندرگاہ ہے اس کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہوگی زیادہ تر عیسائی آباد ہیں رونق اور

بیروت

چہل پہل دمشق سے زیادہ ہے۔ بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی تجارت بھی بڑھی ہوئی ہے۔ عربی اور فرانسیسی عام طور پر بولتے ہیں۔ انگریزی داں کم ہیں۔ ایک ہوٹل میں قیام کیا جوارزاں اور اچھا تھا۔ تینوں آدمیوں کے لئے ایک پونڈ روزانہ مقرر ہوا۔ اس میں کھانا بھی شریک تھا۔ لیکن زبان کی تکلیف رہی۔ ہوٹل والے انگریزی سے ناواقف تھے۔ کھانے کی فہرست عربی میں تھی۔ مجبوراً باورچیخانہ میں جاکر چیزوں کا انتخاب کرلیتے تھے۔

یہاں کوئی دلچسپ آثار قدیمہ نہیں ہیں۔ ہماری خواہش تھی کہ بیروت سے بذریعۂ ریل انگورہ جائیں۔ لیکن چند مشکلات کا سامنا تھا ملک کے اس حصہ میں ریل کا سفر ابھی آرام دہ نہیں ہے تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد جہاز کے ذریعہ قسطنطنیہ جانا مناسب معلوم ہوا اسٹمار کمپنی کا ایک جہاز برازیل ۲۲ مئی کو روانہ ہونے والا تھا۔ اس میں تیسرے درجہ کے کیبن بھی تھے۔ فی شخص ۶ پونڈ سے کچھ اوپر کرایہ مع کھانے کے ہوا۔ ساڑھے تین دن میں یہ جہاز بیروت سے استنبول پہنچتا ہے۔ غالباً سب کو معلوم ہے کہ جنگ عظیم کے بعد جدید حکومت نے قسطنطنیہ کا نام استنبول سے تبدیل کردیا ہے اور بہت سختی کے ساتھ اس قاعدے کی پابندی کرتے ہیں۔

۲۲ مئی کو نو بجے کے قریب جہاز کی کمپنی کے دفتر گئے۔ اور ٹکٹ خریدے۔ وہاں ایک مہذب نما آدمی سے ملاقات ہوئی۔ یہ فارسی جانتا تھا کمپنی کا ملازم انگریزی سے برائے نام واقف تھا۔ مہذب نما آدمی نے ہماری اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ناخواندہ مہمان بن کر دخل در معقولات کرنے لگا۔ ہم سمجھے کہ اخلاقاً ہماری امداد میں مصروف ہے مگر بعد کو معلوم ہوا۔ کہ

سلام روشنائی بے غرض نیست۔ اسباب بندرگاہ تک پہنچانے کے لئے ان کے توسط سے ایک مزدور کو بلوایا۔ چلتے وقت حضرت کی نذر کچھ کرنا پڑا۔

بیروت کا ترجمان

دس بجے کے قریب بندرگاہ پہنچے۔ یہاں بہت سے امور تحمیل طلب تھے۔ ایک ترجمان صاحب دستور کے مطابق شکار کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم کو آتا دیکھ کر ان کے چہرے پر آثار مسرت نمایاں ہوئے اور وہ استقبال کے واسطے آگے بڑھے ان کا دل اندر سے کہتا ہوگا کہ

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما
ذکر تو بود زمزمۂ شادیٔ ما

الغرض بلا کسی گفت وشنید کے ہمارے رہبر بن گئے کچھ اس طرح راستہ بتاتے ہوئے سامنے چلنے لگے کہ جیسے ہم ہی نے ان کو مقرر کیا تھا۔ ان سے نجات بظاہر مشکل معلوم ہوئی اس لئے ہم نے بھی ان کو اپنا رہبر ہونا تسلیم کرلیا۔ بندرگاہ کے دفتر میں رہبر کے ساتھ کچھ دیر ٹھہرنا پڑا۔ کن کن باتوں کی دریافت ہوئی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ رہبر ہم کو کمرے کے باہر کھڑا کر کے خود اندر چلا جاتا کچھ دیر کے بعد آکر کہتا کہ یہاں طبی معائنہ ہوا کرتا ہے میں نے سب کچھ طے کرلیا ہے یہاں کچھ دینا پڑے گا ورنہ یہ لوگ ستائیں گے۔ اسی طرح کئی دفعہ باتیں بنا کر وہ کچھ نہ کچھ ہم سے لیجاتا۔ خدا معلوم اس کی جیب میں یہ رقم گئی یا اس نے کسی کو دی۔ البتہ ایک کمرے میں ہم کو بلایا گیا۔ پاسپورٹ کے حوالہ سے ایک رجسٹر میں نام لکھے گئے۔ دفتر کا ایک ملازم کچھ الفاظ انگریزی کے جانتا تھا۔ گاندھی جی کے حالات دریافت کرنے لگا۔ کولمبو سے برابر یہی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ بازار ہو کہ ہوٹل ہو جب کوئی شخص ملتا گاندھی جی کے

حالات دریافت کرتا۔ ہم کسی نہ کسی طرح پہلو بچا لیتے کیونکہ اول تو یہ لوگ انگریزی
سے ناواقف ہوتے ہیں ان کو مطلب سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے
غیر ملک میں اجنبی لوگوں سے سیاسی امور پر گفتگو کرنا بھی مناسب نہ تھا۔
تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد ایک دوسری مصیبت سے سامنا ہوا۔
یعنے ترجمان کے محنتانہ کا سوال معرض بحث میں آیا۔ اس کا مطالبہ بہت زیادہ
تھا۔ بڑی جھک جھک ہوتی رہی۔ بلکہ جہاز پر ہمارے پیچھے کیبن کے اندر
آگیا۔ شاید وہ سمجھا کہ اجنبی ہونے کی وجہ سے ہم لوگ مرعوب ہو جائیں گے۔
اس خیال خام نے اس کو کسی قدر گستاخ بنا دیا۔ بات زیادہ بڑھ گئی۔ ہمارے
برادر مکرم مرزا سلیم بیگ صاحب کی رگوں میں خون مغلیہ موج زن ہو گیا۔
قریب تھا کہ وہ اس بدتمیز کی گردن ناپتے کہ اتنے میں دو ایک ملازمین جہاد
وہاں آ گئے اور انھوں نے ترجمان کو باہر نکال دیا۔

بیروت سے استنبول بذریعہ جہاز

بارہ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا۔ یہ ایک چھوٹا سا
جہاز اطالوی کمپنی کا ہے دو ایک افسر
انگریزی جانتے ہیں مگر ملازمین اس زبان
سے ناواقف ہیں۔ تیسرے درجہ کے
کیبن آرام دہ ہیں لیکن کھانا معمولی تھا۔ کھانے کا کمرہ صاف ستھرا اور میز کرسی
سے آراستہ تھا۔ ہمارا باورچی بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ اس کی ہر ایک حرکت
ہندوستان کے ہیجڑوں کی یاد کو تازہ کرتی تھی۔ کمر کی لچک ہاتھوں کا مٹکانا
اور طرز گفتگو غرض کسی بات میں کم نہ تھا۔ سب مسافر یوروپین تھے کچھ عورتیں
تھیں اور کچھ مرد۔ تیسرے درجہ کے واسطے ڈک بھی اچھا ہے۔ الغرض خاصا
آرام ملا۔ تیسرے درجہ میں دس بارہ مسافر تھے ایک جرمن تھا جو دیانا سے

بسلسلہ کاروبار بمبئی جانے والا تھا۔ لیکن سیاسی شورش کی خبر سُن کر پورٹ سعید سے واپس ہو گیا۔ اس کو خوف تھا کہ بمبئی میں کوئی اس کو انگریز سمجھ کر جان سے مار ڈالے گا۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس سے گفتگو رہتی تھی۔ دو عورتیں ڈنمارک کی رہنے والی تھیں۔ ایک سن رسیدہ اور دوسری نوجوان تھی۔ سن رسیدہ عورت کسی تعلیمی انجمن کی معتمد ہے اور نوجوان عورت اس کی مددگار ہے۔ انجمن کے اغراض کی خاطر یہ دونوں مختلف ممالک میں دورہ کرتی رہتی ہیں۔ دونوں انگریزی سے کافی طور پر واقف ہیں۔ سن رسیدہ عورت سے اکثر تعلیمی امور پر گفتگو رہتی تھی۔ اس نے ہم کو ڈنمارک آنے کی دعوت دی۔ کہتی تھی کہ اس نے فرانسیسی زبان سے قرآن شریف کا ترجمہ ڈنمارک کی زبان میں کیا ہے۔ اور ایک کتاب دنیا کے مذاہب پر لکھنے والی ہے۔ یہ دونوں عورتیں اٹلی جا رہی ہیں۔ ایک امریکن مسافر یونان جا رہا ہے۔ چونکہ انگریزی جانتا تھا اس سے اکثر بات چیت رہتی تھی۔ ایک انگریز مسافر ہے جس کی عمر (۷۰) سال کے قریب ہوگی۔ اس کی بیوی مر چکی ہے۔ اولاد کی طرف سے بےفکری ہے جوانی میں روپیہ خوب کمایا۔ بڑھاپے میں سیاحت کا شوق ہوا۔ اب گھر میں بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔ کسی روز سمندر ہی میں یا غیر ملک کے کسی ہوٹل میں اس کا خاتمہ ہو جائے گا میں نے پوچھا آخر کب تک خاک چھانتے رہو گے۔ کیا تم کو آرام کی ضرورت نہیں ہے۔ جواب ملا کہ "جب تک ہاتھ پاؤں کام کرتے ہیں میں اپنے شوق کو پورا کرتا رہوں گا۔ زندگی کے دن تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں۔ میں اپنی ہوس کو پورا کیوں نہ کر دوں۔ اب رہا مرنا تو اس کے لئے جگہ کی کیا خصوصیت ہے۔ جہاز پر مرے تو سمندر میں جگہ کی کمی نہیں۔ اور کسی ہوٹل میں مرے تو دفن کرنے والوں کی کمی نہیں۔" سبحان اللہ کیسے کیسے خیالات کے لوگ دنیا میں

موجود ہیں۔

اِس جہاز پر تیسرے درجہ والوں کو سہ پہر کی چائے نہیں دیتے جس کو ضرورت ہے وہ درجۂ دوم میں جاکر باادائی قیمت چائے یا کافی پی سکتا ہے۔

ایک دلچسپ قصہ

بڑھیا اور نوجوان عورت کے درمیان تعلقات کسی قدر کشیدہ معلوم ہوئے۔ بڑھیا کو نوجوان پر بھروسہ نہیں تھا۔ سختی کے ساتھ اس پر نگرانی رکھتی تھی۔

ایک روز یہ اتفاق ہوا کہ کھانے کی میز پر بسلسلۂ گفتگو بڑھیا نے مجھ سے کہا کہ مسٹر بیگ تم چونکہ مجسٹریٹ ہو اس لئے میں تم سے ایک قانونی مسئلہ دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ فرض کرو ایک نوعمر لڑکی کسی نوجوان مرد پر عاشق ہے اور یہ دونوں مصر کے قدیم مقبروں میں سیر کے واسطے جاتے ہیں وہاں بعض نادرالوجود اشیاء معائنہ کی غرض سے رکھی ہوئی ہیں۔ معشوقہ کی فرمائش پر اس کا عاشق محافظ مقبرہ کو رشوت دیکر ایک چیز حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس مال مسروقہ کو نوجوان لڑکی باوجود علم تحفتاً قبول کر لیتی ہے۔ یہ بتاؤ کہ عورت قانوناً اور اخلاقاً جرم کی مرتکب ہوئی یا نہیں۔ میں نے کہا میرے نزدیک تینوں آدمی مجرم ہیں۔ یہ سُن کر نوجوان عورت برانگیختہ ہوئی مجھ سے تو مخاطب ہوئی نہیں لیکن بڑھیا کی اِس نے خبر لے ڈالی۔ کہتی تھی کہ تم بالکل غلط واقعات بیان کر رہی ہو۔ مجھ کو ذاتی علم ہے کہ واقعہ کچھ اور ہے۔ دونوں میں بے لطف گفتگو ہونے لگی۔ ہم نے مصلحت وقت کے خیال سے گفتگو کا رنگ بدل دیا۔

اس وقت بات ٹل گئی۔ دوسرے دن کھانے کے وقت نوجوان عورت میرے قریب بیٹھ گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کھانا جب ختم ہوگیا اور لوگ اٹھنے لگے تو مجھ کو اس نے ٹھہرا لیا۔ کہتی تھی کہ کافی پی کر جانا۔ میں

ٹھیر گیا۔ سب لوگ جب چلے گئے تو اس نے کہا میں نے تم کو اس غرض سے روکا ہے کہ ایک غلط فہمی کو رفع کر دوں۔ کل جو گفتگو بڑھیا نے کی تھی۔ اس کی وجہ سے ممکن ہے کہ تم کو میرے متعلق غلط فہمی پیدا ہوئی ہو۔ میں نے کہا اس واقعہ کو تمھاری ذات سے کیا تعلق ہے جواب دیا کہ جس نوجوان لڑکی کا ذکر بڑھیا نے کیا تھا دراصل مراد مجھ سے ہے لیکن اصلی واقعات کچھ اور ہیں جن کا اظہار نامناسب خیال کرتی ہوں۔ مگر تم کو باور کرانا چاہتی ہوں کہ میرے اخلاق اس قدر گرے ہوئے نہیں ہیں۔ جیسا کہ اس بڑھیا کی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا۔ میں نے کہا تم اطمینان رکھو۔ ہم نے اس گفتگو کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے متعلق ایک عجیب و غریب قصہ بیان کیا۔ جس کو میں صحیح باور نہیں کرتا۔ اس نے اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی روحانی قوت کو اس درجہ بڑھا لیا ہے کہ اگر چاہوں تو ہر ایک عضو میرے جسم سے الگ ہو جائے بلکہ جسم کے متعدد ٹکڑے ہو جائیں اور جس وقت چاہو تمام جسم اصلی حالت میں آجائے۔ میں نے اظہار تعجب کر کے تماشہ دیکھنے کی تمنا ظاہر کی اس نے کہا کچھ عرصہ سے میری مشق کم ہو گئی ہے۔ کیونکہ فرصت نہیں ملتی۔ اس لئے اب پوری طرح اس کام کو نہیں کر سکتی۔ میں نے عدیم الفرصتی کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا کہ میں اسلام پر ایک کتاب لکھ رہی ہوں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ وہ عربی سے محض ناواقف ہے۔

طرابلس الشرق

پہلے دن شام کو چار بجے جہاز طرابلس الشرق کے بندرگاہ پر پہنچا۔ ایک کشتی کے ذریعہ سیر کرنے گئے۔ جہاز بندرگاہ سے فاصلہ پر ٹھہرا۔ ہوا سرد اور تیز تھی۔ کشتی چھوٹی اور ہلکی ہونے کی وجہ سے ہلتی بہت تھی۔ مجھ کو خفیف سا چکر معلوم ہوا۔ اگرچہ چند

بدا پسٹ کی لڑکیاں قومی لباس میں خیراتی کام کے لئے چندہ مانگ رہی ہیں۔

دولمہ باغچہ محل — استنبول

اور بیٹھنا پڑتا تو حالت یقیناً خراب ہو جاتی۔ ایک وکٹوریہ گاڑی کرایہ پر لیکر شہر میں گشت کی۔ چھوٹا مقام ہے۔ شہر کے ایک حصہ میں خچروں کی ٹرام چلتی ہے۔ بازار میں کچھ میوہ وغیرہ خریدا۔ نقاب پوش عورتیں کاروبار میں مصروف نظر آئیں۔ واپسی کے وقت بندرگاہ پر ایک چھوٹا سا مجمع دیکھا۔ ایک مسلمان مسافر جہاز پر سوار ہونے کے لئے جا رہا تھا اس کے عزیز و اقارب خدا حافظ کہنے کے لئے جمع تھے۔ کئی ایک نقاب پوش عورتیں بھی موجود تھیں یہ اس مسافر سے ملکر روتی تھیں۔ جہاز پر پہنچنے کے بعد بہت دیر تک دوران سر رہا۔ دوسرے دن جزیرہ سائپرس کے دو مقامات پر جہاز نے لنگر ڈالا۔ تجارتی سامان لیا گیا اور کچھ دیا گیا۔ یہاں مسافر سیر کے واسطے نہیں اترے۔ جرمن مسافر سے اکثر گفتگو رہتی تھی۔ وہ بار بار ہندوستان کے حالات دریافت کرتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ ہندوستان میں عام طور پر یوروپین لوگوں کے قتل و غارت کا بازار گرم ہے اس سے معلوم ہوا کہ اسٹریا میں کپڑے اور جوتے بہت سستے بنتے ہیں۔ کہتا تھا کہ انگلستان والے نئے بنائے سوٹ آسٹریا سے لیجاتے ہیں۔ اور اپنا لیبل لگا کر فروخت کرتے ہیں۔ خدا معلوم اس کا بیان حقیقت پر مبنی تھا یا محض تجارتی مصالح پر۔

درہ دانیال

۲۵ ہے کو شام کے چار بجے جہاز درہ دانیال میں داخل ہوا سمندر کا یہ حصہ اپنے موقع کے لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتا ہے قدرت نے اس کو ایسے نمونہ پر بنایا ہے کہ غنیم کا سمندر کی طرف سے قسطنطنیہ پر حملہ کرنا مشکل ترین امر ہے۔ یہ سمندر تقریباً (۴۵) میل لمبا ہے۔ دونوں جانب پہاڑیاں ہیں۔ کسی مقام پر ۵ میل سے زاید چوڑا نہیں ہے اور کہیں کہیں اس کی چوڑان ایک میل سے بھی کم ہے۔ ظاہر ہے کہ

اگر دونوں طرف توپیں لگا دی جائیں تو ان کی زد سے غنیم کا کوئی جہاز بچ کر نہیں نکل سکتا۔ ایشیائی ساحل کی جانب قلعۂ سلطانیہ ہے۔ کلید بحر اس کے بالمقابل ہے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں یہاں بڑی معرکہ آرائی ہوئی۔ چنانچہ ایک طرف یادگار بھی قائم ہے۔

استنبول کا موقع

صبح کو سات بجے جہاز استنبول پہنچا۔ شاخ زرین کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مشہور ہے کہ دنیا میں اس نوعیت کا منظر کم یاب ہے۔ تاوقتیکہ نقشہ پیش نظر نہ رکھا جائے۔ قسطنطنیہ کا موقع اچھی طرح سمجھ میں آنا مشکل ہے درۂ دانیال ایک تنگ آبنائے ہے جس کے جنوب میں بحیرۂ روم ہے اور دوسری جانب بحر مارمورہ ہے۔ بحر مارمورہ اور بحر اسود کے درمیان ایک دوسرا تنگ آبنائے ہے جس کو باسفورس کہتے ہیں۔ باسفورس کے جنوبی دہانہ پر یورپ کے ساحل کی جانب استنبول آباد ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ اس شہر کی حیثیت ایک جزیرہ نما کی ہے۔ بالکل ہندوستان کا جنوبی حصہ معلوم ہوتا ہے۔ محل وقوع سات چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر ہے۔ اس کے شمالی جانب شاخ زرین ہے مشرق میں باسفورس ہے اور جنوب میں بحر مارمورہ ہے۔ شاخ زرین نے شہر کو دو حصوں پر منقسم کر دیا ہے۔ ایک جانب استنبول ہے اور دوسری جانب غلطہ و پیرا۔ باسفورس کے مشرقی جانب ایشیا کے ساحل پر سقوطرہ واقع ہے۔

شاخ زرین

شاخ زرین کی لمبائی تقریباً ساڑھے چار میل ہے۔ وسعت اگرچہ کم ہے لیکن گہرا اتنا ہے کہ بڑے بڑے جہاز بلا خوف وخطر آتے جاتے ہیں۔ جس وقت ہمارا جہاز شاخ زرین کے

قریب پہنچا۔ مساجد کے عالیشان مینار اور گنبد دکھائی دینے لگے عجیب دلکش منظر تھا۔ غلطہ کا بندرگاہ شاخ زرین پر ہے۔

پاسپورٹ کا جھگڑا

جہاز نے جس وقت لنگر ڈالا۔ ترکی پولیس کے افسر جہاز پر آ گئے۔ اور پاسپورٹ کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔ ہمارے پاسپورٹ پر کک کمپنی کی توسط سے ویسا ہوا تھا۔ بمبئی میں فی الحال ترکی گورنمنٹ کا کوئی نمایندہ نہیں ہے۔ سویڈن کا سفیر نیابت کرتا ہے اس نے مقررہ فیس لے کر پاسپورٹ پر ویسا کیا تھا۔ ترک افسر نے اس ویسا کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کو شبہ تھا کہ شخص مجاز نے کیا ہے یا نہیں۔ جہاز کے ایک افسر کے توسط سے بات چیت رہی۔ کیونکہ ترک افسر انگریزی سے ناواقف تھا اس معاملہ میں تکرار ہوتی رہی۔ بالآخر طے پایا کہ پاسپورٹ پولیس کے صدر دفتر میں بغرض دریافت بھجوا دیے جائیں۔ اس کارروائی میں چونکہ عرصہ درکار تھا اس لئے اس شرط پر جہاز سے اُترنے کی اجازت دی گئی۔ کہ اپنی ہوٹل کا پتہ لکھوا دیں۔ ہم نے کہا ہم بالکل اجنبی ہیں۔ شہر میں جانے کے بعد ہوٹل دیکھیں گے اور جو پسند آئیگا اس میں ٹھہر نیگے۔ ترک افسر اس پر رضامند نہ ہوا۔ اس کا اصرار تھا کہ جہاز ہی پر ہوٹل کا انتخاب کرلو۔ ہم نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ البتہ امریکن اکسپرس کے ذریعہ ہم سے خط وکتابت کر سکتے ہو۔ جواب ملا کہ ہمارے پاس ہوٹلوں کی فہرست موجود ہے۔ کسی ایک ہوٹل کا انتخاب کرلو۔ ورنہ جہاز سے اُترنے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ پولیس افسر کا یہ فیصلہ سن کر کئی ایک ہوٹلوں کے نمایندے جو وہیں کھڑے تھے ہم کو گھیرنے لگے۔ اطمینان کے ساتھ بات کرنا مشکل ہوگیا۔ لطف یہ کہ انگریزی ایک کو نہیں آتی تھی۔ مردہ

بدست زندہ کی مثل صادق آئی۔ ایک شخص کے ساتھ ہو لئے۔ اس نے ہوٹل کا پتہ۔ پولیس افسر کے پاس نوٹ کروا دیا۔ اور اسباب اٹھوا کر بندرگاہ پر لایا۔ ہمارا کام اتنا ہی تھا کہ اس کے ساتھ ہو جائیں۔

زمانۂ جنگ کے بعد سے پاسپورٹ کی مصیبت ایجاد ہوئی ہے۔ نہایت تکلیف دہ طریقہ ہے۔ اس جکڑ بندی نے مسافرین کی جائز آزادی کو سلب کر لیا ہے۔ اکثر لوگ اس طریقہ کو مسدود کرنے کے لئے غل بھی مچا رہے ہیں ترکی پولیس کی اس قدر سختی مسافرین کے ساتھ باعث زحمت ضرور ہے مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یورپ میں سب جگہ یہی عمل ہے۔ جہاز پر ایک امریکن عورت تھوڑی دیر کے لئے شہر میں جا کر واپس آنا چاہتی تھی۔ ترک افسر نے اس کو اُترنے کی اجازت نہ دی۔ اعتراض یہ تھا کہ پاسپورٹ پر ویسا نہیں ہوا ہے اول ویسا کی فیس داخل کرو۔ اس کے بعد جاؤ وہ کہتی تھی کہ میں امریکن سفیر سے ملنے جاتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں جہاز پر واپس آ جاؤنگی۔ جواب ملا کہ زیادہ گفتگو کی نہ تو فرصت ہے اور نہ ضرورت جانا چاہتی ہو تو چار ڈالر (تقریباً سولہ روپیہ) یہاں رکھ دو میم صاحبہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ ایک یونانی مسافر اپنی بیوی کو شہر کی سیر کرا کے واپس آنا چاہتا تھا۔ یہ شخص ویسا کی فیس دینے پر بھی آمادہ تھا لیکن جواب ملا کہ تمھارے پاسپورٹ میں ترکی کا ذکر نہیں ہے اس لئے اجازت نہیں مل سکتی۔ دونوں میاں بیوی استنبول دیکھنے کا بڑا اشتیاق رکھتے تھے۔ اجازت نہ ملنے پر حسرت ناک نظر سے شہر کی طرف دیکھنے لگے۔ یونانی نے یہ بھی کہا کہ بیروت کے ترکی سفیر نے کہا تھا کہ جہاز ہی پر فیس دے کر ویسا کروا لینا۔ پولیس افسر نے کہا یہ بات خلاف قاعدہ ہے۔ ترکی سفیر کی تحریر پیش کرو۔ غرض یہ کہ اجنبی مسافروں کے ساتھ

بڑی سختی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔

جہاز سے اُترنے کے بعد کسٹم ہوز یعنی کروڑگیری کے دفتر میں گئے یہاں سامان دیکھا گیا۔ جہاز پر بعض مسافروں نے ڈرا دیا تھا کہ کروڑگیری والے بہت ستائیں گے۔ لیکن شکر ہے کہ بہت آسانی کے ساتھ یہ مرحلہ طے ہوگیا۔ اس کے بعد رہبر نے ہم کو ایک قریب کے قہوہ خانے میں بٹھادیا خود بھی قہوہ میں شریک رہا۔ بہت دیر تک یہاں بیٹھے رہے۔ جب چلنے کو کہا تو اس کے ساتھ ہو لئے۔

ہوٹل پیرا میں ایک جرمن ہوٹل ہے وہاں اس نے ہم کو ٹھہروایا۔ یہ ہوٹل ہم کو ناپسند تھا۔ لیکن پتہ لکھوا چکے تھے اس لئے مجبوراً ٹھہرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ رہبر صاحب ہوٹل کے ملازم نہیں ہیں۔ بلکہ دونوں طرف سے کمیشن لیتے ہیں۔ بڑی دیر تک معاوضہ کے متعلق حجت رہی۔ یہ شخص چاہتا تھا کہ ہم اس کے ذریعہ شہر کی سیر کریں لیکن آدمی معقول معلوم نہیں ہوا۔ اس لئے ہم نے ٹال دیا۔ کھانا شامل کرکے تینوں آدمیوں کے لئے چھبیس شلنگ روزانہ قرار پائے۔ مالک ہوٹل کی بیوی کسی قدر انگریزی کی ٹانگ توڑ لیتی ہے۔ دو نوجوان عیسائی عورتیں کھانا کھلانے پر مقرر ہیں۔ ایک انگریزی صاف بولتی ہے۔ دوسری کے ساتھ اشارے کرنے پڑتے ہیں۔

پاسپورٹ واپس مل گیا ہم کو پاسپورٹ کی فکر لگی ہوئی تھی۔ تین روز انتظار کرکے کک کمپنی کے دفتر گئے۔ منیجر نے پولیس کے دفتر سے ٹیلیفون ملا کر بہت دیر تک باتیں کیں ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا باتیں ہورہی ہیں لیکن منیجر نے کہا کہ آپ لوگ اطمینان

رکھیں۔ شام کو ہوٹل پر پاسپورٹ مل جائیں گے۔ چنانچہ رات کو ایک پولیس افسر پاسپورٹ لے کر آیا۔ ایک فارم پر ہمارے نام لکھے گئے اور پاسپورٹ واپس مل گئے مگر دوبارہ تصویر کھنچوا کر داخل کرنی پڑی۔

استنبول کی تاریخ

قسطنطنیہ ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے اس کے جدید نام استنبول پر آج کل بہت اصرار ہے۔ سُنا ہے کہ بعض دفعہ ڈاکخانہ والے ان خطوط کو جن پر قسطنطنیہ لکھا ہو اس عذر کے ساتھ واپس کر دیتے ہیں کہ اس نام کا کوئی شہر یہاں نہیں ہے۔ سب سے قدیم نام اس شہر کا (BYSANTIUM) ہے۔ اس وقت یونانی حکومت تھی۔ سنہ ۳۳۰ء میں روم کے ایک بادشاہ قسطنطین اعظم نے یہاں اپنا دارالحکومت قائم کر کے اس کو از سرِ نو آباد کیا۔ اُس وقت سے بانی کے نام پر یہ شہر مشہور ہوا بہت عرصہ تک یہ رومتہ الکبریٰ کا مشرقی دارالسلطنت رہا۔ مستحکم فصیل اور موقع کی خوبیوں نے متعدد دفعہ اس کو دشمنوں کے سخت حملوں سے محفوظ رکھا۔ سنہ ۱۴۲۲ء میں سلطان مراد ثانی نے اس کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ تقریباً تیس برس بعد سلطان محمد ثانی نے بڑی حکمتِ عملی کے ساتھ فتح کیا۔ ترکوں کی یہ کامیابی سنہری حروف میں لکھنے کے لائق ہے۔ استقلال اور شجاعت کا جو ثبوت انھوں نے دیا وہ ہمیشہ کے لئے اس قوم کے واسطے طرۂ امتیاز رہیگا۔ اُس زمانے میں مسلمانوں کی کیفیت ہی کچھ اور تھی۔

فرق تیار فرشِ زمیں پر پڑا ہوا
ہمت کا پاؤں عرشِ بریں پر گڑا ہوا

جنگ عظیم تک یہ شہر ترکی سلطنت کا دارالخلافت رہا۔ بعد کو مصطفےٰ کمال پاشا نے

مرکز حکومت انگورہ میں منتقل کر دیا۔

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

شہر کی تقسیم شہر کے تین بڑے حصے استنبول۔ غلطہ اور پیرا کے نام سے موسوم ہیں۔ اصلی آبادی استنبول ہے غلطہ اور استنبول کے درمیان دو بڑے پُل ہیں جن میں سے ایک پل اچھی حالت میں ہے اور کثرت سے آمدورفت رہتی ہے۔ اِس پر سے گذرنے کے لئے ایک قلیل ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ ہماری موجودگی میں یہ ٹیکس ہمیشہ کے لئے معاف کر دیا گیا۔ غلطہ اس شہر کا بندرگاہ ہے جہاں دن بھر سینکڑوں اسٹیمر کشتیاں اور جہاز آتے جاتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے بنک اور تجارتی کوٹھیاں بھی اِس حصہ میں ہیں۔ غلطہ کے پشت پر پیرا ہے۔ یہ کسی قدر بلندی پر ہے۔ چنانچہ غلطہ سے پیرا کو جانے کے لئے بعض راستوں پر سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ غلطہ میں ایک قدیم بُرج (۱۴۸) فیٹ بلند ہے۔ شہر میں کہیں آگ لگتی ہے تو اِس بُرج پر سے اطلاع دی جاتی ہے۔ بڑی بڑی دکانیں ہوٹل اور رستوران پیرا میں ہیں۔ یورپین آبادی بھی اسی طرف ہے۔ عمارتیں اگرچہ کئی منزل کی ہیں۔ لیکن سڑکیں تنگ ہیں۔ یہاں کے اکثر مکانات لکڑی کے اور بوسیدہ ہیں۔ بازاروں میں رونق رہتی ہے۔

استنبول کی مساجد استنبول میں چند مساجد دیکھنے کے لائق ہیں سب سے مشہور مسجد ایا صوفیا ہے۔ یہ عمارت پہلے عیسائیوں کی عبادت گاہ تھی۔ ترکوں نے اس کو مسجد کر لیا۔ اس کی اندرونی آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے باہر سے عمارت معمولی ہے۔ لیکن اندر مختلف رنگ کے قیمتی سنگ مرمر اور سنہری بلور کے ٹکڑوں کی پچی کاری و

دیگر ساان آرائش نے عجیب شان پیدا کردی ہے قیمتی قالینوں کا فرش
بے جواب بوسیدہ ہو گئے ہیں۔ ان میں سے سیل کی بو بھی آتی تھی۔ معلوم ہوتا
ہے کہ کوئی اِن کو دھوپ بھی نہیں دیتا۔ مذہب کی طرف سے جو لا پروائی
ترکوں میں پیدا ہوگئی ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ قدیم مساجد کس مپرسی
کی حالت میں پڑی ہیں۔ مسجد سلطان احمد، مسجد ایوب۔ اور مسجد نیی والدہ (جس کو
سلطان محمد چہارم کی والدہ نے بنوایا تھا) دیکھنے کے لائق ہیں۔ مسجد سلیمان تُو کی
فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس کو سلطان سلیمان نے بنوایا تھا۔ تقریباً
آٹھ سو مساجد اس شہر میں ہیں۔ جن میں سے بیس مسجدیں تو ایسی ہیں جو پہلے
عیسائیوں کی عبادت گاہیں تھیں۔ آجکل کے زمانے میں بہت کم لوگ نماز کے
لئے مسجد میں آتے ہیں۔

استنبول کے حصہ میں شاخ زرین کے کنارے ایک قدیم محل ہے اس کو
عسکی سرائے کہتے ہیں۔ پہلے اس محل میں ترک سلاطین رہا کرتے تھے چنانچہ
اس کے داخلہ کا بڑا دروازہ باب ہمایوں کے نام سے مشہور تھا اور اسی نسبت
سے حکومت ترکی کو باب عالی بھی کہتے تھے۔ یہ دروازہ آتش زدگی سے
جل گیا۔ ۱۸۵۵ء میں سلطان عبد الحمید نے اس محل کی سکونت کو ترک
کیا اور اس جدید محل میں چلے گئے جو باسفورس کے کنارے پر دولما باغچہ
کے نام سے مشہور ہے یہ ایک نہایت خوبصورت اور عالیشان عمارت ہے
ہم نے اس کے پھاٹک کی ایک تصویر لی۔ عسکی سرائے میں اب ترکی
عجائب خانہ ہے۔

باسفورس شہرت کے لحاظ سے اس شہر میں کوئی خصوصیت نہیں
البتہ قدرتی مناظر اچھے ہیں۔ شاخ زرین کے علاوہ

باسفورس کے دونوں جانب سرسبز پہاڑیاں۔ مکانات اور قلعہ وغیرہ بہت دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ روزانہ متعدد اسٹیمر غلطہ سے باسفورس کی طرف آتے جاتے رہتے ہیں۔ مسافروں کی کثرت رہتی ہے۔ اکثر اوقات بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ باسفورس کے ایشیائی ساحل پر سقوطری۔ اناطولی حصار۔ اور اناطولی کا وقمی خاص مقامات دیکھنے کے لائق ہیں۔ آخر الذکر مقام پر ایک قلعہ چھ سو برس پہلے کا بنا ہوا ہے۔ یوروپین ساحل پر ایک قلعہ رومی حصار ہے جس کو سلطان محمد فاتح نے نہایت عجلت اور مستعدی کے ساتھ تعمیر کروایا تھا تاکہ اس جانب سے شہر پر حملہ کرنے میں سہولت ہو اس سے آگے بڑھ کر تھراپیا ہے یہاں موسم گرما میں یوروپین لوگ اور دیگر عمائد شہر رہا کرتے ہیں۔ فی الواقعی یہ مقام رہنے کے لائق ہے۔ زمین کا نشیب و فراز اور سبزہ زار ایک خاص قسم کی فرحت پیدا کرتا ہے۔ شہر کی نسبت یہاں خنکی رہتی ہے۔

بیوک درہ تھراپیا کے قریب بیوک درہ نامی ایک قصبہ ہے اس مقام پر ہم دو دفعہ بسواری موٹر گئے قاہرہ میں جن مصری پاشا سے ملاقات ہوئی تھی اُن کے بڑے فرزند یہاں رہتے ہیں۔ پاشا کا مکان لب سڑک ہے۔ ایک ملازم کے ذریعہ ان کے والد کا رقعہ بھجوا دیا گیا۔ ملازم نے ہم کو ملاقاتی کمرے میں بٹھایا۔ مکان وسیع اور آراستہ ہے۔

اعزالدین پاشا پانچ منٹ بعد پاشا اندر سے آئے۔ یہ ایک نوجوان خوش شرو آدمی ہیں کسی قدر انگریزی جانتے ہیں۔ بہت اخلاق کے ساتھ ملے۔ کہتے تھے میرے والد نے مجھ کو علٰحدہ خط بھی لکھا ہے کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ہم نے رخصت ہونا چاہا تو انہوں نے روکا اور کہا میری والدہ نے ہدایت کر دی ہے کہ آپ لوگوں کو کھانا کھلائے بغیر جانے نہ دوں جب

اصرار زیادہ ہوا تو ہم ٹھہر گئے۔ پاشا نے اپنا مکان دکھایا۔ عقب میں ایک ٹ
خانہ باغ ہے۔ وہاں کرسیاں پڑی تھیں۔ دیر تک وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے
رہے۔ باغ میں سے ایک قسم کا تازہ میوہ توڑ کر پاشا نے کھلایا۔ یہ میوہ لذیذ
ہوتا ہے۔ ایک بجے کے قریب میز پر کھانا ہوا۔ کئی طرح کے خوش ذائقہ کھانے
تھے کھانے سے فارغ ہو کر مکان کے بالائی حصہ میں بیٹھے۔ گراموفون بجتا
رہا۔ اور قہوہ کے کئی دور ہوئے اس اثنا میں پاشا کی بہن بھی آئیں۔ لباس بالکل
یوروپین تھا۔ تقریباً ۲۰۔۲۲ سال کی عمر ہوگی۔ ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔
انگریزی اپنے بھائی سے زیادہ جانتی ہیں۔ دیر تک ہندوستان کے متعلق گفتگو
رہی۔ آگرہ کے تاج محل کی انھوں نے بہت تعریف سنی ہے۔ اس کو دیکھنے کا
بہت اشتیاق ظاہر کرتی تھیں۔ سہ پہر میں پاشا ہم کو اپنی موٹر میں قریب کے
دو ایک مقامات پر لے گئے۔ قدرتی مناظر بہت دل آویز تھے۔ سرشام پاشا کی
موٹر میں اسٹیمر کے اسٹیشن تک گئے۔ وہاں سے اسٹیمر میں استنبول واپس آئے
دوسرے دن ملاقات بازدید کے لئے پاشا ہمارے ہوٹل آئے۔ ہم نے
بھی رواج کے مطابق قہوہ سے ضیافت کی۔ ہمارے پاس ہندوستان کے
کچھ امام ضامن تھے جن پر کارچوبی کام میں "خدا حافظ" اور دوسرے دعائیہ
جملے لکھے ہوئے تھے۔ ہم نے پاشا کو تین امام ضامن دیے۔ اُس وقت
ہمارے پاس اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں تھا۔ استنبول سے چلتے وقت
پاشا ہم کو خیرباد کہنے کی غرض سے ہوٹل آئے۔ ہم ہوٹل سے روانہ ہو چکے تھے
اس لئے وہ راستہ ہی میں ملے۔ ان کی بہن بھی ساتھ تھیں۔ پاشا اسٹیشن تک
آنا چاہتے تھے لیکن ہم نے اصرار کے ساتھ ان کو روک دیا۔ استنبول کی بنی
ہوئی مٹھائی کا ایک بکس انھوں نے ہم کو دیا۔ جس کو ہم نے شکریہ کے ساتھ

قبول کیا۔ پاشا کا نام اعزالدین ہے۔

پرنکی پو شہر کے قریب ایک جزیرہ ہے جس کو پرنکی پو کہتے ہیں۔ تعطیل کے دن لوگ کثرت سے تفریح کے واسطے وہاں جایا کرتے ہیں۔ ہم بھی جمعہ کے دن اسٹیمر کے ذریعہ وہاں گئے۔ درجۂ اول میں بھی مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جگہ ملنا مشکل ہوگیا۔ مدرسہ کے کمسن لڑکے اور لڑکیاں تعطیل کے دن معلم یا معلمہ کے ساتھ سیر کے لئے باہر جایا کرتے ہیں۔ اِن بچوں کی ایک بڑی جماعت اسٹیمر پر تھی۔ جس وقت یہ بچے قومی راگ گاتے ہیں، ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ تمام دن جزیرے میں ٹھہرے خوب صورت جنگل ہے۔ یہاں ایک کرایہ کی کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی خوب سیر کی۔

ایک ناگوار واقعہ اس سیر میں ایک ناگوار واقعہ پیش آیا۔ کشتی والا باتوں میں مصروف تھا۔ سامنے سے ایک اسٹیمر تیز رفتاری کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ ایسے موقع پر کشتی کو فاصلہ پر ہٹا لیا کرتے ہیں تاکہ اسٹیمر کی زد سے دور رہے۔ بات یہ ہے کہ اسٹیمر کی رفتار پانی کو کاٹتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے اسٹیمر کے قریب چاروں طرف پانی میں تلاطم پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی کشتی بالکل قریب آجائے تو اس کے اُلٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہمارا کشتی والا چونکہ غافل رہا۔ اسٹیمر بالکل قریب آگیا۔ اسٹیمر نے سیٹی کے ذریعہ آگاہ بھی کیا۔ مگر کشتی والا کسی قدر پریشان ہوگیا۔ غرض یہ کہ کشتی موجوں کی زد میں آگئی ڈوبنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ خداوند کریم کا فضل شامل حال تھا جو خود بخود سیدھی ہوگئی۔ کچھ فاصلہ پر دو عورتیں کشتی چلاتی جارہی تھیں۔ فوراً ہماری طرف اظہار ہمدردی کے لئے آئیں مگر ہماری زبان سے واقف نہ تھیں۔

عام حالات

لوگ عام طور پر دو زبانیں جانتے ہیں۔ ترکی اور فرانسیسی۔ انگریزی بولنے والے بہت کم ہیں۔ بازار میں بوقت ضرورت تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔ دو ایک دفعہ پیشاب خانہ تلاش کرنے کی ضرورت ہوئی انگریزی فارسی اور عربی الفاظ استعمال کئے مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ بالآخر ہوٹل واپس آنا پڑا۔ اکثر یہ بھی ہوا ٹیکسی والے سے کرایہ کے متعلق تکرار ہوئی۔ وہ اپنی کہتا تھا اور ہم اپنی کہتے تھے۔ راستہ چلنے والے حلقہ بنا کر تماشہ دیکھنے کھڑے ہوجاتے اِن میں انگریزی سے واقف کوئی نہ ہوتا۔ ایسے موقع پر اجنبی آدمی ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔ اول تو لوگ جمع ہو کر مسافر کو تماشہ بنا لیتے ہیں۔ دوسرے زبان کی اجنبیت پریشان کرتی ہے۔ ہر موقع پر اشاروں سے کام لینا مشکل ہوتا ہے غیر ملک میں ہنگامہ آرائی کر کے قانون کے جھمیلوں میں پھنسنا مسافر کے واسطے نامناسب ہے۔ ٹیکسی والا بھی ان باتوں کو سمجھتا تھا اور اپنی بات پر اڑا رہتا تھا۔ آخر میں جیت اسی کی رہتی تھی۔ جو کچھ وہ مانگتا دینا پڑتا۔ اگرچہ ٹیکسی میں میٹر لگا رہتا ہے لیکن اجنبی مسافر کو دیکھ کر یہ لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ منزل پر پہنچتے ہی میٹر کو ملا دیتے ہیں اور من مانے کرایہ مانگتے ہیں۔

استنبول کے دیسی رسٹوران نہ تو صاف ستھرے ہیں اور نہ ان میں کھانا اچھا ملتا ہے۔ البتہ پیرا میں اچھے اچھے یوروپین رسٹوران ہیں۔ ہم کو اپنے ہوٹل کا کھانا پسند نہ آیا۔ باہر کسی رسٹوران میں کھا لیا کرتے تھے۔ سارے شہر میں کوئی عورت نقاب پوش یا کوئی مرد ترکی ٹوپی پہنے ہوئے دکھائی نہیں دیا۔ لباس اور زبان یکساں ہونے کی وجہ سے عیسائی اور مسلمان میں امتیاز نہیں ہوسکتا۔

جمعہ کے دن عام طور پر تعطیل ہوتی ہے۔ کاروبار بند رہتا ہے عیسائیوں کو بھی اس کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اتوار کے دن عیسائیوں کو اختیار ہے چاہے کاروبار بند کریں۔ یا جاری رکھیں۔ موسم ایک حالت پر نہیں رہتا۔ دن بھر میں کئی رنگ بدلتا ہے۔ گرمی بھی ہوئی اور سردی بھی۔ لیکن پارہ کبھی (۸۰) ڈگری سے اونچا نہیں ہوتا۔ ترکی ایک پونڈ کا نوٹ تقریباً دو شلنگ کے برابر ہوتا ہے اور ایک پونڈ کے سو پیاسٹر ہوتے ہیں۔ زیادہ تر رواج نوٹوں کا ہے۔ سکہ کی مالیت کم ہونے کی وجہ سے نوٹ کثیر تعداد میں رکھنے پڑتے ہیں۔ دکانوں میں اشیاء کی قیمت پیاسٹر میں لکھی ہوتی ہے۔ فرض کرو کہ ایک چیز کی قیمت دو سو پیاسٹر ہوتی ہے۔ اجنبی آدمی کو خیال ہوتا ہے کہ بڑی مہنگی چیز ہے لیکن حساب لگا کر دیکھو تو تین روپیہ کے قریب ہوئے۔

بے نقاب عورتیں

پردہ کی قید سے آزاد ہونے کے بعد ترک عورتیں اکتساب معیشت میں بھی حصہ لینے لگیں چنانچہ ڈاکخانہ اور ریل کے دفاتر میں اکثر مسلمان عورتیں کام کرتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ اقتصادی پہلو سے اگر دیکھو تو عورتوں کا بے نقاب ہوجانا ملک کے واسطے بڑی حد تک مفید ثابت ہوا لیکن اندیشہ یہ ہے کہ روزانہ میل جول کی وجہ سے یوروپین طرز معاشرت کی قابل اعتراض باتیں یہاں کی سوسائٹی میں داخل نہ ہوجائیں۔ اگر یہ لوگ حیا سوزی کی زہریلی ہوا سے اپنے کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ثابت ہوئے تو بیشک یہ جدید طرز معاشرت مبارکباد کے لائق ہے لیکن یورپ اور ہندوستان کے بعض اہل الرائے کہتے ہیں کہ ترکوں نے اپنے قومی امتیاز کو مٹا دیا ہے۔ ٹوپی کے ساتھ ساتھ عربی رسم الخط بھی اٹھا دیا گیا۔ اب جدھر دیکھو جدید رومن رسم الخط دکھائی دیگا

خدا کرے یہ سب باتیں ملک کے حق میں مفید ثابت ہوں اور یہ مجاہدین اسلام صراط المستقیم پر قائم رہیں۔ اتنا تو ہم بھی ضرور کہیں گے کہ قدیم اسلامی شان و شوکت کے آثار یہاں مطلق پائے نہیں جاتے یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ ہم کسی اسلامی سلطنت میں پھر رہے ہیں۔ ترکوں کی جدوجہد اگر اصلاح ظاہر تک محدود رہی تو حقیقی ترقی و بہبودی معلوم۔ مذہب کو چھوڑ کر مادی ترقی بھی گمراہی کی دلیل ہے۔

گل کھلائے گی نئے گلشن میں اب بادِ بہار
رنگ ہوگا جن میں لیکن بو نہ ہوگی زینہار

استنبول سے روانگی

دوسری جون کو شام کے چھ بجے کے قریب حیدر پاشا ریلوے اسٹیشن سے بداپسٹ روانہ ہوئے۔ امریکن اکسپرس کمپنی کے ذریعہ ریل کے ٹکٹ خریدے۔ ہنگری اور بلقان کا (جس کو اب یوگوسلیویا کہتے ہیں) کچھ سکہ بھی لیا۔ ہر ملک کا سکہ پہلے ہی سے منوالینا چاہیئے۔ ورنہ بڑی تکلیف گذرتی۔ ہے کک کمپنی اور امریکن اکسپرس کی معرفت بلامعاوضہ یہ کام ہو جاتا ہے۔ بداپسٹ کے ہوٹل کا پتہ بھی امریکن اکسپرس سے معلوم کرلیا۔ چونکہ ریل میں دو دن اور دو راتیں گذارنی تھیں اس لئے رات کے آرام کا بندوبست ضروری تھا چنانچہ بداپسٹ تک "ویگن لی" کی گاڑی میں سفر اختیار کیا۔ راست برلن تک ٹکٹ لینے میں سہولت معلوم ہوئی۔ فی شخص (عہ) پونڈ دس شلنگ کرایہ ہوا۔ ویگن لی ایک کمپنی ہے جس کا الحاق حال میں کک کمپنی کے ساتھ ہوگیا۔ کمپنی مذکور اس قسم کی گاڑیاں تیار کرتی ہے جن میں سونے کا بندوبست ہوتا ہے۔ ایک گاڑی میں تقریباً تیس مسافر سفر کرسکتے ہیں دو برتھ کا

ایک کمپارٹمنٹ ہوتا ہے۔ اس میں منہ ہاتھ دھونے کے لئے سیلاپچی کانچ کی صراحی۔ تولیہ۔ صابن۔ غرض کہ آسایش کا سب سامان موجود رہتا ہے۔ مخملی بانات کے گدے اور نفیس صاف ستھری گاڑیاں ہیں۔ ایک ملازم خدمت کے واسطے ہر وقت گاڑی میں متعین ہے۔ سر شام کمپارٹمنٹ میں بستر کر دیتا ہے اور صبح کو لپیٹ کر نیچے کی طرف رکھ دیتا ہے۔ یہ ریل بہت آہستہ چلتی ہے۔

بلگیریا استنبول سے روانہ ہونے کے بعد علی الصباح بلغاریہ کی سرحد میں داخل ہوئے۔ سابق میں اس حصۂ ملک کو بلقان کہتے تھے لیکن جنگ عظیم کے ختم پر تمام صوبہ کی کایا پلٹ ہو گئی۔ بلغاریہ۔ سرویا۔ مانٹی نیگرو آسٹریا کا کچھ حصہ شامل کر کے ایک علحدہ صوبہ قائم ہوا۔ جس کو یوگوسلیویا کہتے ہیں۔ اس جدید صوبہ کا دارالسلطنت بلگریڈ ہے۔ بلغاریہ کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد ایک اسٹیشن پر مسافروں کا سامان دیکھا گیا سختی کی حالت یہ ہے کہ اسٹیشن پر ریل کے پہنچتے ہی وردی پہنے ہوئے سپاہی قطار باندھ کر ٹرین کے قریب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں چائے پینے کی غرض سے پلیٹ فارم پر جانا چاہتا تھا مگر ان سپاہیوں نے روک دیا۔ ہمارے ورجہ کا ملازم انگریزی جانتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سامان کا معائنہ نہ ہو جائے پلیٹ فارم پر جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ ہم نے ہر چند سمجھایا کہ اول تو ہم اس ملک میں اترنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ کہ چائے پی کر فوراً واپس آجائیں گے مگر شنوائی نہ ہوئی۔

کروڑگیری والوں کی سختی کوئی چیز محصول طلب ہمارے پاس نہ تھی۔ یہ عجیب زبردستی ہے۔ کہ

ریل میں بھی اسباب دیکھتے ہیں۔ جو لوگ علاقہ انگریزی سے ریاست نظام میں آتے ہیں ان کو اکثر غل مچاتے سُنا ہے کہ سامان کھول کر دیکھنا نہایت بدنما طریقہ ہے اس سے مسافروں کو پریشانی ہوتی ہے اُن حضرات کو غالباً یہ معلوم نہیں ہے کہ یورپ کے اکثر ممالک میں حیدرآباد سے زیادہ سختی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ تو نہیں ہوتا کہ ریل میں اسباب کھلوا کر مسافروں کو تکلیف دی جائے۔ اور پلیٹ فارم پر پہرہ کھڑا کر کے مسافروں کی آزادی کو سلب کر لیا جائے۔ الغرض جب اس مصیبت سے نجات ملی تو ہم اسٹیشن پر گئے ریل چھوٹنے کے قریب تھی اس لئے جلدی جلدی صرف ایک پیالی چائے پی کر واپس آ گئے۔ خالی پیٹ تکلیف دیتا رہا۔ شکر ہے کہ حیدرآباد کا قانون کرڈگیری مسافروں کو بھوکا نہیں رکھتا۔ کھانے کی گاڑی جو استنبول سے لگی تھی وہ رات کو کسی اسٹیشن پر علٰحدہ ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ آگے چل کر صوفیا پر دوسری گاڑی لگے گی۔

ایک نقصان

یہ واقعہ بھی لائق ذکر ہے کہ رات کو کھانا ریل ہی میں کھایا تھا۔ بہت دیر بعد ڈائننگ کار کا آدمی درجہ میں بل لے کر آیا۔ ہمارے پاس بل ادا کرنے کے لائق سکے نہیں تھے۔ اس لئے ایک بڑی رقم کا نوٹ اس کو دیدیا۔ زبان کی اجنبیت کی وجہ سے بات چیت نہ ہو سکی۔ لیکن اشارہ سے اس کو سمجھا دیا کہ بقیہ رقم واپس کر دینا۔ اس کی خبر نہ تھی کہ رات ہی کو یہ گاڑی علٰحدہ ہو جائے گی۔ اس خیال سے کہ صبح کو حساب ہو جائے گا ہم نے تقاضا بھی نہیں کیا۔ اور بےفکری کے ساتھ سو گئے۔ صبح کو چائے کے وقت یہ سُنا کہ گاڑی رات ہی کو الگ ہو گئی۔ ہم نے گاڑی کے ملازم سے یہ قصہ بیان کیا تو اس نے کہا اگر رات ہی کو مجھ سے کہتے تو میں رقم

دریا کا کنارہ بلگریڈ

واپس لا دیتا اب مجبوری ہے۔ یا تو وہ آدمی یہ سمجھا کہ تم نے اس کو انعام دیا ہے یا اس نے جان بوجھ کر بے ایمانی کی۔ اس وقت ہم کو خیال ہوا کہ ہم یورپ میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ یہ حصۂ ملک برائے نام یورپ ہے۔

صوفیا اور اس کے باشندے

ریل سے قدرتی مناظر اچھے دیکھنے میں آئے۔ دونوں جانب جنگل خود رو پھولوں کے تختوں سے مالامال تھا۔ بلا مبالغہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے چمن لگایا ہے۔ لیکن اصل میں یہ کاریگری کارکنان قدرت کی تھی۔ صوفیا ایک چھوٹا سا مقام ہے کوئی خاص چیز دیکھنے کے لائق یہاں نہیں ہے۔ اس لئے اس مقام پر نہیں اُترے۔ اسٹیشن سے شہر دکھائی دیتا ہے۔ یہ بلغاریہ کا دارالسلطنت ہے۔ بلگر لوگ دراصل ایشیائی ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں بلقان میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ اُس وقت سے جنگِ عظیم تک اِس ملک میں کبھی امن نہ رہا۔ ہمیشہ جنگ و جدل میں اُن کا وقت گذرا۔ یہ لوگ مضبوط اور جفاکش ہیں۔ ان کا اصلی پیشہ زراعت ہے۔ جنگ عظیم میں بلغاریہ نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ نتیجہ میں نقصان اٹھانا پڑا۔ نہ صرف قومی قرضہ کا بار اُن پر ہے بلکہ ڈھائی ہزار مربع میل سے کچھ زائد زرخیز حصۂ زمین ہاتھ سے جاتا رہا۔ پانچ سو برس تک ترکوں کے زیر حکومت رہنے کے بعد انہوں نے آزادی حاصل کی تھی۔ لیکن جرمنی کو امداد دینے کی وجہ سے اِن پر تباہی آئی۔

لباس

صوفیا میں مسلمانوں کی آبادی تین ہزار کے قریب ہے یہ لوگ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ عورتیں نقاب پوش ہیں

ترکی کے جدید طرز تمدن کا اثر ان لوگوں پر نہیں ہوا یہاں کے باشندوں کا لباس نہ تو خالص یوروپین ہے اور نہ مشرقی۔ شہر کے رہنے والے تعلیم یافتہ لوگ بالکل یوروپین لباس پہنتے ہیں۔ مگر زراعت پیشہ اور غیر تعلیم یافتہ اپنے اصل لباس پر قائم ہیں۔ ایک قسم کی گول اور چپٹی ٹوپی ہوتی ہے جس کو استراخانی کہتے ہیں۔ اس کا بہت رواج ہے۔ نیلے رنگ کے موٹے کپڑے کے قمیص۔ اس پر خوبصورت کشیدہ کے کام کی صدری۔ سفید یا نیلے رنگ کا پیجامہ۔ جو گھٹنے کے نیچے سے تنگ اور اوپر کی جانب ڈھیلا ہوتا ہے۔ کمر کے اطراف ایک سرخ رنگ کا پٹکہ۔ یہ ان کا معمولی لباس ہے۔ جوتے کچھ عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔ دور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں پر گودڑ لپیٹ لیا ہے۔ عورتیں شوخ اور بھڑک دار لباس پہنتی ہیں سیاہ اور لمبے بالوں پر خوش رنگ کساوا سفید لٹھے کا گون۔ (لہنگا) جس پر کشیدے کا کام ہوتا ہے بہت مقبول ہے۔ اکثر سفید گون پر ایک دوسرا رنگین گون گل بوٹے کا خوبصورتی کے لئے پہنا جاتا ہے رنگ برنگ کی صدریاں کشیدہ کے کام کی بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کم سن لڑکیوں کی متعدد چوٹیاں ہوتی ہیں جن کو سونے چاندی کے سکوں یا کوڑیوں سے آراستہ و پیراستہ رکھتے ہیں۔ ان عورتوں کو دیکھ کر مجھے ہندوستان کی بنجارنیں یاد آئیں۔ تقریباً اسی نمونہ کا لباس ہوتا ہے۔ تعلیم بہت کم ہے۔ سنا ہے کہ گورنمنٹ کے خزانہ میں اس قدر روپیہ نہیں ہے کہ مدارس کا بار زیادہ اٹھا سکے۔

اسٹیشنوں پر ایک قسم کا میوہ بکثرت دیکھنے میں آیا یہ بیر کے برابر سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں ان کو رکھ کر اوپر سے سرخ

رنگ کا باریک کپڑا ڈھانک دیتے ہیں یہ وہی میوہ تھا جو استنبول میں پاشا کے مکان پر ہم کھا چکے تھے۔ علی الصباح ایک عورت یہ میوہ بیچتی ہوئی آئی۔ پوری ٹوکری خریدنا ضرورت سے زائد تھا اس لئے نصف ٹوکری خریدنا چاہتے تھے مگر بیچنے والی راضی نہ ہوئی۔

ایک ترک مسافر

پہلو کے درجے میں ایک ترک مسافر مع اپنی بیوی کے تھے یہ بھی نصف ٹوکری خریدنا چاہتے تھے ہم نے پوری ٹوکری خرید لی۔ ترک مسافر نصف ٹوکری کی قیمت دینا چاہتے تھے لیکن ہم نے لینے سے انکار کردیا۔ اور نصف میوہ ان کو دیدیا۔ اس کا بدلہ اتارنے کی ان کو بڑی گھبراہٹ تھی فوراً اپنے درجے میں سے ایک بکس استنبول کی مٹھائی کا لائے۔ یہ اسی قسم کی مٹھائی تھی جو پاشا نے ہمارے ساتھ استنبول سے کردی تھی۔ ہم نے ایک ایک ڈلی اس میں سے لے لی۔ یہ ترک مسافر صوفیا پر اتر گئے۔ بین الاقوامی زبان یعنی اشاروں کے ذریعہ جس قدر بات چیت ہوسکی اس سے پتہ چلا کہ کپڑے کی تجارت کرتے ہیں۔ بیوی یورپین لباس میں اور بے نقاب تھیں صوفیا پر تین چار عورتیں ان کو لینے کے واسطے آئی تھیں۔ وہ بھی بے نقاب تھیں معلوم ہوا کہ یہاں کی رہنے والی نہیں ہیں۔ ورنہ نقاب پوش ہوتیں۔

بلگریڈ کا اسٹیشن

۱۴ رجون کو صبح کے وقت بلگریڈ پہنچے۔ یہاں ایک دوسری ریل تیار ہوگی اور ہمارا درجہ اس ریل میں لگ جائے گا۔ یہ معلوم تھا کہ تقریباً چھ گھنٹے کا وقفہ یہاں ملیگا۔ شہر بالکل ملحق ہے اس لئے سیر کرنے کا کافی موقع تھا۔ میں کسی قدر سویرے اٹھ کر ناشتہ کے لئے تیار ہوگیا۔ ریل پلیٹ فارم پر ٹھہری تو ایک

خیال سے آترا کہ رفرشمنٹ روم میں جا کر ناشتہ کروں سلیم بیگ اور
رفیق بیگ ہنوز ریل ہی میں تھے۔ پلیٹ فارم کے ایک کونہ میں ٹرین سے
کسی قدر دور رفرشمنٹ روم تھا اس کے سامنے وراںڈہ میں میز کرسیاں لگی
ہوئی تھیں مگر وہ حصہ لکڑی سے محصور تھا۔ دروازے پر ٹکٹ کلکٹر کھڑا تھا
اندر جاتے وقت اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وراںڈہ میں نشست خالی نہ
تھی اس لئے میں کمرے میں چلا گیا۔ ناشتہ سے فارغ ہونے تک پندرہ
بیس منٹ لگے اس کے بعد میں پلیٹ فارم پر واپس ہونے کے لئے
جب نکلا تو ٹکٹ کلکٹر نے روک دیا لیکن بڑی وجہ پریشانی کی یہ پیدا

ایک پریشانی

ہو گئی کہ پلیٹ فارم پر سے ہماری ریل غائب
تھی۔ ٹکٹ کلکٹر انگریزی سے ناواقف تھا میں
نے باہر جانے کے لیے اصرار کیا تو اس نے دروازے میں قفل ڈال دیا
میں نے بین الاقوامی زبان میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ریل کہاں
چلی گئی اور ہمارا کمپارٹمنٹ کیا ہوا۔ اس نے زبان سے تو بہت کچھ کہا۔ مگر
سمجھنے والا کون تھا۔ خوف ہوا کہ ریل چھوٹ نہ گئی ہو اور جو اطلاع دیر تک
ٹھہرنے کی ملی تھی وہ غلط ہو۔ ٹکٹ ریل ہی میں تھا اور جیب میں نہ تو روپیہ
نہ پاسپورٹ۔ رفرشمنٹ روم میں انگریزی داں آدمی کو تلاش کیا مگر کوئی نہ
ملا۔ ٹکٹ کلکٹر اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ اس پریشانی میں ایک اطالوی مسافر
دکھائی دیا یہ ہماری گاڑی میں استنبول سے آیا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی
جانتا تھا۔ اس سے میں نے کہا کہ کچھ مدد کرو اس نے ٹکٹ کلکٹر سے خدا
معلوم کیا باتیں کیں لیکن مجھ سے کہا تم کو اندر ہی ٹھہرنا ہوگا کیونکہ یہاں
اجنبی مسافروں پر نگرانی سخت ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا یہ تو بتاؤ کہ ریل

کدھر غائب ہوگئی اس نے کہا ریل تو چھوٹ گئی اب تم کو کسی دوسری ریل سے جانا پڑے گا۔ یہ سن کر ایک سناٹا سا آگیا۔ لیکن مجھ کو یقین نہ آیا ممکن ہے کہ اس نے مذاق کیا ہو یا اس کو خود معلوم نہ ہو۔ غرض یہ کہ مختلف قسم کے خیالات دل میں آتے تھے اور پریشانی بڑھتی جاتی تھی کچھ دیر بعد خدا معلوم ٹکٹ کلکٹر کے دل میں کیا خیال آیا۔ کہ اس نے دروازہ کھول دیا اسٹیشن پر متعدد پلیٹ فارم تھے۔ ایک ریل کھڑی دکھائی دی دوڑ کر اس طرف گیا مگر یہ معلوم کر کے مایوسی ہوئی کہ یہ نہ تو ہماری ریل ہے اور نہ اس میں ہمارا درجہ ہے۔ کئی آدمیوں کے ساتھ اشارہ بازی رہی۔ لیکن تھوڑی دیر کی تفریح کے سوا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ بالآخر مایوس ہو کر رفرشمنٹ روم کی طرف واپس آگیا۔

یہاں کی زبان بھی خاص ہے نہ تو جرمن ہے اور نہ فرانسیسی۔ رسم الخط بھی کچھ عجیب ہے۔ حروف پڑھنے نہیں جانتے مجھے بیت الخلا کی تلاش تھی۔ سارے اسٹیشن کا چکر لگا ڈالا کمرے تو بہت سے تھے اور ہر کمرے پر بورڈ لگا ہوا لیکن یہ پتہ نہ چلا کہ بیت الخلا کون سا ہے۔ اتفاق سے اطالوی مسافر پھر ملا۔ اس سے دریافت کیا تو اس نے اشارہ سے سامنے ایک کمرے کو بتایا جس پر عجیب نمونے کے حروف لکھے ہوئے تھے کمرے پر ایک سن رسیدہ عورت بطور نگراں کار کھڑی تھی۔ عورت کو دیکھ کر خیال ہوا کہ شاید یہ زنانہ بیت الخلا ہو۔ اندر جانے میں پس و پیش ہوا دوبارہ اطالوی مسافر سے جا کر پوچھا اس نے کہا عورت مرد کا خیال نہ کرو بلا تکلف اندر چلے جاؤ۔ باوجود اس کے میں کسی قدر رکتا ہوا گیا خادمہ نے کچھ پوچھا مگر میں نے صرف گردن ہلا دی۔ اس نے اندر جانے کے لئے اشارہ کیا کمرے میں داخل ہونے پر معلوم ہوا کہ اندر کی جانب دو کمرے ہیں۔ ایک مردانہ دوسرا زنانہ۔

داخلہ کے کمرے میں ایک طرف منہ ہاتھ دھونے کا سامان لگا ہوا تھا سفید اور اُجلے تولیے کنگھا برش۔ اور کچھ خوشبو کی چیزیں سلیقہ کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ حوائج سے فارغ ہونے کے بعد منہ ہاتھ دھویا۔ خادمہ نے ٹوپی اور کپڑوں پر برش کر دیا۔ کچھ مقامی سکے جیب میں پڑے تھے اس کو محض اندازہ سے چند سکے دیدیے پیسے لے کر اس نے کچھ کہا جس کا مطلب یہ معلوم ہوتا تھا کہ بہت کم دیا گیا۔ کچھ پیسے اور دیے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہوا کہ کتنے دیے۔ بعد کو تحقیق ہوا کہ اصل سکہ یہاں کا دینار ہے جو تقریباً آٹھ آنے کے برابر ہوتا ہے۔ ایک دینار کے سو پیسے ہوتے ہیں۔ ان کو پراس کہتے ہیں میں نے خادمہ کو پہلی دفعہ چار پانچ پراس دیے جو شاید دو پیسے کے برابر ہوتے ہوں گے۔ جب ہی اس نے عذر کیا کیونکہ یورپ میں دو پیسے کیا چیز ہوتے ہیں اس قصہ کو ختم کر کے کمرہ سے باہر نکلا تو دیکھا کہ دونوں بھائی اسٹیشن پر میری تلاش میں پریشان پھر رہے ہیں۔ کیا خوب یا تو کچھ دیر پہلے میں ان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ یا اب وہی فکر ان کو لاحق ہوئی خدا کا شکر ہے کہ سب کی پریشانی دور ہوئی۔ معلوم یہ ہوا کہ ریل سے علیحدہ کرنے کے بعد ہمارے درجہ کو اسٹیشن سے فاصلہ پر چھوڑ دیا تھا لاحول ولاقوۃ۔ اتنی سی بات معلوم کرنا کس قدر مشکل ہو گیا خدا کسی اجنبی آدمی کو ایسے ملک میں جہاں کی زبان سے وہ ناواقف ہو کبھی بیمار نہ ڈالے مرض کچھ ہو گا اور دوا کچھ ملے گی۔ زندہ واپس آنا مشکل ہو جائے گا۔ قدرت کی کارسازی کو دیکھو کہ ایک ہی نوع انسان کو کتنی مختلف زبانیں بخشی ہیں اس چھوٹے سے دماغ کی وسعت کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک آدمی پچاسوں زبانیں بول سکتا ہے اور ہر زبان کے الفاظ کو ان کے مفہوم کے ساتھ برسوں

اپنے ذہن میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔ سیاح کے واسطے بہت ضروری ہے کہ جس ملک کی سیر کے لئے جائے وہاں کی زبان سے بھی آشنا ہو ورنہ سیاحت چنداں مفید نہ ہوگی۔ کیونکہ اصل چیز تبادلۂ خیالات ہے۔ زبان ہی کے ذریعہ انسان ایک دوسرے سے شیر و شکر ہو سکتا ہے۔ لطف تو اسی میں ہے کہ کچھ اپنی کہے اور کچھ دوسرے کی سنے۔ اور جب بات ہی نہ کروگے تو ایک دوسرے کے حالات سے کیا خاک مطلع ہو سکتے ہو۔ جیسے کورے گئے تھے ویسے ہی کورے واپس آؤگے۔ بقول ارشدی سمرقندی۔ ؎

کسے کز و ہنر و عیب باز خواہی جست
بہانساز و بگفتارشں اندر آر نخست
سفال را ز طپانچہ زدن بیا نگ آرند
بیانگ گردد پدید اشکستگی ز درست

خدا بھلا کرے کک کمپنی اور امریکن اکسپرس کا کہ ان کمپنیوں کی معرفت غیر ممالک کی سیر بخوبی ہو جاتی ہے۔

ریل کا خادم

رائے قرار پائی کہ شہر کی سیر کے واسطے چلنا چاہئے لیکن یہ بھی خیال ہوا کہ کسی رہبر کو ساتھ لینا مناسب ہوگا۔ خادم چونکہ زبان سے واقف تھا اس لئے اس سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا تھا۔ دریافت کرنے پر اس نے کہا میں لباس تبدیل کر کے ابھی آتا ہوں۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں ایک فیشن ایبل سوٹ پہنکر آ گیا۔ خاصا جنٹلمین معلوم ہوتا تھا۔ یورپ کی تین چار زبانوں میں گفتگو کر سکتا ہے۔ حضرت کی سوانحعمری بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اصلی وطن روس ہے لیکن پیدا ہوئے جرمن میں۔ باپ انگریز مگر ماں روسی۔ کمپنی نے

جو تنخواہ ملتی ہے وہ زیادہ نہیں۔ لیکن مسافروں سے انعام و اکرام ملتا رہتا ہے
اس طرح ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے قریب ملجایا کرتے ہیں۔ ابھی شادی نہیں ہوئی
کہتا تھا اس قلیل آمدنی میں شادی کر کے بیوی کا خرچ کہاں سے اٹھاؤں
ہمارے ہاں ڈیڑھ سو روپیے میں بیوی تو ایک طرف کنبہ کی پرورش لوگ
کرتے ہیں اور شادی تو اکثر بے روزگاری کے عالم میں ہو جاتی ہے اگر پوچھو
کہ بال بچوں کی گذر کیسے ہو گی تو جواب یہی ملتا ہے کہ ؎

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کار آزارِ ما

بلگریڈ بہت دیر تک شہر میں پھرتے رہے اب بلگریڈ از سرتا پا نیا
بن گیا ہے قدیم عمارتوں کو توڑ کر چوڑی چوڑی پختہ سڑکیں
نکالی گئی ہیں۔ چوراہوں پر بڑے بڑے حوض اور ان میں خوشنما فوارے
لگے ہوئے ہیں۔ دونوں طرف خوبصورت اور عالیشان عمارتیں تیار
ہو گئی ہیں۔ قدیم حصہ برائے نام کہیں کہیں باقی ہے جس کو جدید شہر سے
کوئی مناسبت نہیں۔ آرائش کا کام ہنوز بہت تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے
یہ شہر دریائے ڈینوب اور ساوے کے سنگم پر واقع ہے۔ لب دریا ایک
قلعہ ایک سو بیس فیٹ کی بلندی پر واقع ہے اس قلعہ میں قارا مصطفےٰ کی
قبر ہے۔ یہ ایک مشہور ترکی وزیر اعظم تھا۔ ایک عرصہ تک روسیوں کے مقابلہ میں
معرکہ آرائی کرتا رہا۔ اس کے بعد جب ہنگری نے آسٹریا کے خلاف جنگ کا
اعلان کیا۔ تو مصطفےٰ قرہ نے ہنگری کا ساتھ دیا۔ ویانا کا محاصرہ کیا گیا۔ لیکن
بدقسمتی سے ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس شکست کی پاداش میں سلطان کے
حکم سے مصطفےٰ قرہ کو بلگریڈ میں قتل کیا گیا اور چاندی کی کشتی میں اس کا سر

سلطان کے سامنے پیش ہوا۔ ۱۵۲۱ء میں سلطان سلیمان نے اس شہر کو فتح کیا۔ اور ڈیڑھ سو برس سے کچھ اوپر ترکوں کی حکومت قائم رہی۔ اس کے بعد کچھ دنوں آسٹریا کا قبضہ رہا۔ ۱۶۹۰ء میں دوبارہ ترکوں نے آسٹریا سے چھین لیا۔ مگر یہ حکومت عارضی تھی۔ کیونکہ پچیس برس بعد ہی آسٹریا نے حملہ دوبارہ کیا۔ اور ترک مدافعت نہ کر سکے۔ بالآخر قبضہ چھوڑنا پڑا۔ ۱۷۳۹ء میں ایک اخیر انقلاب ترکوں کے حق میں ہوا۔ یہ پھر شہر پر قابض ہوئے مگر ایک سو بیس برس کے قریب حکومت کرنے کے بعد ہمیشہ کے واسطے اس ملک سے دست بردار ہو جانا پڑا۔ ترکوں کے تاریخی کارنامے بھی خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ بلگریڈ کے قلعہ کو دیکھ کر دل پر ایک خاص اثر ہوا کیسی جدوجہد اور جان توڑ کوشش کے بعد یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی۔ لیکن من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال۔

جاگ جاگ کر آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب
اس گلستاں سے نہ اٹھی پھر صدائے عندلیب

لباس قدیم عمارتوں میں مسجد۔ گرجا۔ اور شاہی محل ہیں۔ دریا کے کنارے پر ایک خوبصورت چمن ہے یہاں لوگ تفریح کی خاطر جمع ہوتے ہیں لباس تقریباً وہی ہے۔ جو صوفیا میں دیکھا گیا۔ عورت، مرد زرق برق اور شوخ رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ البتہ شہر کے تعلیم یافتہ طبقے میں یورپین لباس مروج ہے۔ مسلمان عورتیں زیادہ تر پنجابی وضع کا پیجامہ پہنتی ہیں۔ نئی روشنی والی عورتوں نے اگرچہ اونچا فراک اختیار کر لیا ہے لیکن نقاب کو ابھی تک نہیں چھوڑا۔ یورپین لباس پر نقاب ایک بے جوڑ سی چیز معلوم ہوتی ہے۔

بداپسٹ کا ہوٹل

چوتھی جون کو رات کے ۸ بجے کے قریب بداپسٹ پہنچے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد رہبروں اور ہوٹل کے نمائندوں سے نجات ملی۔ اسٹیشن پر ان لوگوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ اسٹیشن کے پاس امپریل ہوٹل میں قیام کیا اس کا پتہ استنبول میں امریکن اکسپرس کے ذریعہ ملا تھا۔ اچھا بڑا ہوٹل ہے۔ کھانے کا انتظام بھی معقول ہے لیکن کرایہ وغیرہ کے متعلق آتے ہی تصفیہ کر لینا چاہئے۔ اگر دونوں وقت کا کھانا پابندی کے ساتھ ہوٹل میں کھاؤ تو کرایہ کم ہوگا۔ باہر کھاؤ تو زیادہ ہوگا۔ ہم نے لاعلمی کی وجہ سے اس کا تصفیہ نہیں کیا تھا۔ آخر میں کرایہ زائد دینا پڑا۔ ہوٹل کا منیجر آدمی خلیق اور انگریزی داں ہے۔ ملازمین انگریزی سے ناواقف ہیں۔ جرمن بولتے ہیں۔ چیمبر میڈ یعنی خادمہ کو مطلب سمجھانے میں اشاروں سے کام لینا پڑا۔ دو ایک دفعہ تو یوں کام چلایا کہ کاغذ پر انگریزی میں مطلب لکھ دیا۔ خادمہ نیچے منیجر کے پاس لے گئی۔ اور اس نے جواب لکھ دیا

ایک روز مجھ کو سوئی تاگے کی ضرورت ہوئی۔ خادمہ کو اشاروں سے سمجھانے کے بعد میں نے انگریزی میں لفظ "نیڈل" کہا اس نے پُرجوش آواز میں جواب دیا۔ "اوہ !! ناڈل" جرمنی زبان میں سوئی کو ناڈل کہتے ہیں۔

کبھی کبھی بات چیت والی کتاب بھی کام دیتی تھی۔ کمروں کے لحاظ سے کرایہ کم زیادہ ہے فی شخص ۸ شلنگ یومیہ دینے پڑے۔

بداپسٹ

یہ شہر دریائے ڈینیوب کے دونوں جانب واقع ہے۔ دریا کے ایک جانب قدیم حصہ ہے جس کو

بدا کہتے ہیں۔ دوسری جانب کی آبادی نسبتاً جدید ہے اس کو پیسٹ کہتے ہیں اور پورے شہر کو بداپسٹ۔ یہ صوبہ ہنگری کا دارالسلطنت ہے۔ آبادی نو لاکھ بتیس ہزار سے اوپر ہے۔ بحیثیت مجموعی بارونق اور خوبصورت شہر ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس تک ترکوں نے یہاں حکومت کی لیکن اس زمانے میں یہاں کے باشندے بیرونی حکومت سے آزاد ہونے کے لئے جان توڑ کوشش کرتے رہے بالآخر ۱۶۸۶ء میں ترکوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ شہر کا جو حصہ پیسٹ کے نام سے موسوم ہے وہ نہ صرف کاروبار کے لحاظ سے ممتاز ہے بلکہ عالیشان عمارات اور بڑے بڑے بازار بھی یہیں ہیں۔ ان بازاروں کے نام کچھ ایسے سخت ہیں کہ اردو میں اُن کا تلفظ ادا ہونا بہت مشکل ہے۔ دو بازار جو سب سے خوبصورت معلوم ہوئے اندریسی اور کراپسی ہیں۔ اندریسی میں ناچ گھر کی عمارت دیکھنے کے لائق ہے۔ یہ اس ملک کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ خیال کیجاتی ہے۔ نامور مصور کی کاریگری اُن تصاویر سے ثابت ہوتی ہے جو مکان کی چھت اور دیواروں پر منقش ہیں۔ قریب ہی ایک تصویر خانہ ہے جو ۱۹۰۶ء میں قائم ہوا اس میں اعلیٰ درجہ کی تصاویر کا بڑا ذخیرہ ہے۔ زیادہ تر رونق دریا کے کنارے پر رہتی ہے۔ شام کے وقت چہل قدمی کے واسطے یہ مقام بہت دلکش ہے یہاں بڑا مجمع رہتا ہے اس نواح میں ایک عمارت ہے جس میں مشرقی طرز تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ نیچے کی منزل میں سفر کے متعلق معلومات بہم پہنچانے والی مختلف کمپنیوں کے دفاتر ہیں۔ اوپر کی منزل بطور ناچ گھر استعمال کی جاتی ہے اس کے متصل دریا کا کنارہ فرانسس جوزف کوئے کہلاتا ہے۔ اس کو کارسو بھی کہتے ہیں۔ یہ سڑک تقریباً ڈیڑھ میل لمبی ہے۔ سڑک کے برابر عالیشان عمارتیں اور درخت ہیں۔ مخالف سمت پر یعنے دریا کے اُس جانب قلعہ ہے۔ یہ منظر

سڑک سے بہت دلکش ہے ایک جانب پارلیمنٹ کی عالیشان عمارت ہے
کہتے ہیں کہ لندن میں جو پارلیمنٹ کی عمارت ہے اِس کے بعد خوبصورتی اور وسعت
میں اس عمارت کا جواب یورپ میں نہیں ملتا۔ وسط میں ایک عالیشان گنبد
بنا ہوا ہے۔ پارلیمنٹ کے متصل عدالتی مکانات دیکھنے کے لائق ہیں۔ یہاں کا
سب سے بڑا گرجا سینٹ اسٹیفن المزہبی بازار سے قریب ہے۔ اطالوی طرز کی
خوبصورت عمارت ہے اندرونی آرایش اور پچی کاری دیکھ کر روں خوش ہوتا ہے۔
شہر میں ایک اور مقام تفریح کا دارالسی لنیحیٹ کھیل کود کے واسطے مخصوص ہے
اِس کا رقبہ (۲۴۰) ایکڑ کے قریب بیان کیا جاتا ہے۔ پھولوں کی افراط اور
سبزہ سے یہ جگہ گلدستہ بنی ہوئی ہے۔ یہاں دل بہلانے کے بہت کچھ سامان
ہیں چڑیا خانہ اور عجائب گھر بھی قریب ہی میں ہے۔ سارے شہر میں جا بجا خوبصورت
مجسمے عمارتوں کی زیب و زینت کی خاطر اور اکابر قوم کی یادگاریں بنے
ہوئے ہیں۔

آثار قدیمہ

سیر کرانے کے لئے متعدد بڑی بڑی موٹریں مقررہ مقامات
پر کھڑی رہتی ہیں۔ ہر موٹر کے ساتھ ایک رہبر ہوتا
ہے جو یورپ کی مختلف زبانیں جانتا ہے۔ بہتر طریقہ سیر کرنے کا ان موٹروں کے
ذریعہ ہے۔ کک کمپنی یا امریکن اکسپریس کے معرفت بھی ان کے ٹکٹ مل جاتے
ہیں ہم نے یہاں کی سیر اسی طریقہ پر کی تھی۔ سیر کے ختم پر رہبر کو اگر کچھ دینا چاہو
وہ شکریہ کے ساتھ قبول کرلے گا۔ خود ہرگز مطالبہ نہ کرے گا۔ شہر کا جو حصہ بُڈا کہلاتا
ہے اس میں ایک قدیم قلعہ پہاڑی پر ہے۔ قدیم شاہی محل بھی یہیں ہے پہاڑ
کی چوٹی پر سے دریا اور شہر کا منظر بڑا دلفریب ہے۔ محل کی عمارت۔ اِس کی
اندرونی آرایش اور ساز و سامان وغیرہ فی الحقیقت شاہانہ ہیں۔ اِس میں

آٹھ سو ساٹھ کمرے ہیں۔ سامان کو دیکھ کر طبیعت پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ یہ لوگ قدیم چیزوں کی کتنی قدر کرتے ہیں۔ کیسی اچھی حالت میں ان کو محفوظ رکھا ہے قریب ہی میں ایک گوتھک وضع کا خوبصورت گرجا ہے۔ اس کی تعمیر تیرہویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی تھی۔ ترکوں کے زمانہ حکومت میں ڈیڑھ سو برس تک یہ گرجا مسجد کا کام دیتا رہا۔ بلکہ یہاں کی سب سے بڑی مسجد یہی تھی۔ اسلامی حکومت کے زوال پر عیسائیوں کا دور دورہ ہوا تو انہوں نے اس کو گرجا کر لیا۔ رہبر سیر کراتے وقت اکثر ترکی حکومت کا ذکر بلحاظ ضرورت کیا کرتا تھا اس وقت ہمارے قلوب کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ افسوس کہ زمانہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ جس ملک میں اتنے عرصہ تک اسلامی حکومت رہی ہو وہاں آج کیفیت یہ ہے کہ اگر تلاش بھی کرو تو کوئی ذی وجاہت مسلمان نہ ملیگا۔

گندھک کے چشمے

دریائے ڈینوب پر سے عبور و مرور کے لئے چھ پل بنے ہوئے ہیں۔ ایک پل بہت شاندار اور خوبصورت ہے۔ اس کا شمار یورپ کے بہترین پلوں میں کیا جاتا ہے اس شہر کی ایک خصوصیت لائق ذکر یہ ہے کہ یہاں گندھک کے چشمے کثرت سے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے سائنس کے اصول کے مطابق بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔ اچھی اچھی عمارتیں اور حوض بنے ہوئے ہیں بیماروں کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر ہر ایک بات کا انتظام کر دیا گیا ہے سنا ہے کہ اکثر امراض کے واسطے ان چشموں میں نہانا مفید ہوتا ہے بڑی رونق کے مقامات ہیں۔ خوب چہل پہل رہتی ہے ایک ہی حوض میں عورت مرد ساتھ نہاتے ہیں۔ یہ تماشہ بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ ہندوستانیوں کو یہ کیفیت دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ مگر یورپ میں یہ طریقہ معیوب نہیں ہے اس قسم کا

ایک مقام فرانسس جوزف پل کے کنارے پہاڑی کے نیچے بنا ہوا ہے جس کو سینٹ گلبرٹ باتھ کہتے ہیں۔ یہیں پر اِس نام کا ہوٹل بھی ہے۔ یہ بداپسٹ کا بہترین ہوٹل مانا جاتا ہے۔ ان تمام چشموں میں پانی گرم ہوتا ہے اور حوض میں بجلی کے ذریعہ لہریں پیدا کی جاتی ہیں۔ دریا میں ایک جزیرہ سینٹ مارگریٹ نامی ہے۔ یہ بڑی تفریح کی جگہ ہے۔ بالخصوص نہانے کا مقام بالکل پرستان معلوم ہوتا ہے۔ کنارے کنارے بہت دور تک ریت بچھی ہوئی ہے تہذیب اور شائستگی میں یورپ کی ترقی کا نمونہ اگر دیکھنا ہے تو ایسے مقامات کی سیر ضرور کرنی چاہئے۔ یہ معلوم ہو جائے گا کہ مغربی تمدن میں شرم وحیا کو کس حد تک دخل ہے

جپسی قوم کے لوگ

موسیقی کے لحاظ سے یہ حصہ ملک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ ایک قوم جپسی کے نام سے مشہور ہے جس کے عادات اور حالات اکثر ہمارے یہاں کے بنجاروں سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کی موسیقی بہت ہردلعزیز ہے۔ اکثر بڑے بڑے رسٹوران میں جپسی باجہ نوازی ہوتی رہتی ہے

عام اخلاق اور لباس

لوگ عام طور پر خلیق ہیں۔ ہوٹل کے ملازمین کو دیکھا کہ ہر وقت تواضع کے لئے جھکے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ دوہرے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہوٹل میں ایک بڈھا جو مالک ہوٹل معلوم ہوتا تھا نہایت خوش مزاج تھا اس کی سفید داڑھی ناف تک پہنچ گئی تھی ہم نے اِس سفر میں ایسی داڑھی کہیں نہیں دیکھی۔ تراش کی ایسی خوبصورت تھی

کہ اوپر سے بتدریج پتلی ہوتی چلی آئی تھی اور آخر میں صرف دو تین بال رہ گئے تھے۔ ہندوستان میں بعض سکھوں کی داڑھی اس نمونہ کی دیکھی گئی ہے۔ یہ بڈھا بھی اکثر تعظیم کے واسطے دوہرا ہو جاتا تھا۔ ہاتھ چومنے کی رسم جس طرح ممالک مشرق میں پائی جاتی ہے یہاں بھی دیکھنے میں آئی۔ دیہاتی لوگوں کے لباس میں مشرق کا اثر موجود ہے۔ یہ لوگ زرق برق اور خوق البھڑک کپڑے بہت شوق سے پہنتے ہیں۔ ٹوپی میں آرایش کے لئے پھول اور پر وغیرہ لگاتے ہیں۔ لطف تو یہ ہے کہ مرد بھی اسی قسم کا مذاق رکھتے ہیں ان کے رنگ برنگی لباس جن کو یہ خاص موقعوں پر پہنا کرتے ہیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ معاشرت اور عادات وغیرہ کے لحاظ سے یہ ملک نہ تو خالص یورپ کہا جا سکتا ہے اور نہ اس کا شمار بلاد شرقیہ میں ہے دونوں قسم کی تہذیب کا مجموعہ سمجھنا چاہیے۔ یہاں لوگوں کو سرخ مرچ بھی کھاتے ہوئے دیکھا لیکن اس طرح کہ مرچ کا باریک پوڈر مثل سفوف بنا کر شیشوں میں بھر لیتے ہیں۔ کھانے کے وقت نمک اور سیاہ مرچ کی طرح اس کو بھی بقدر ضرورت چھڑک لیا جاتا ہے۔ رات کو ایک بجے تک بازاروں میں رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ یہاں آکر پہلی دفعہ یہ تماشا دیکھا کہ بدچلن عورتیں سڑکوں پر چکر لگاتی رہتی ہیں اور راستہ چلنے والوں کو مسکرا مسکرا کر اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔ قاہرہ اور دمشق میں جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں اس قسم کی عورتوں کے لئے مخصوص مقامات ہیں جن کے باہر وہ اپنا پیشہ انجام دینے کے لئے نہیں جا سکتیں۔ استنبول میں اب قانوناً ایسے مقامات بند کر دیے گئے ہیں اور بدچلن عورتیں بازاروں میں نظر نہیں آتیں۔

یہاں کے واقعات لائق تذکرہ ہیں۔ ہوٹل کے سامنے کسی سے اپنا اسباب

اُترواہی رہے تھے کہ چند نوجوان لڑکیاں ہمارے قریب آکر کھڑی ہوگئیں۔ کبھی اسباب کو دیکھتی اور کبھی ہماری طرف پہلے ہم کو خیال ہوا کہ ہوٹل کی ملازم ہوں گی۔ لیکن بار بار مسکرانے اور دوسری اداؤں سے معلوم ہوگیا کہ بازاری عورتیں ہیں۔ اس کے بعد روزمرہ اسی قسم کے واقعات پیش آتے رہے ایک دفعہ ایسا ہوا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہوکر اپنے ہوٹل کے قریب ایک درخت کے نیچے ہم تینوں کھڑے بازار کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ تین چار لڑکیاں مسکراتی ہوئی قریب آئیں۔ اپنی زبان میں خدا معلوم کیا کیا کہتی رہیں جب معلوم ہوا کہ ہم اجنبی ہیں تو اشارے بازی کرنے لگیں۔ بار بار ان کی زبان پر "ہوٹل" کا لفظ آتا تھا۔ ہم جواب میں "نو" نفی میں کہہ دیتے تھے بہت دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران میں ایک بیباک لڑکی نے رفیق بیگ کی جیب سے ہنستے ہنستے رومال نکال لیا۔ جب ضرورت سے زائد بے تکلفی کا اظہار ہونے لگا تو ہم وہاں سے چلے آئے۔ ایک دن شام کے وقت میں تنہا بازار میں چلا جارہا تھا کسی گلی کے نکڑ پر درمیانی عمر کی ایک جسیم عورت کھڑی ہوئی تھی۔ مجھ کو دیکھ کر مسکرانے لگی اور ساتھ ہوگئی۔ چند الفاظ مطلب کے انگریزی میں کہتی تھی۔ مثلاً "ہنگری کی خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں"۔ "میرے ساتھ چلو" بار بار "پلیز" یعنی براہ کرم کا لفظ اس کی زبان پر آتا تھا۔ میں جواب میں صرف "نو" کہہ دیتا تھا۔ بہت دور تک اس نے پیچھا کیا۔ عاجزی اور انکسار کی انتہا ہوگئی۔ بالآخر دو سگریٹ اس دیوی کی نذر کرکے نجات حاصل کی۔ انگریزی ساخت کا سگریٹ ان ممالک میں بہت مہنگا ہوتا ہے۔ اکثر عورتیں کمال اشتیاق کے ساتھ "انگلش سگریٹ" کا سوال کرتی ہیں۔ اس مشاطہ سے رہائی پانے کے بعد ایک بارونق چوراہے پر

بُداپسٹ میں نہانے کا حوض

Chandrakanth Press, Hyd.

بیچ میں چمن تھا اور جابجا لوہے کی بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ آرام لینے کی خاطر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ سامنے ایک سہ منزلہ عمارت تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ تیسری منزل پہ ایک خوبرو نوجوان عورت دریچہ میں بیٹھی میری طرف اشارہ کر رہی ہے۔ حیران تھا کہ کیا کروں، دل نے کہا خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے چلے چلو۔ ورنہ کسی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ غیر ملک، غیر زبان۔ خدا معلوم ان اشاروں میں کیا بھید ہے۔ اسی خیال میں غلطاں و پیچاں تھا کہ پیچھے سے آہٹ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک نوجوان آدمی کھڑا اشاروں کے جواب دے رہا ہے معلوم ہوا کہ اشاروں کے ٹیلیفون کے ذریعے عشق کا فلسفہ حل ہو رہا ہے کچھ دیر بعد عورت نے کھڑکی کو بند کیا۔ بن سنور کر نیچے آئی۔ عاشق دلگیر نے پیشوائی کی۔ عورت نے سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا۔ مرد نے بوسہ دیا۔ اور دونوں خوش خوش ایک طرف چلے گئے۔ میرے دل سے بیساختہ دعا نکلی کہ خدا ان کی مراد دل کو پورا کرے۔

ویانا میں ہوٹل کا جھگڑا

۷ ار جون کو صبح کے وقت روانہ ہو کر سر مغرب ویانا پہنچے استنبول سے چلتے وقت امریکن ایکسپرس کے ذریعہ ویانا میں قیام کا بندوبست کر لیا تھا۔ کمپنی نے کچھ رقم پیشگی وصول کر لی تھی اور کہا تھا کہ ہوٹل کے بل میں وضع ہو جائے گی۔ باضابطہ رسید بھی دے دی گئی۔ اور ایک پرچہ ملا جس پہ ہوٹل کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ خدا معلوم پتہ لکھنے میں دفتر والے نے کیا غلطی کی کہ اس کی وجہ سے کسی قدر پریشانی اٹھانی پڑی اسٹیشن پر ایک گاڑی دو گھوڑوں کی کرایہ پر لی اور ہوٹل کا پرچہ گاڑی والے کو دے دیا جس ہوٹل میں وہ لے گیا۔ وہاں انگریزی بولنے والی دو لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو امریکن ایکسپرس سے تعلق نہیں ہے اور نہ ہمارے پاس کوئی اطلاع تمہارے

متعلق پہنچی۔ ماسوا اس کے اس ہوٹل میں آجکل جگہ بھی نہیں ہے ہمارے پاس جو پتہ ہوٹل کا تھا اسے دیکھ کر انہوں نے گاڑی والے کو کچھ ہدایت دی اور ہم سے کہا کہ یہ ہوٹل قریب ہی میں ہے۔ گاڑی والا تم کو وہاں لیجائے گا۔ ہم اس دوسرے ہوٹل میں پہنچے۔ دراصل یہ ایک خانگی ہوٹل تھا جس کو پن سی اون کہتے ہیں مالکہ نے پتہ دیکھ کر کہا۔ یہ وہی ہوٹل ہے صرف ایک کمرہ خالی تھا جس میں دو پلنگ تھے تیسرے پلنگ کی گنجائش نہ تھی۔ مالکہ نے اپنا کمرہ خالی کردیا۔ صبح کو میڈم سے ہوٹل کے کرایہ اور کھانے پینے کے متعلق گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ دراصل یہ ہوٹل وہ نہیں ہے جس کا پیشگی کرایہ ہم دے چکے ہیں۔ البتہ دونوں ہوٹل ہم نام ہیں اس کی وجہ سے مالکہ کو بھی غلط فہمی ہوئی۔ لطیفہ یہ کہ ہماری ایک معقول رقم بطور پیشگی پھنسی ہوئی تھی ظاہر ہے کہ یہ اس ہوٹل سے وصول نہیں ہوسکتی تھی بالآخر اس جھگڑے کے تصفیہ کے لئے امریکن اکسپرس کے دفتر جانا پڑا۔ تمام قصہ سننے کے بعد منیجر نے کہا کہ تم نے غلطی کی جو دوسرے ہوٹل میں ٹھہر گئے اب رقم کیسے واپس ملسکتی ہے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ تمہاری کمپنی نے پتہ صاف اور تفصیل کے ساتھ لکھ کر نہیں دیا ہم مسافر اور اجنبی آدمی اس شہر کے حالات سے ناواقف۔ بہت دیر تک منیجر دونوں ہوٹل والوں سے ٹیلیفون پر بات کرتا رہا اس کے بعد مجھ سے کہا کہ اصل ہوٹل کی مالکہ کہتی ہے کہ ہم ان مسافروں کے انتظار میں تھے۔ اور جگہ بھی ان کی محفوظ تھی لیکن وہ آئے نہیں۔ اس لئے پیشگی رقم واپس نہیں دی جاسکتی۔ کچھ دیر کی حجت کے بعد منیجر نے رقم واپس دیدی۔ لیکن کہتا تھا کہ ہماری غلطی اگرچہ نہیں ہے لیکن کمپنی کو نیک نام رکھنے کی خاطر تمہاری رقم واپس کئے دیتے ہیں۔ اس جھگڑے میں شام ہوگئی۔ واپسی کے وقت راستہ بھول گیا۔ ہوٹل بھی فاصلہ پر تھا۔ زبان کی اجنبیت کی وجہ سے یہ معلوم کرنا بھی مشکل تھا کہ کس

موٹر بس میں بیٹھنا چاہیے۔ بڑی تلاش کے بعد ایک صاحب مع اپنی میم صاحبہ کے ملے۔ شُد بُد انگریزی جانتے تھے۔ ان کی امداد سے ایک موٹر بس میں سوار ہُوا۔ میم صاحبہ نے موٹر والے کو سمجھا دیا کہ ان کو فلاں مقام پر اُتار دینا۔

ایک میلہ

ہمارے قیام کے زمانہ میں شہر کی اکثر دکانیں بند رہیں اور بازار بے رونق معلوم ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ شہر کے قریب ایک مقام پر جس کو پراٹر کہتے ہیں۔ کئی روز تک ایک زبردست میلہ رہا۔ اس جگہ بہت بڑا پارک ہے اس کا رقبہ (۷) مربع میل کے قریب ہوگا۔ رات دن یہاں لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ تفریح کے وہ تمام اسباب موجود تھے۔ جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتے ہیں۔ سماٹرا کی طرف کے کچھ کالے پیلے لوگ بھی بطور نمائش موجود تھے ان کے دیکھنے کو ایک کثیر مجمع ہر وقت ڈیرے کے سامنے لگا رہتا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک کالے لوگ عجائب خانے میں رکھنے کے لائق ہیں۔ ایک ڈیرے کے سامنے ایک شخص بہت بڑا پیجامہ شلوار کے نمونے کا لئے کھڑا تھا۔ کہتا تھا کہ اندر ایک بہت موٹی عورت ہے۔ جس کا یہ پیجامہ ہے۔ عورت اس قدر موٹی ہے کہ اس کے پائچے میں ایک آدمی آجاتا ہے۔ چنانچہ وہ عملاً ایسا کر کے تبلاتا تھا گویا یہ ایک اشتہار تھا کہ اس عورت کو دیکھنے کے لئے آؤ۔ دو روز تک شہر کی دکانیں بالکل بند رہیں اور میلہ آباد رہا۔ شہر میں سگریٹ تک ملنا دشوار ہو گیا تھا۔

ایک روز رات کو میلہ دیکھ کر ہوٹل واپس ہو رہے تھے۔ راستہ بھول گئے۔ قریب میں نہ تو ٹرام تھی نہ ٹیکسی۔ میرے پاس ایک پرچہ پر ہوٹل کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ لیمپ پوسٹ کے پاس ٹھہر کر میں نے جیب سے پرچہ نکالا اور ایک شخص کو اشارہ کیا کہ اس کو پڑھ کر راستہ بتا دو۔ خدا معلوم اُس کے

دل میں کیا خیال آیا کہ خوف زدہ ہو کر پس و پیش میں پڑ گیا۔ ہم خود اس کی طرف بڑھے تو وہ سرپٹ بھاگنے لگا۔ اور پلٹ پلٹ کر ہم کو دیکھتا بھی جاتا تھا۔ ہم حیران تھے کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ شاید وہ سمجھا کہ اشارہ بازی میں کوئی نہ کوئی بھید ضرور ہے۔

ہوٹل

ہمارا ہوٹل جس محلہ میں تھا اس کو گارنی سنگا سے کہتے ہیں۔ ہوٹل کی مالکہ روس کے طرف کی رہنے والی تھی۔ اس کا بیان تھا کہ خاوند اور بال بچے وہیں رہا کرتے ہیں۔ یہ خاتون انگریزی سے اچھی طرح واقف ہے۔ دروازہ ہوٹل کا بہت شاندار ہے۔ اندرونی حصہ میں مختلف مکانات مختلف لوگوں کے قبضہ میں ہیں۔ میڈم کے قبضہ میں چھ سات کمروں سے زیادہ معلوم نہیں ہوئے۔ ہمارے پہلو کے کمرے میں ایک ترک عورت ٹھہری ہوئی تھی اس کا خاوند فالج میں مبتلا ہو کر بغرض علاج یہاں کسی شفا خانہ میں تھا۔ ہوٹل میں دو نوجوان عورتیں کام کاج کے واسطے ملازم ہیں یہی کھانا پکاتی ہیں انگریزی بالکل نہیں جانتیں۔ نہایت باادب اور سلیقہ شعار ہیں۔ یورپ کی عورتوں کی بیباکی اور آزادی ان میں مطلق نہیں ہے۔ میڈم اکثر اپنے کام سے باہر چلی جایا کرتی تھی۔ اس لئے ان لڑکیوں سے کام لینے میں کسی قدر مشکل ضرور واقع ہوتی تھی۔ ہر ایک بات کے لئے اشارہ کرنا پڑتا تھا۔ رفیق بیگ کو زکام کی شکایت ہوگئی انھوں نے اپنے ساتھ جوشاندے کی یونانی ادویات رکھی تھیں جن کو جوش دلوانے کی ضرورت تھی اس مطلب کو سمجھانے میں بڑی کوشش کرنی پڑی۔ ہوٹل کا دروازہ آٹھ بجے کے بعد بند ہو جاتا ہے۔ لیکن اندر کی طرف پھاٹک کا ایک نگہبان سویا کرتا تھا گھنٹی کی آواز پر یہ دروازہ کھول دیتا۔ پہلی دفعہ جب ہمارے لئے اس نے دروازہ کھولا تو اس کو کچھ پیسے ہم نے دیئے۔ وہ اپنی زبان میں کچھ

کہتا رہا۔ جس کو ہم نہیں سمجھے۔ صبح کو میڈم سے معلوم ہوا کہ رات کو دروازہ کھولنے کے معاوضہ میں نگہبان کو ایک مقررہ رقم دینی پڑتی ہے اور ہم نے معاوضہ کم دیا ہے۔ نگہبان اس کا تکملہ چاہتا ہے۔ ہم کھانا بھی اسی ہوٹل میں کھایا کرتے تھے دس شلنگ کے اندر ہی سب کچھ طے پایا۔

عام حالات

ہوٹل کے قریب ایک باغ تھا۔ شام کو یہاں بڑی تفریح رہتی ہے۔ ایک دفعہ اس باغ میں کافی پینے کے لئے رسٹوران میں گیا۔ کافی نہیں ملی۔ لوگ جما ہوا دہی شوق سے کھا رہے تھے۔ ایک پیالہ میں مجھ کو بھی دیا گیا۔ اچھا ذائقہ دار دہی تھا۔ یہ شہر زیادہ قدیم نہیں ہے عمارتیں سب سنگین اور عالیشان ہیں اس لحاظ سے یہ شہر یورپ میں ممتاز ہے۔ اکثر بازار خوبصورت اور سڑکیں چوڑی ہیں۔ جس طرف جاؤ ایک نمونہ کے مکانات دکھائی دیتے ہیں آبادی میں لاکھ سے اوپر بتائی جاتی ہے۔ زمانۂ جنگ کے بعد جس قدر مفلسی او مصیبت اس شہر پر آئی یورپ کے کسی شہر پر نہ آئی ہوگی۔ اب حالت سنبھلتی جاتی ہے صنعت و حرفت کے لحاظ سے یہ ایک اہم مقام مانا جاتا ہے۔ چمڑے کا سامان اور چوبی فرنیچر اچھا بنتا ہے۔

شہر کا بہترین حصہ رنگ اسٹراسے ہے۔ عالیشان اور سجی ہوئی دکانیں اور قہوہ خانے وغیرہ دیکھنے کے لائق ہیں۔ شہر کے مشرقی گوشہ میں دریائے ڈینیوب بہتا ہے اس میں سے ایک نہر کاٹ کر شہر میں لے گئے ہیں یہ حصہ بہت بارونق ہے۔ اس شہر میں پھولوں کی کثرت دیکھی۔ اکثر کرایہ کی گاڑیاں بھی پھولوں سے سجائی جاتی ہیں۔ گھوڑے زبردست اور شاندار دکھائی دیتے ہیں۔

چند مقامات خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہیں۔ ایک گرجا سینٹ اسٹیفن

نامی ہے جس کا گنبد ساڑھے چار سو فیٹ بلند ہے۔ طبابت کے واسطے یہاں ایک
خاص یونیورسٹی ہے جو تمام دنیا میں مشہور ہے۔ ایک ہزار سے اوپر طلبہ اس میں
پڑھتے ہیں۔ بعض ہندوستانی طالب علم بھی دیکھنے میں آئے۔ عمل جراحی بھی یہاں
خوب ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے دور دور سے مریض آتے ہیں۔ ایک قدیم
محل ہے اس کو دیکھنے کے لئے موٹر کوچ کے ذریعے گئے۔ رہبر انگریزی جانتا
تھا۔ ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ یہاں کی مشہور ملکہ میریا تھیریسا کے رہنے کے
کمرے دیکھے۔ اکثر سامان جو ملکہ روزمرہ استعمال کرتی تھی جیسے کا ویسا رکھا
ہوا ہے اسی طرح نپولین کی آرام گاہ اور اس کا پلنگ وغیرہ محفوظ ہے۔ ایک
گھنٹہ ایسا دیکھنے میں آیا جس میں تین سال کے بعد کنجی دی جاتی ہے یہ سب
کچھ صحیح۔ لیکن پوچھو کہ ان کو استعمال کرنے والے کہاں ہیں۔ شاید قبر میں
ان کی ہڈیاں بھی اصلی حالت میں باقی نہ ہوں گی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر
بڑی عبرت ہوتی ہے۔

کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال گوشۂ فقر و بزم سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گماں تاج فغفور و تخت خاقانی

محل کی اندرونی آرائش اور ساز و سامان تعریف سے باہر ہے عجائب خانہ
میں اکثر چیزیں بیش بہا موجود ہیں۔ ایک گلدان موتیوں کا بنا ہوا دیکھا۔ اس
میں گلدستہ بھی رکھا ہوا تھا لیکن غور سے دیکھو تو تعجب ہوگا کہ یہ گلدستہ اصلی
پھولوں کا نہیں ہے بلکہ تمام جواہرات کا بنا ہوا ہے۔ رنگ برنگ کے جواہرات
اس نزاکت اور خوبصورتی کے ساتھ جڑے ہیں۔ کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے ایک
دوسرے عجائب خانہ میں شاہی جواہرات محفوظ رکھے گئے ہیں۔ شہر بحیثیت مجموعی
نہایت خوبصورت ہے۔ یہاں کے کھانے میں مشرقی اثر پایا جاتا ہے۔ اکثر

چاول کھانے کو ملے۔ ایک زمانہ میں ترکوں نے اس شہر کا بھی محاصرہ کر لیا تھا لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ ان کی سعی کامیاب نہ ہوئی۔

ویانا تا برلن

۱۱ر جون کو صبح آٹھ بجے کے قریب ویانا سے برلن روانہ ہوئے۔ راستہ میں منظر بہت اچھا تھا۔ دور تک دریا کا کنارہ ملا۔ کثرت سے عورت مرد نہاتے ہوئے دکھائی دیے۔ سرسبز پہاڑ اور چشمے بہت دلکش تھے۔ جنگل بھی خوبصورت تھا۔ کچھ دیر تک ہمارے درجہ میں ہم تین مسافر رہے۔ بعد کو ایک نوجوان عورت آ گئی معلوم ہوا کہ یہ شہر پراگ تک ہمارے ساتھ جائے گی۔ تھوڑی سی انگریزی جانتی تھی ہم کو یہی غنیمت معلوم ہوا کیونکہ جب کبھی کوئی انگریزی داں ملجاتا تھا ہم کو معلومات حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا اس کے ساتھ سلسلہ گفتگو شروع ہوا۔ ملک کے عام حالات اور زمانہ جنگ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ چوڑیوں کے کارخانہ میں کام کرتی ہے اور یہاں سے ہندوستان کو بھی چوڑیاں جاتی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی شادی پہلے ہوئی تھی لیکن کچھ عرصہ ہوا کہ خاوند سے طلاق لے لی اور اب دوسری شادی کی فکر میں ہے۔ بار بار منھ پر پوڈر اور ہونٹوں پر سُرخی لگاتی تھی۔ یورپ میں سنگار کا یہ طریقہ عام ہو گیا ہے بازار ہو۔ ریل ہو یا ٹرام ہو ہر جگہ یہ بناؤ بلاتکلف ہو سکتا ہے۔ سلیم بھائی نے دوران گفتگو اس کی عمر دریافت کی اس پر وہ کسی قدر ناراض ہوئی اور کہنے لگی معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ پہلی دفعہ یورپ میں آئے ہو۔ یہاں کسی عورت کی عمر دریافت کرنا گویا اس کی ہتک کرتا ہے کیونکہ یورپ میں عورت ہمیشہ

یورپ میں عورت ہمیشہ جوان رہتی ہے

جوان ہی رہنا چاہتی ہے۔ تم عمر دریافت کر کے اس کے بڑھاپے کو یاد دلاتے ہو

ہم نے کہا واقعی ہم اس ملک کے رسم ورواج سے ناواقف ہیں۔ اِس سے لئے معافی چاہتے ہیں۔ مگر یہ بتاؤ کہ تمھارے نزدیک کیا عورت کی جوانی اور حسن دولت کا زوال ہے۔ اس نے کہا غلط ہو یا صحیح۔ عورت تو اپنے حسن اور جوانی کو لازوال ہی سمجھتی ہے مرد کے واسطے زیبا نہیں ہے کہ اس کے خلاف باور کرا کے اس کے دل کو ٹھیس لگائے۔ البتہ اگر تم کو عمر معلوم کرنے کی ضرورت ہے تو دفتر صفائی میں جا کر دریافت کر سکتے ہو۔ اللہ اکبر۔ خود پسندی کی بھی انتہا ہو گئی۔ کاش کوئی اِن عورتوں کو سمجھائے کہ

شان ہو جس میں دلربائی کی   غنداگل سے بے بقا تر ہے
خوبیاں جس میں ہوں غدائی کی   جنس کاسد سے نارواتر ہے

یہ عورت پراگ کی بڑی تعریف کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ اگر تم لوگ یہاں ٹھہر جاؤ تو میں تم کو اچھی طرح سیر کراؤں گی۔ اندیشہ ہوا کہ اس کی رہبری کچھ رنگ نہ لائے۔ اس لئے وقت کی تنگی کا عذر کر کے اس کا شکریہ ادا کیا۔ پراگ کا اسٹیشن قریب آیا تو میں نے اس خاتون سے کہا کہ اسٹیشن پر پینے کا پانی مل سکے تو دلوا دو۔ کیونکہ ہم زبان نہ جاننے کی وجہ سے خود انتظام نہیں کر سکتے۔ اس نے کہا کہ اسٹیشن پر تم لوگ پانی مت پیا کرو۔ ہر مقام پر اچھا پانی ملنا مشکل ہے اور بیماری کا اندیشہ رہتا ہے یا تو بیئر استعمال کرو یا چشمہ کا پانی پیا کرو۔ جو بوتلوں میں ملتا ہے اسٹیشن آیا تو اس نے کہا کہ میرے ساتھ پلیٹ فارم پر چلو۔ میں چشمہ کا پانی دلوا دیتی ہوں۔ تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ چشمہ کا پانی تو نہیں ہے

بیئر کا رواج

لیکن بیئر مل سکتی ہے۔ جرمنی میں بیئر کا بڑا رواج ہے عورت مرد سب پیتے ہیں۔ اس میں نشہ نہیں ہوتا اس کے علاوہ گرمی کے موسم میں چشمہ کا پانی اور تازہ آبشورہ بھی بکثرت پیا جاتا ہے

پراگ سے دو مسافر اور آن بیٹھے۔ یہ دونوں میاں بیوی تھے۔ ان کا مکان ہالینڈ کے کسی شہر میں تھا۔ محض سیر کی غرض سے سفر کر رہے تھے۔ یہ دونوں جرمن زبان سے ناواقف تھے۔ لیکن انگریزی ٹوٹی پھوٹی جانتے تھے۔ برلن تک ہمارے ساتھ رہے ہم نے حسب عادت ان سے بھی باتیں کیں بچوں کو وطن میں چھوڑ آئے تھے جلدی واپس جانا چاہتے تھے۔

برلن

رات کو ساڑھے دس بجے برلن پہنچے۔ ویانا سے روانہ ہوتے وقت امریکن اکسپرس کے ذریعہ برلن کے ایک پن سیون کا پتہ لے لیا تھا پن سیون کو خانگی ہوٹل سمجھئے۔ برِاعظم میں اور بالخصوص جرمنی میں یہ بکثرت موجود ہیں۔

ایک تکلیف دہ رواج

برلن میں ایک تکلیف دہ رواج جس کا ہم کو علم نہ تھا۔ یہ ہے کہ پن سیون کا دروازہ رات کو ۸ بجے بند کر دیا جاتا ہے۔ مسافر کے پاس کنجی نہ ہو تو وہ کسی طرح اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ باہر سے اندر والوں کو مطلع کرنے کا کوئی مقررہ طریقہ نہیں ہے۔ چنانچہ دروازہ حسب معمول بند تھا۔ ہم نے اور موٹر والے نے اطلاع کی ہر چند کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی تالیاں بھی بجائیں۔ شور و غل بھی کیا مگر بے سود۔ ایک پولیس کانسٹبل بھی وہاں آگیا اس نے بھی دروازہ کھلوانے کی کوشش کی مگر نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کار مجبوراً ایک دوسرے پن سیون کو گئے۔ وہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد مایوس ہو کر کہیں اور جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ایک میم صاحب وہاں آگئیں۔ ان کے پاس کنجی تھی۔ دروازہ کھولکر اندر جانے لگیں۔ ہم بھی ان کے ساتھ داخل ہو گئے۔ گویا بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ان کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ موٹر والے

اپنی زبان میں کچھ سمجھایا میم صاحبہ نے اشارہ کیا کہ میرے پیچھے چلے آؤ تیسری منزل تک ان کے پیچھے گئے۔ وہاں جاکر انھوں نے اشارے سے بتلایا کہ یہ دروازہ پن سیون کا ہے۔ پہلو میں جو بٹن لگا ہوا تھا اس کو دبا دیا۔ منٹ بھر کے بعد ایک نوجوان عورت نے دروازہ کھولا میم صاحبہ نے اپنی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ جس عورت نے دروازہ کھولا وہ چیمبر میڈ یعنے خادمہ تھی۔ ہم نے اشاروں کے ذریعہ اس کو سمجھایا۔ کہ مسافر ہیں اور قیام کرنا چاہتے ہیں وہ کمرے کی کنجی لینے مالکہ کے پاس گئی۔ واپس آئی تو ہم کو اشارہ سے اندر بلایا۔ کہ اپنا کمرہ پسند کرلو۔ ہم نے دو کمرے پسند کر لئے اور اس سے کہا کہ نیچے سے اسباب منگوالو۔ وہ اسباب لینے چلی گئی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ خادمہ شوفر اور رفیق بیگ سامان اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ رفیق بیگ بہت خفا تھے کہ تم دونوں آرام سے اوپر ٹھہر گئے اور مجھ کو اسباب اٹھانا پڑا۔ موٹر والے نے بھی ڈبل کرایہ وصول کیا آدمی اگرچہ مضبوط تھا لیکن تیسری منزل تک سامان اٹھاکر لانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بیچارہ ہانپ گیا اور خادمہ کا بھی برا حال ہوگیا۔ اگرچہ برقی جھولا موجود تھا۔ لیکن رات کو بند کر دیا جاتا ہے۔

ہوٹل

صبح کو ایک دوسری خادمہ نظر آئی جو انگریزی کے کچھ الفاظ جانتی تھی۔ ہوٹل کی مالکہ نیچے کی منزل میں رہتی ہے یہ عورت سن رسیدہ اور انگریزی سے بے بہرہ تھی۔ لیکن ایک دوسری خاتون انگریزی سے واقف تھیں۔ ان کے توسط سے ہوٹل کے شرائط معلوم کئے۔ روزانہ ۹ مارک فی شخص طے پایا۔ ایک مارک ایک شلنگ کے برابر ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھو۔ کہ حالی بارہ آنے ہوئے۔ اِس رقم میں ناشتہ اور دو وقت کا کھانا بھی شامل تھا البتہ سہ پہر کی چائے شامل نہ تھی۔ یہ ہوٹل برلن کے ایک مشہور محلہ پوٹس وام اسٹراسے میں

واقع ہے۔ اسی ہوٹل میں چند امریکن سیاح ٹھہرے ہوئے تھے۔ کھانے کے وقت اکثر ان سے گفتگو رہتی تھی۔ ہم ایک ہفتہ اس ہوٹل میں ٹھہرے۔ خاصہ آرام دہ ہوٹل ہے کھانا بھی اچھا تھا لیکن جس حصۂ شہر میں رفیق بیگ کو روزانہ کام تھا۔ وہاں سے یہ مقام دور تھا۔ اس لئے ایک دوسرے ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ یہ کارل اسٹراسے میں ہے۔ اس ہوٹل میں کوئی بھی انگریزی سے واقف نہ تھا۔ اور صرف صبح کا ناشتہ ملتا تھا۔ کھانے کا انتظام نہ تھا۔ ہم لوگ باہر کسی رسٹوران میں کھا لیا کرتے تھے برلن کا مشہور محلہ فریڈرِش اسٹراسے اس ہوٹل سے بالکل قریب ہے۔

برلن میں ہندوستانی یہاں چند ہندوستانیوں سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب پروفیسر خیری ہیں جو خانگی طور پر عربی وغیرہ پڑھاتے ہیں۔ بہت شریف اور ہمدرد آدمی ہیں۔ وہیں شادی کر لی ہے اور صاحب اولاد ہیں۔ ایک دوسرے صاحب منظور احمد دلی کے رہنے والے ہیں۔ سات برس سے یہاں طالب علم ہیں۔ انہوں نے ہم کو بہت کچھ سیر کرائی۔ ایک اور مسلمان طالب علم ملے یہ حیدرآباد کے رہنے والے ہیں معلوم ہوا کہ برلن میں ہندوستانی مسلمانوں کی اچھی تعداد ہے۔

برلن برلن جرمنی کا دارالسلطنت اور دریائے اسپری پر واقع ہے اس کی آبادی چالیس لاکھ سے زیادہ ہے صفائی اور حفظانِ صحت کے لحاظ سے یہ شہر تمام یورپ میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ نسبتہً ایک جدید شہر ہے اس لئے باقاعدہ اور سلیقہ کے ساتھ بنا ہوا ہے۔ سڑکیں بہت کشادہ اور سیدھی ہیں۔ مکانات اگرچہ خوبصورت نہیں ہیں لیکن سنگین روشن اور ہوادار ہیں ایک خصوصیت یہ ہے کہ تنگ و تاریک اور میلی کچیلی گلیاں بالکل نہیں ہیں جنگِ عظیم سے قبل یہ شہر روز افزوں ترقی پر تھا۔ لیکن جنگ کے سلسلہ میں جو مالی اور

تجارتی نقصان جرمنی کو اٹھانا پڑا۔ اس کا اثر اس کی رفتار ترقی پر بہت کچھ پڑا۔
اب پھر ترقی کے آثار پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ جرمن جفاکش اور ذہین لوگ ہیں۔
اس لئے اپنے ملک کی ترقی کے واسطے جدوجہد میں برابر مصروف ہیں۔

افلاس

سنا گیا ہے کہ آجکل جرمنی اور اسٹریا میں جتنے بے روزگار آدمی ہیں
اتنے یورپ کے کسی حصہ میں نہیں۔ مالی حالت خراب ہو گئی
ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ فلاس انسان کے اخلاق کو بگاڑ دیتا ہے

افلاس ہے مقدمہ قہر ذوالجلال — افلاس سے زیادہ جہاں میں نہیں وبال
ڈرپوک پست ہمت و سست و دنی خیال — افلاس کر ہی دیتا ہے انساں کو پائمال

اس عام قاعدے سے جرمنی بھی نہ بچ سکا۔ چنانچہ برلن کے بازاروں میں
عام طور پر بدچلن نوجوان عورتیں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ اور زیادہ تر اجنبی مسافروں کو
اپنا شکار بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ بعض اس قدر بے شرم اور بے حیا ہیں۔
کہ باوجود انکار کے بہت دور تک پیچھا کرتی ہیں۔ بعض سگریٹ مانگتی ہیں
بعض اشارے کرتی ہیں۔ غرض یہ کہ اس قسم کی سینکڑوں عورتیں بازاروں
میں ملتی ہیں۔ سنا ہے کہ جنگ سے پہلے یہ کیفیت نہ تھی۔ مسافر کو چاہیئے کہ
ایسی عورتوں سے اپنے آپ کو بچاتا رہے۔ ہمارے ہوٹل میں ایک امریکن
سیاح مع اپنی بیوی کے ٹھہرا ہوا تھا۔ کہتا تھا کہ ان بازاری عورتوں کے
حالات دیکھ کر شام کے وقت اپنی بیوی کو ساتھ لے جاتے ہوئے مجھے شرم
آتی ہے۔ امریکہ میں ایسی عورتوں کے لئے خاص مقامات ہیں۔ بازار میں
کوئی عورت پریشان کرے تو گرفتار کرلی جائے۔

ایک دن میں کسی رستوران میں چائے پی رہا تھا۔ دو تین کرسیاں میرے
قریب پڑی تھیں۔ ایک نوجوان لڑکی آکر میرے قریب بیٹھ گئی۔ یورپ میں

چونکہ یہ ایک معمولی بات ہے مجھ کو تعجب نہیں ہوا۔لیکن حسب عادت میں نے دریافت کیا کہ تم کو انگریزی آتی ہے یا نہیں۔معلوم ہوا کہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتی ہے۔سلسلہ گفتگو جاری رکھنے کے لئے اس قدر بہانہ کافی تھا۔برلن کے عام حالات پر کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔اس کے بعد اس نے کہا۔تم میرے ساتھ ہوٹل چلو۔میں سمجھ گیا کہ یہ عورت بازاری ہے۔میں نے کہا کہ کسی کے ساتھ غیر مقام پر جانا ہمارے اصول کے خلاف ہے لیکن میں تمہارے حالات دریافت کرنے کا مشتاق ہوں۔اگر تم تھوڑا وقت دے سکو تو اس کا معاوضہ کر دیا جائے گا۔اس نے پوچھا تم مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتے ہو۔میں نے کہا یہ بتاؤ کہ تم نے اس قسم کی زندگی کیوں اختیار کی ہے اور شادی کیوں نہیں کر لیتی ہو۔جواب ملا کہ میرا باپ انگریز تھا۔ماں جرمنی تھی۔جنگ عظیم کے کچھ دنوں بعد ماں باپ مر گئے۔ایک چچا میری پرورش کرتا رہا۔سن بلوغ کو پہنچی تو اس نے میری پرورش ترک کر دی۔اُس وقت یہاں افلاس کا بہت زور تھا۔کھانے پینے کو لوگ محتاج ہو رہے تھے۔اکثر آلو کے چھلکے اُبال کر اس پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے بیمار پڑ گئے میرے لئے کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔اس لئے مجبوراً یہ پیشہ اختیار کیا۔اب میرے ساتھ کوئی شادی نہیں کرتا۔اگر موقع ہو تو ضرور نکاح کر لوں۔میری آمدنی کا اوسط دو سو روپیہ ماہانہ کے قریب ہے۔کچھ رقم بڑھاپے کے لئے پس انداز کرتی ہوں۔جاڑوں کا زمانہ اکثر بیکاری میں گزرتا ہے کیونکہ اجنبی مسافر اُس وقت بہت کم آتے ہیں۔

برلن کے بازار

ایک مشہور بازار اونٹر ڈن لندن ایک میل لمبا ہے اسکے بیچ میں چوڑی روش ہے۔جس کے دونوں طرف

لیمو کے درخت ہیں۔ اِسی مناسبت سے سڑک کا نام رکھا گیا ہے۔ یعنے لیمو کے درختوں کی سڑک درختوں کے سایہ میں کرسیاں اور بنچیں پڑی ہوئی ہیں۔ اکثر لوگ آرام لینے یا سیر کرنے کی خاطر یہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ نگہبان کو کچھ فیس دینی پڑتی ہے۔ دوسرا شاندار بازار پوس دام پلاز ہے۔ یہ ایک بارونق چوراہا ہے۔ جہاں ہر قسم کا مجمع رہتا ہے۔ سڑکیں چوڑی ہیں۔ اِس لئے ہجوم سے تکلیف نہیں ہوتی۔

بازاروں میں رات کو تین بجے تک چہل پہل اور رونق رہتی ہے۔ لیکن دکانیں شام کو چھ بجے قانوناً بند ہوجاتی ہیں۔ اس کے بعد خرید فروخت داخل جرم ہے۔ البتہ کھانے پینے کی دکانیں کھلی رہتی ہیں۔

ایک خاص انتظام

مجمع کو قابو میں رکھنے کے لئے ایک خاص انتظام ہے۔ بڑے بڑے چوراستوں پر چوپہل قندیلیں تاروں میں لٹکی ہوئی ہیں۔ ہر جانب تین رنگ کی روشنی تھوڑے تھوڑے وقفہ سے خود ہو جاتی ہے لوگ روشنی کو دیکھ کر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں روشنی زرد رنگ کی ہو تو مطلب یہ ہے کہ آہستہ چلو راستہ بند ہونے والا ہے۔ اس کے بعد ہی روشنی سُرخ ہوجاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ٹھہر جاؤ راستہ بند ہوگیا۔ چنانچہ تمام مجمع ٹھہر جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد زرد روشنی ہوتی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ راستہ کھلنے والا ہے۔ چلنے کے لئے تیار ہوجاؤ۔ اِس کے بعد ہی سبز روشنی ہوتی ہے۔ جس پر آمد و رفت شروع ہوجاتی ہے۔ اس انتظام میں خوبی یہ ہے کہ پہلے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اب راستہ بند ہونے والا ہے یا کھلنے والا ہے۔

آٹو بفے

ایک خاص قسم کا رسٹوران جس کو آٹو بفے کہتے ہیں لائق تذکرہ ہے۔ ایک بڑی دکان ہوتی ہے الماریاں لگی ہوئی ہیں۔ مختلف قسم کی خورد و نوش کی چیزیں کاغذ کی تشتریوں میں رکھی ہوتی ہیں۔ ہر چیز کی قیمت چھوٹی چھوٹی تختیوں پر لگی ہوئی ہے۔ الماری میں ایک طرف سوراخ ہے اگر مقررہ قیمت اس سوراخ میں ڈال دی جائے تو مطلوبہ چیز خود بخود پھسلتی ہوئی ایک خاص راستہ سے باہر نکل آتی ہے۔ اسی طرح بیئر لیمونیڈ وغیرہ کے نل لگے ہوئے اور کانچ کے گلاس رکھے ہوئے ہیں۔ جو چیز پینی ہو اس نل کے قریب کے سوراخ میں مقررہ سکہ ڈالدو اور گلاس نل کے سامنے لگادو ایک گلاس بھر کر وہ چیز خود بخود آجائے گی نہ کسی سے کچھ مانگنے کی حاجت ہے اور نہ کسی کو قیمت ادا کرنے کی ضرورت۔ اس قسم کا رسٹوران پہلی دفعہ بوداپسٹ میں دیکھا تھا۔ اس انتظام میں خوبی یہ ہے کہ وقت ضائع نہیں ہوتا ورنہ عام طور پر دکانوں میں پندرہ منٹ ضرور لگ جاتے ہیں۔

رسٹوران

برلن میں کھانے پینے کی دکانیں کثرت سے اور اچھی ہیں اکثر دکانوں میں اخبار اور رسالے رکھے رہتے ہیں نشست کا انتظام بھی اچھا ہے۔ اعلیٰ قسم کے گدّے دار کرسیاں اور صوفے ایک عام بات ہے بعض دکانوں میں گانا بھی ہوتا رہتا ہے۔ لوگ عام طور پر فرصت کا وقت ان دکانوں میں گزارتے ہیں۔ تفریح بھی ہوتی ہے اور تبادلہ خیالات بھی۔ انگلستان میں یہ بات نہیں ہے کیونکہ وہاں کے لوگ اکثر خاموش رہنا پسند کرتے ہیں۔ موسم گرما میں لب سڑک سائبان کے نیچے ڈال دی جاتی ہیں بعض رسٹوران ایسے ہیں کہ وہاں شام کے وقت آسمان کے نیچے کھلی ہوا میں بیٹھنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کرال گارڈن میں ایک رسٹوران

اس قسم کا ہے۔شام کے وقت بہت مجمع رہتا ہے۔ بینڈ بھی بجتا ہے ۔ اور رقص و سرود بھی ہوتا ہے۔ بیچ میں ناچ کے لئے جگہ محفوظ رکھی گئی ہے اکثر مہمان ناچ رہے تھے۔ یورپین تہذیب کے لحاظ سے جس کو ناچ نہ آئے وہ کنندۂ ناتراش ہے۔کھانا عام طور پر اچھا ہوتا ہے ۔ بڑی دوکانوں میں انگریزی داں خادم مل جاتے ہیں۔ ورنہ اجنبیوں کو زبان کی وجہ سے کھانا مانگنے میں دقت ضرور ہوتی ہے۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مانگو کچھ اور ملتا کچھ ہے۔

ہوٹل

برلن کے ہوٹل بحیثیت مجموعی کم خرچ اور آرام دہ ہیں۔اگر زیادہ دن قیام کرنا ہو تو پن سیون میں ٹھہرنا مناسب ہے۔جس پن سیون میں ہم ٹھہرے تھے اس عمارت میں متعدد کاروباری لوگ بھی کرایہ سے رہتے تھے۔ چنانچہ ہمارے کمرے کے پہلو میں ایک دوسرا کمرہ تھا جس میں ایک ڈاکٹر رہتا تھا۔ایک دفعہ رات کے وقت غلطی سے میں نے ڈاکٹر کے دروازے پر گھنٹی بجائی۔نصف شب گذر چکی تھی ۔ڈاکٹر کی میم پریشان ہوکر بستر سے اٹھی اور دروازہ کھولا۔میں سمجھتا ہوں کہ اس نے اس امید کے ساتھ دروازہ کھولا ہوگا کہ کوئی بیمار ہاتھ آیا۔ میم صاحبہ کو دیکھ کر میں اپنی غلطی کو سمجھ گیا اور ہوٹل کا دروازہ پوچھا۔ وہ انگریزی نہیں جانتی تھی۔لیکن بہت مایوسی کے ساتھ اشارہ سے پہلو کا دروازہ بتایا۔ اور اپنا دروازہ بند کرلیا۔ ہر مسافر کو تین کنجیاں دیجاتی ہیں۔ ایک کنجی بیرونی پھاٹک کی ہوتی ہے ۔ دوسری ہوٹل کے اندرونی دروازے اور تیسری مسافر کے کمرے کی۔ کمرے کی کنجی حسب دستور چیمبر میڈ کو دینا چاہیے یا آفس میں چھوڑ دینی چاہیئے تاکہ تمھارے غیاب میں کمرے کی صفائی ہوسکے بقیہ دونوں کنجیاں اپنے پاس رکھنی چاہئیں ۔بیرونی پھاٹک کھولنے کی اس ہوٹل میں خاص ترکیب تھی۔ خادمہ نے عملی طور پر دروازہ بند کرکے یہ

ترکیب بتلادی تھی اگر یاد نہ رہے تو مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ کواڑوں میں دو سوراخ تھے ایک اوپر اور دوسرا نیچے۔ پھاٹک کھولنے کی ترکیب یہ تھی کہ پہلے نیچے کے سوراخ میں کنجی دو دفعہ پھرائی جاتی تھی اور پھر اوپر کے سوراخ میں ایک دفعہ اگر اس طریقہ پر عمل نہ کیا جائے تو پھاٹک کسی طرح نہ کھلتا تھا ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں تنہا اور رات کو بارہ بجے کے قریب ہوٹل واپس آیا۔ پھاٹک کھولنے کی کوشش کی لیکن ترکیب یاد نہ رہی۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ سڑک پر سے دو ایک آدمیوں کو امداد کے لئے بلایا۔ مگر ان کو بھی ترکیب معلوم نہ تھی۔ بالآخر مایوس ہوکر کسی دوسرے ہوٹل میں رات بسر کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ کہ ایک میم صاحبہ جو اس عمارت کے کسی حصہ میں کرایہ سے رہتی تھیں آگئیں۔ ان کے پاس کنجی بھی تھی اور ترکیب بھی معلوم تھی۔ انھوں نے پھاٹک کھولا ان کے ساتھ میں بھی داخل ہو گیا۔ زینوں پر روشنی کا انتظام اچھا ہے۔ پھاٹک کے قریب روشنی کا بٹن ہے اس کو دبا دیا جائے تو پہلی منزل پر روشنی ہو جاتی ہے دوسری منزل پر پہنچنے پر یہ روشنی خود بخود خاموش ہو جاتی ہے۔ وہاں دوسرا بٹن لگا ہوا ہے اس کو دبا دو تو اس منزل پر روشنی ہو جاتی ہے اسی طرح سلسلہ بسلسلہ آخری منزل تک جا سکتے ہیں۔ یہ سہولت دوسرے شہروں میں کم دیکھی گئی۔

عجائب خانے

برلن میں دلچسپی اور سیر و تفریح کے بہت سے سامان ہیں اس کے علاوہ علمی معلومات اور تحقیقات کا بھی مرکز ہے غیر ممالک کے طالب علم کثرت سے تکمیل تعلیم کے واسطے یہاں آتے ہیں جرمن لوگ عام طور پر ذہین اور تحصیل علم کے شوقین ہوتے ہیں۔ چنانچہ علم موسیقی کو جس درجہ کمال پر انھوں نے پہنچا دیا ہے اس کی نظیر یورپ میں نہیں ملتی۔ ایک

عجائب خانہ ایسا ہے کہ اس میں قدیم زمانے کے طرح طرح کے آلات موسیقی جمع کئے گئے ہیں۔ قدردانان موسیقی کے واسطے یہ ایک دلچسپ مقام ہے۔ اس کے علاوہ متعدد عجائب خانے ہیں جن میں اہل کمال کی نقاشی کے نمونے اور دوسری اشیاء جمع کی گئیں ہیں۔ ایک عجیب چیز دیکھنے کے لائق پلانی ٹیریم ہے جس میں مشین اور آئینوں کی مدد سے آسمان کی کیفیت دکھائی جاتی ہے۔

تھیٹر

شب کی تفریح کے لئے سینما تھیٹر اور ناچ گھر بکثرت ہیں ظاہر ہے کہ جب تک کسی ملک کی زبان سے واقفیت نہ ہو وہاں کے تھیٹر مسافر کے لئے چنداں دلکش نہیں ہوتے اور نہ کوئی لطف آسکتا ہے۔ تاہم بعض تھیٹر ایسے ہیں جس سے مسافر باوجود ناواقفیت زبان لطف اٹھا سکتا ہے۔ برلن میں اس قسم کے دو تھیٹر اسکالا اور ونٹر گارٹن ہیں۔ ہر سیاح کو چاہئے کہ ایک دفعہ ان کو ضرور دیکھے۔ علاوہ موسیقی اور ڈرامہ کے بہت سے کرتب اعلیٰ درجہ کے ایسے دکھائے جاتے ہیں جن کا تعلق محض دیکھنے سے ہے۔ مثلاً ایک شخص کو دیکھا کہ فڈل پچاسوں ترکیبوں سے بجاتا تھا مشکل سے مشکل پوزیشن اختیار کر کے فڈل نوازی کی داد لیتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کر لئے۔ اور اسی حالت میں فڈل کو اس طرح بجایا کہ ناظرین وسامعین محو حیرت رہ گئے۔ چار شلنگ میں آرام کی نشست ملسکتی ہے۔ ہر مہینہ پروگرام تبدیل ہوتا ہے۔ کھانے پینے کا انتظام جس قدر برلن کے تھیٹروں میں دیکھا گیا ویسا دوسرے شہروں میں نہیں ہے۔ یہ لوگ کھاتے بھی زیادہ ہیں۔ تماشہ شروع ہونے کے قبل ہی کھانے کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں پھر انٹرول میں بھوکوں کی طرح رفرشمنٹ کی دوکان پر ٹوٹ پڑتے ہیں تھیٹر کے اندر بھی کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لاتے ہیں اور تماشہ دیکھتے وقت کھانے میں

کوئی تکلف نہیں کرتے۔ البتہ اعلیٰ درجہ کے لوگ اس بات کو کسی قدر معیوب سمجھتے ہیں۔ لیکن متوسط درجہ کے لوگ کسی قاعدے کے پابند نہیں۔ چنانچہ ریلوں میں بھی کھانا ساتھ رکھتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ انگلستان میں اس طریقہ کو بُرا سمجھتے ہیں۔ موسیقی اور اندرونی انتظام و ترتیب کے لحاظ سے برلن کے تھیٹر یورپ بھر میں بہترین سمجھے جاتے ہیں۔

سینما سینما بھی عام طور پر اچھے ہوتے ہیں۔ جرمن فلموں کے علاوہ امریکہ کے فلم بھی دکھائے جاتے ہیں۔ جرمنی کا بنا ہوا فلم خوبیوں میں امریکہ کے فلموں سے کسی طرح کم نہیں۔ یورپ میں سینما کا پروگرام ہندوستان سے مختلف ہوتا ہے۔ اکثر دوپہر سے ہی تماشہ شروع ہو جاتا ہے اور مسلسل بلا وقفہ کے ہوتا رہتا ہے جس وقت جی چاہے چلے جاؤ۔ جس مقام پہ شروع کیا تھا وہاں ختم کر کے چلے آؤ۔ نوجوان عورتیں تھیٹر اور سینما میں سگرٹ اور چاکلیٹ بیچتی پھرتی ہیں۔ جرمنی زبان میں سگریٹ کو زگرتین اور چاکلیٹ کو شکولادے کہتے ہیں۔

ناچ گھر برلن میں ناچ گھر کثرت سے ہیں۔ سرشام سے رات کے تین بجے تک ان ناچ گھروں میں چہل پہل رہتی ہے برہنہ اور نیم برہنہ عورتیں مختلف قسم کے ناچوں سے حاضرین کو محظوظ کرتی ہیں۔ برہنہ ناچ روز بروز مقبول ہوتا جاتا ہے۔ نیم برہنگی تو ایک عام بات ہے لیکن بعض تھیٹروں اور ناچ گھروں میں کم سے کم ایک پروگرام ایسا بھی ہوتا ہے جس میں نوجوان عورتیں بالکل برہنہ ہو کر ناچتی ہیں۔ بعض ستر پوشی کے خیال سے شتر مرغ کے پر یا اسی قسم کی کوئی اور چیز استعمال کرتی ہیں۔

فیشن نیا خیال نیا کچھ ضرر نہیں   عریانی اک لباس ہے جو پردہ در نہیں

اِن پیشہ ور عورتوں کے علاوہ حاضرین کی دلچسپی کے واسطے ایسی نوجوان عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کا خاص کام ہی ہوتا ہے کہ مہمانوں کو اپنی طرف مائل کرکے شراب بکوائیں۔ ہر بوتل پر جو اس طرح بکوائی جائے اِن کو کمیشن ملتا ہے۔
یہ ناچ گھر مہنگے بھی ہیں اور سستے بھی۔ عام طور پر چار شلنگ میں کافی تفریح ہو سکتی ہے۔ فرنیچر و فرش اچھا ہوتا ہے۔ اکثر مکان آراستہ ہیں بعض میں کھانے پینے کا بھی انتظام ہے۔ لیکن مہنگا ہوتا ہے۔ ایک ناچ گھر ایسا دیکھنے میں آیا کہ ایک طرف بہت سی میزیں لگی ہوئی ہیں۔ ہر میز کے مقابلہ میں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ ہر میز پر ایک ٹیلیفون مع نمبر لگا ہوا ہے۔ اِسی طرح مسافروں کی میزوں پر بھی ٹیلیفون لگا ہوا ہے۔ اگر کوئی لڑکی پسند ہو تو ٹیلیفون ملا کر اس کو بُلا سکتے ہیں مگر ایسی عورتوں سے ہشیار رہنا چاہئے کیونکہ یہ سب پیسے لوٹنے کی فکر میں رہتی ہیں اس ناچ گھر میں ایک حبشی کو یورپین لڑکی کے ساتھ ناچتے ہوئے دیکھا ایمان کی بات تو یہ ہے کہ خوب ناچتا تھا لیکن کالے اور گورے کا جوڑ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا۔ ؎

سفیدے بود زنگی سیہ تر ز زاغ ۔۔۔ مہ نو چو در دست زنگی چراغ

البتہ اس بات سے خوشی ضرور ہوئی کہ اِن ناچ گھروں میں رنگ کا تعصب نہیں ہے۔ یہاں اکثر دولت مند سیاح تفریح کے لئے آیا کرتے ہیں اِن لڑکیوں کی خوب بن آتی ہے۔ قدر دانانِ حسن دل کھول کر روپیہ اٹھاتے ہیں۔ یہ عصمت فروش عورتیں ایک رات میں جس قدر کما لیتی ہیں بہت سے باکمال لوگ دنوں میں بھی اتنا نہیں کما سکتے۔ فردوسی نے بالکل صحیح کہا ہے۔ ؎

آسماں در دہر دونان را کند دائم مدد ۔۔۔ زاں سبب انگشت کوچک را طلب انگشتری ست

ہم نے بہت سے اہل ہنر اور صاحب علم و فضل کو دیکھا کہ تلاش روزگار میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ مگر کوئی جھوٹوں بھی نہیں پوچھتا۔ چند ہی روز ہوئے جو ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ کوئی بی اے پاس بنگالی نان شبینہ سے محتاج ہو کر بازار میں جوتے صاف کرنے کی پالش لئے بیٹھا تھا۔ آیندہ روند سے کہتا تھا کہ بی اے پاس سے جوتا صاف کروالو۔ مگر شومی قسمت نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا پولیس کو شبہ ہوا کہ اس حیثیت کے آدمی نے ایسا ذلیل پیشہ کیوں اختیار کیا ہے فوراً اس کو گرفتار کر لیا پھر خدا معلوم بیچارے پر کیا گزری۔ زمانہ کی کجرفتاری کو دیکھو کہ بدکردار اور ناہنجار ہستیوں کو آرام سے رکھتا ہے اور اہل ہنر کو یوں ذلیل و خوار کرتا ہے ایران کے مشہور شاعر رشید الدین وطواط نے دنیا کے اس نشیب و فراز کی شکایت یوں کی ہے۔

فریاد ازیں جہاں کہ خردمند را در او
بہرہ بجز نوائب و حرماں نمی رسد
جہال در تنعم و ارباب فضل را
بے صد ہزار غصہ یکے نان نمی رسد
جاہل بمجلس اندر و عالم برون در
جوید بہ حیلہ راہ و بدامان نمی رسد

سب سے بہتر اور مہذب ناچ گھر ہاؤس فاٹرلینڈ برلن کے مشہور محلہ پوسٹ امر پلاٹز میں ہے یہاں کوئی چیز خلاف تہذیب نہیں ہے چنانچہ اکثر سیاح اپنی عورتوں کو ساتھ لیجایا کرتے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ اس شان کا کوئی ناچ گھر یورپ میں نہیں ہے۔ یہ ایک عالیشان اور بہت آراستہ عمارت ہے،

داخلہ کے لئے ایک مارک دینا پڑتا ہے۔ اِس گھر میں آٹھ مختلف قہوہ خانے ہیں تعریف یہ ہے کہ جس ملک کے نام سے جو قہوہ خانہ منسوب ہے اس میں اسی ملک کے موسیقی تمدّن اور لباس وغیرہ کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ایک قہوہ خانہ ایسا ہے کہ اس میں بویریا کے کوہ الپس کا منظر بہت خوبی کے ساتھ دکھایا ہے مصنوعی پہاڑ اصلی معلوم ہوتے ہیں کچھ دیر کے لئے اندھیرا ہو جاتا ہے اور مصنوعی طور پر بارش کا سماں پیدا کیا جاتا ہے۔ بجلی بھی چمکتی ہے۔ گرج بھی ہوتی ہے اصل اور نقل میں بہت کم فرق محسوس ہوتا ہے۔ بویریا کی طرف کے نوجوان مرد اور لڑکیاں اپنے قومی لباس میں قہوہ خانہ کی رونق بڑھاتے ہیں۔ قومی ناچ اور گانا بہت دل آویز طریقہ پر ہوتا رہتا ہے۔ ایک ترکی قہوہ خانہ مشرقی وضع کے فرش فروش سے آراستہ ہے۔ قدیم زمانہ کا ترکی لباس پہنے ہوئے شاگرد پیشہ قہوہ اور شربت تقسیم کرتے پھرتے ہیں۔ قسطنطنیہ کا بہترین منظر شاخ زریں اس قہوہ خانے میں بہت خوبی کے ساتھ دکھلایا گیا ہے۔ سب سے اچھا قہوہ خانہ ویانہ کا ہے جس میں ویانا کا خوبصورت منظر بہت کمال کے ساتھ دکھایا گیا ہے دریائے ڈینیوب کا نظارہ اور چلتی ہوئی ٹریم گاڑیاں اور بازاروں کی روشنی بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ تمام چیزیں جرمن کاریگری اور صناعی کا ثبوت ہیں۔ ایک قہوہ خانہ ہسپانیہ کا ہے نوجوان لڑکیاں اپنے قومی لباس میں مہمانوں کی آؤ بھگت کرتی ہیں۔ الغرض یہ ناچ گھر ایک عجیب وغریب مقام ہے لطف یہ کہ سارا تماشا پانچ چھ مارک میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سب سے پُر لطف تماشہ تو یہ دیکھا کہ ایک پستہ قد آدمی دراز قد عورت کے ساتھ ناچ رہا تھا سب کی نظریں اس جوڑے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ حضرت عورت کے پیٹ میں سر دیے ہوئے ہیں بعض دفعہ سینما میں اس قسم کی

تصویریں تبائی جاتی ہیں۔ سبحان اللہ! کیا خوب نشیب و فراز ہے۔ ان حضرات کو چاہیئے کہ ہر وقت اپنی بغل میں ایک "فولڈنگ" یعنی تہ ہونے والی سیڑھی رکھا کریں کیونکہ

یار باید سرو قدا تا نہ چنداں سر دفد
کز برائے بوسہ او نردباں باید نہاد

لونا پارک

برلن میں عیش و عشرت کے بہت کچھ سامان موجود ہیں اسی وجہ سے ہزاروں کی تعداد میں غیر ملک کے لوگ اس شہر میں روزانہ آتے ہیں۔ شام کے وقت تفریح کے واسطے لونا پارک بہت اچھا مقام ہے۔ موسم گرما میں یہاں خوب رونق رہتی ہے۔ متعدد دکانیں رستوران اور جوئے خانے کھلے رہتے ہیں۔ ناچ گھر اور تیرنے کے واسطے ایک بڑا حوض بھی ہے۔

مس برلن کا انتخاب

جس روز ہم اس باغ کی سیر کو گئے۔ وہاں حسن کی قدر دانی کا ایک خاص میلہ تھا اور مس برلن کا انتخاب ہونے والا تھا۔ بہت سی خوبصورت نو عمر لڑکیاں جن کو اپنے حسن پر ناز تھا یہاں جمع تھیں ایک اونچے پلیٹ فارم پر لڑکیاں قطار باندھ کر چکر لگاتی تھیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں نمبر کی تختی تھی۔ جو لوگ جمع تھے ان کو مطبوعہ فارم دیدیے گئے تھے تاکہ اپنی رائے کے مطابق خوبصورت لڑکی کا انتخاب کریں۔ ہم کو بھی ایک فارم ملا تھا لیکن سچ پوچھو تو اس کام کے لئے بھی مہارت کی ضرورت ہے بہت گھور گھور کر ان پریوں کو دیکھا۔ دوسرے لوگ بھی ٹکٹکی باندھے ہوئے تھے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　　اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

نظر کمبخت کہیں نہ ٹھہری یا ٹھہری تو سب پر ٹھہری۔ ہر لڑکی اپنی جگہ حسن کی مورت نظر آئی۔ حیران تھے کہ کس کو شہزادی قرار دیں۔ نظر کی نارسائی سے عاجز ہوئے تو آلل ٹپو ایک لڑکی کے نام پر دستخط کر دیے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نتیجہ کیا نکلا کاش کہ ہماری منتخب کردہ لڑکی کامیاب نکلتی اور ہم کو اس کا علم بھی ہو جاتا تو آج ہم اپنے کو اس فن کا ماہر خیال کرتے۔

حکومت اٹلی نے خوبصورتی کے مقابلہ کو اپنے ملک میں مسدود کر دیا ہے۔ یہ طریقہ اخلاق عامہ کے لئے مضرت بخش ثابت ہوا۔ جو نوجوان لڑکیاں اس مقابلہ میں شریک ہوتی ہیں ان کو اپنے حسن کے متعلق بڑا مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور خودستائی کے بیہودہ مرض میں اس درجہ مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ان کا دماغ ہر وقت ساتویں آسمان پر رہتا ہے جو لڑکی کامیاب نکلتی ہے اس کی مسرت کے تو کیا کہنے۔ لیکن بعض ناکامیاب لڑکیوں کی دل شکنی ان کو ہر وقت مغموم رکھتی ہے۔ دوسرا بدنما پہلو اس مقابلہ کا یہ بھی ہے کہ اکثر دل پھینک عاشق مزاج نوجوان اس سند یافتہ حسن کی ملکہ کے فراق میں اپنا قیمتی وقت اور روپیہ ضایع کر دیتے ہیں۔ اس کے ماسوا اکثر ہوش و حواس کو بھی اپنے ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔ یورپ کے دارالمجانین ایسے پاگلوں سے بھرے ہوئے ہیں جنہوں نے محض عشق کے پیچھے عقل سلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ خدا محفوظ رکھے عشق بھی کیا بُری بلا ہے۔ ؎

فرہاد کوہ کن کی لی تو نے جان شیریں　　　اور قیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

ٹیر گارٹن

برلن کا سب سے بڑا باغ ٹیر گارٹن ہے لوگ تفریح کے واسطے بکثرت جاتے ہیں۔ درختوں کے نیچے جابجا بنچیں

پڑی ہوئی ہیں۔ عشق و محبت کے دلچسپ اسرار یہاں دکھائی دیں گے۔ اسی باغ کے ایک گوشہ میں چڑیا گھر ہے۔ ایک طرف اکیوریم ہے جس میں سمندر کی عجیب و غریب مچھلیاں اور دوسرے زندہ جانور رکھے گئے ہیں۔ اس کی سیر بھی ضرور کرنی چاہئے۔ عجیب شان کبریائی نظر آتی ہے۔ سمندر کے اندر ہماری نظروں سے پوشیدہ کیسی حیرت ناک مخلوق موجود ہے۔

کھیل کود اور تفریح کے مقامات

کھیل کود کے مقامات بھی خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہیں۔ برلن سے کچھ فاصلہ پر ایک مقام گرونی والڈ ہے۔ اس نواح میں ایک جگہ استادین کے نام سے موسوم ہے یہ کھیل کود کا مرکز ہے۔ ایک بہت بڑا حوض بنا ہوا ہے جس کے چاروں طرف ساٹھ ہزار آدمی کی نشست کا انتظام ہے یہاں ہر قسم کے کھیل کود کا بندوبست ہے۔ نہانے کے واسطے حوض بھی موجود ہیں۔ ان میں عورت مرد ایک ہی جگہ نہاتے ہیں۔ ساتھ نہانے کا رواج یورپ میں عام ہو گیا ہے۔ چنانچہ برلن کے قریب لب دریا یہ تماشا دیکھا کہ ریت میں ہزارہا مرد اور عورت دھوپ میں سینکتے پڑے تھے۔ یہ سب لوگ نہانے کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ جس میں تقریباً آدھا جسم ننگا رہتا ہے۔ لب دریا نہانے کے مقام پر کھانے پینے کی دکانیں بھی ہوا کرتی ہیں چھوٹی چھوٹی چھولداریاں بکثرت کرایہ پر ملتی ہیں۔ اتوار کے دن مجمع کثیر ہوتا ہے۔ اور بڑی رونق ہوتی ہے۔

استادین میں تین حوض برابر ہیں۔ ایک میں مدرسہ کی لڑکیاں نہارہی تھیں۔ نہانے میں فٹ بال میچ بھی ہو رہا تھا۔ بقیہ دو حوضوں میں عوام نہارہے تھے۔ عورت مرد ایک دوسرے پر پانی پھینکتے اور ہنسی کھیل میں

مصروف تھے۔ تعارف کی ضرورت نہ تھی۔ ایک سن رسیدہ نگران کار عورت نے
ہم سے اشاروں میں کہا کہ تم بھی کرایہ پر نہانے کا لباس لیکر حوض میں غوطہ لگاؤ
قریب ہی میں رسٹوران ہے۔ کھانے کے وقت ایک حیرتناک منظر دیکھا نہانے
سے فارغ ہو کر ایک نوجوان عورت سیدھی رسٹوران میں آئی۔ کپڑوں سے پانی
ٹپک رہا تھا۔ اتفاق سے ہمارے مقابل بیٹھی۔ کپڑوں کی پوٹلی ساتھ تھی اب
تماشہ سنو کہ لباس کس طرح تبدیل کیا جاتا ہے۔ جلدی جلدی پوٹلی کھولی۔ جس
کپڑے میں لباس بندھا ہوا تھا اس سے پردے کا کام لیا گیا۔ رسٹوران کی
خادمہ نے ایک طرف پردہ پکڑ لیا۔ عورت نے نہانے کا لباس بلا تکلف اُتار کر
معمولی کپڑے پہنے۔ سردی کی وجہ سے بید کی طرح کانپ رہی تھی۔ سوال یہ پیدا
ہوتا ہے کہ محض رسمی طور پر ایک جانب پردہ کر لینے سے کیا حاصل! دوسری
طرف سے سب کچھ آئینہ کی طرح روشن تھا۔ غالباً جواب یہی ملیگا کہ نیک نیتی
جملہ عیوب کی پردہ پوشی کے لئے کافی ہے۔

ننگوں کا کلب

سائنس کی ترقی اور جسمانی صحت کا خیال جرمنی
میں دیوانگی تک پہنچ گیا ہے برلن سے تقریباً تیس میل
کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا باغ ہے۔ داخل ہونے کے واسطے کچھ فیس لیجاتی
ہے اس کا مالک ایک ماہر فن ڈاکٹر ہے۔ باغ میں ایک جانب دریا ہے
لیکن درختوں کی آڑ کی وجہ سے داخلہ کے مقام پر سے دکھائی نہیں دیتا۔
دریا کے کنارے عورت مرد بالکل برہنہ دھوپ میں پڑے سینکتے ہیں۔ اور
نہاتے ہیں۔ داخلہ کے مقام پر ڈاکٹر سے ملے۔ یہ شخص مادرزاد برہنہ تھا۔ اس
کے ساتھ اس کی نوجوان لڑکی بھی تھی جس کے جسم پر مطلق کوئی کپڑا نہ تھا۔ ڈاکٹر
صاحب نے اپنی بیٹی سے ہمارا تعارف کرایا۔ اور کہا کہ آپ لوگ کپڑے اُتار کر

لبِ دریا جا سکتے ہیں۔ ہم نے کہا ہم کو ایسی عادت نہیں۔ ہم محض تماشا دیکھنے کو آئے ہیں۔ ڈاکٹر نے جواب دیا کہ قاعدہ کی رُو سے آپ کو لباس پہنے ہوئے اندر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ سب کو ایک حالت میں ہونا چاہئے یہاں بڑے بڑے امریکن لکھپتی ننگے ہو جاتے ہیں اور واپسی کے وقت کہتے ہیں کہ ہم نے دنیوی بہشت دیکھ لی۔ اس موقع پر ہماری پارٹی میں اختلاف آراء ہوا۔ ہم چار آدمی تھے۔ دو کی رائے تھی کہ اتنی دور آئے ہو تو اس تماشہ کو بھی دیکھ لو۔ باقی دو کپڑے اتارنے پر رضامند نہ تھے۔ ڈاکٹر نے کہا میں ایک چھولداری دیتا ہوں جو لوگ دریا پر جانا نہیں چاہتے وہ اس میں ٹھہر سکتے ہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دو آدمی چھولداری میں ٹھہرے رہے اور دو آدمی کپڑے اُتار کر دریا کے کنارے پر گئے۔

ہمارے ساتھی ننگے ہونے لگے تو ہم منہ پھیر کر بیٹھ گئے اور تاکید کر دی کہ واپس آنے لگو تو دور ہی سے آواز دیدینا تاکہ ہم تیار ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ واپسی کے وقت آواز آئی "بھائیو! منہ پھیر لو دو ننگے آ رہے ہیں"۔ کھانے کا وقت قریب آیا تو آرڈر دینے پر دو نوجوان برہنہ عورتیں کشتیوں میں کھانے کی چیزیں لگا کر چھولداری میں لائیں مطلق ان کو حجاب نہ تھا۔ حجاب کی وجہ بھی نہ تھی کیونکہ ان کا اعتقاد تو یہ ہو گیا ہے۔

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں اُلٹا سیدھا

کھانے کا آرڈر جس طرح دیا گیا۔ وہ قصہ بھی لائق تذکرہ ہے۔ ایک بجے کے قریب بھوک کا زور ہوا۔ ہمارے جو ساتھی سیر کرنے کے لئے دریا کے کنارے پر گئے ہوئے تھے کچھ ایسے بیخود رہے کہ واپسی کا نام بھی نہ لیا۔ میرے شریک حال نے

کہا۔ بہتر ہوگا کہ تم پتلون اُتار دو مگر قمیص پہنے رہو اور رستوران تک جا کر کھانے کا آرڈر دیدو۔ اِس وضع کو اختیار کرنے میں مجھ کو پس و پیش تھا۔ اور چاہتا تھا کہ مشورہ دینے والا خود ہی اپنے مشورہ پر کاربند ہو مگر وہ حضرت مجھ سے بھی زیادہ قدامت پسند نکلے۔ پتلون تو ایک طرف وہ کوٹ اتارنے پر بھی رضامند نہ تھے۔ بالآخر ع قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند کا حساب ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ ضعف معدہ کی شکایت مجھ کو خالی پیٹ میں تکلیف دیتی تھی۔ میرے ساتھی کو چنداں بھوک کی پروا نہ تھی۔ بلکہ وہ سونے کی تیاری کرنے لگے۔ بدرجۂ مجبوری پتلون کو الگ کیا۔ صرف قمیص سے باہر نکلا اور بادل ناخواستہ دریا کی طرف چلا۔ چند قدم گیا تھا کہ ایک نگہبان نے جو لباس کے جھگڑے سے آزاد تھا آکر روک دیا اشاروں میں جو گفتگو ہوئی اس کا منشا یہ تھا کہ تہذیب کے آثار قدیمہ یعنی قمیص و بنیان کو جسم سے الگ کرو۔ اور نئی وضع اختیار کر کے اس دنیوی بہشت میں داخل ہو ورنہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہو۔ میں نے نبض پر ہاتھ رکھ کر یہ عذر کیا کہ بخار کی وجہ سے لباس نہیں اُتار سکتا لیکن اس کی تشفی نہ ہوئی۔ تب میں نے کہا کہ بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ اس نے کہا میں تمھارے کھانے کا انتظام کئے دیتا ہوں۔ اپنی جگہ واپس جاؤ۔ یہ انتظام جس شان کے ساتھ ہوا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ماں باپ مع اپنی نوجوان بیٹیوں کے بلاتکلف ننگے پھر رہے تھے جو لوگ دریا پر گئے انھوں نے دیکھا کہ کنارے پر کثرت سے مرد اور عورت برہنہ حالت میں سیر و تفریح میں مصروف تھے۔ دریا کی دوسری جانب ایک لو ۔کلب اسی قسم کا تھا۔ ہمارے دونوں ساتھی کشتی کے ذریعے اِس کلب میں بھی گئے۔ وہاں کے ڈاکٹر نے بڑی آؤبھگت کی۔ کہتا تھا کہ

ہمارے کلب میں چالیس سال سے زیادہ عمر والے کو نہیں لیتے۔ آپ ناحق دوسرے کلب میں ہو گئے۔ القصہ شام کو بسر مغرب وہاں سے واپس ہوئے۔ سنا ہے کہ اس کلب کے بعض ممبر ننگے دھڑنگے قریب کی آبادی میں چلے گئے تھے پولیس نے ان کو گرفتار کر لیا۔ تعجب کا مقام ہے کہ جو قوم مہذب اور شائستہ ہونے کی دعویدار ہے وہ اس معاملہ میں ترقی معکوس کر رہی ہے سچ ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دوہرایا کرتی ہے جب دنیا شروع ہوئی تو اس وقت بھی لوگ ننگے ہی رہتے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ ننگا رہنا تندرستی کے لئے بے حد مفید ہے۔

سنا جاتا ہے کہ فرانس والے بحر روم کے ایک جزیرہ میں بالکل اسی نمونہ پر ایک شہر آباد کرنے والے ہیں۔ لباس کا جھگڑا اٹھا دیا جائے گا۔ دیکھنا چاہئے کہ یہ خیال کس حد تک کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ برہنہ کلب سے واپس ہوتے وقت راستہ میں ایک رسٹوران ملا۔ وہاں چائے پینے کی خاطر کچھ دیر ٹھہرے جو تماشا دیکھتے ہوئے آئے تھے اس کے متعلق بہت کچھ ردّ و قدح کی۔ مختلف خیالات نے مختلف نتائج پر پہنچایا۔ دیر زیادہ ہوئی تو ایک صاحب نے کہا اب اس قصہ کو ختم بھی کرو۔ ننگے رہتے ہیں تو رہنے دو۔ نقصان اٹھانے کے بعد خود ہی راستہ پر آجائیں گے۔ ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

خود ہم لوگوں کی پچاسوں باتیں اصلاح طلب ہیں۔ دوسروں پر اعتراض کرنے سے کیا حاصل۔ مجھے معلوم نہیں کہ عیسوی مذہب میں اس بے حیائی کے متعلق کیا احکام ہیں۔ لیکن مذہب اسلام نے صاف اور قطعی طور پر اس طرح

ننگے رہنے کی ممانعت کی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ربانی یوں ہوتا ہے

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (النور رکوع ۴)

(ترجمہ۔ اے پیغمبر مسلمانوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ اِس میں ان کی زیادہ صفائی ہے۔ لوگ جو کچھ بھی کیا کرتے ہیں اللہ کو سب خبر ہے۔ اور اے پیغمبر مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیں۔ مگر جو اس میں سے چار و ناچار کھلا رہتا ہے)

واپسی کے وقت ایسے محلہ میں سے گزرے جہاں امریکن وضع کی سربفلک عمارتیں بنی ہوئی تھیں یہ شوق حال میں پیدا ہوا ہے۔

پوسدام برلن کے باہر دو ایک مقامات خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہیں۔ ہر سیاح کو چاہئے کہ ان کی سیر کرے سب سے اہم مقام پوسدام ہے جو برلن سے تقریباً سولہ میل کے فاصلہ پر دریائے ہون کے کنارے آباد ہے۔ قصبہ تو چھوٹا ہے لیکن کئی باتوں سے خاص حالت رکھتا ہے۔ اول تو یہ کہ موقع بہت خوبصورت ہے۔ دریا کی متعدد شاخیں تالاب کی شکل میں آبادی کی رونق کو بڑھاتی ہیں۔ دوسرے سرسبز اور خوشنما باغ ہیں قدرتی مناظر نہایت دلکش ہیں۔ یہاں کے شاہی محلات بھی قابل دید ہیں ان میں سنسوسی پیلیس ممتاز حیثیت رکھتا ہے اسے فریڈرک اعظم نے بنوایا تھا صحن میں ایک پارک ہے اس میں ایک فوارہ عجیب و غریب ہے۔ رہبر کہتا تھا کہ اس فوارے میں اتنی قوت ہے کہ پانی سوا سو فیٹ بلندی تک جاتا ہے

لیکن روزانہ پوری قوت کے ساتھ نہیں چھوڑا جاتا۔ اس قدر قوت کا فوارہ شاید
تمام یورپ میں نہیں ہے ہماری موجودگی میں بھی فوارہ چل رہا تھا اور اچھی بلندی
تک پانی جا رہا تھا۔ محل میں داخلہ کچھ فیس ادا کرنے پر ملتا ہے روزانہ سینکڑوں
آدمی دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ اندر داخل ہونے کے قبل بہت بڑی اور ڈھیلی
سلیپر پہنی پڑتی ہیں۔ جن سے پاؤں ہاتھی کے سے معلوم ہونے لگتے ہیں اور
چلنے میں تکلف ہوتا ہے اس موقع پر آپس میں بڑی ہنسی اور مذاق رہتا ہے
محل کی سیر رہبر کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جو مختلف زبانوں سے واقف ہوا کرتا ہے
آرایش کا ساز و سامان قابل دید ہے۔ بعض مقامات خاص دلچسپی کے ہیں مثلاً
قیصر کی خوابگاہ اور کھانے کا کمرہ وغیرہ۔ ایک بہت بڑا ہال ہے جس کی دیواروں
میں قیمتی اور کمیاب پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ برلن سے پوسدام جانے کے
کئی راستے ہیں۔ قریب ترین راستہ ریل سے ہے جو پوسدام بان ہاف
سے جاتی ہے۔ (جرمنی میں اسٹیشن کو بان ہاف کہتے ہیں۔) ہم لوگ موٹر کوچ
میں گئے تھے یہ طریقہ زیادہ دلچسپ ہے۔ برلن کی مشہور سڑک انسٹر ڈن لنڈن
سے موٹر کوچ روانہ ہوتی ہے۔ کُک کمپنی سے ٹکٹ خرید لئے تھے۔ بڑی شاندار
کی سواری تھی۔ مشہور مقامات جو راستہ میں ملتے ہیں رہبر اُن کو بتلاتا جاتا تھا کچھ
دور موٹر میں جانے کے بعد دریا ملتا ہے یہاں موٹر چھوڑ کر اسٹیمر میں سوار ہوتے
ہیں اس کا کرایہ ٹکٹ میں شامل ہے۔ دوسرے کنارے پر موٹریں تیار ملتی ہیں
شاہی محل جانے سے قبل ایک بڑے رستوران میں گئے وہاں کچھ کھایا۔ رونق
کی جگہ تھی۔ سیر سے فارغ ہو کر شام کو دوسرے راستہ سے واپس ہوئے۔
لب دریا عورت، مرد کثرت سے نہا رہے تھے اس روز ہوا کسی قدر سرد تھی ہم
گرمی کے خیال سے اپنے اوورکوٹ ہوٹل میں چھوڑ آئے تھے۔ سردی کی وجہ سے

کسی قدر تکلیف ہوئی۔ واپس آنے کے بعد سلیم بھائی کو بخار آگیا۔ ہمارے

ضروری ادویات

ساتھ کونین کی گولیاں تھیں اور ملین معدہ دوا بھی تھی۔ اِن کا استعمال کیا گیا۔ دو روز بعد آرام ہوگیا۔ ہر مسافر کو چند ضروری ادویات پاس رکھنا ضروری ہے کیونکہ زبان کی ناواقفیت ایسے موقعوں پر بہت پریشان کرتی ہے طبیب کے پاس رجوع ہونا اور بازار میں دوا خریدنا مشکل دوا فروش عام طور پر انگریزی سے ناواقف اور انگریزی ساخت کی ادویات بہت گراں ہیں۔ مجھ کو ایک دفعہ مگنیشیا د خریدنے کی ضرورت تھی۔ متعدد دکانوں پر دریافت کیا کوئی انگریزی داں نہ ملا۔ بالآخر ایک دوکان پر بہت دیر تک اشاروں میں مطلب سمجھایا بڑی مشکل کے بعد مگنیشیاء ہمدست ہوا۔ اسی طرح ایک دفعہ ایسی دوا کی ضرورت تھی جس سے پاؤں کے گٹے جاتے رہیں۔ گٹوں کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل ہوگیا تھا۔ بدرجہ مجبوری جوتا اور جراب اُتار کر دوکاندار کو پاؤں بتلایا تب کہیں مقصد براری ہوئی۔ دکاندار نے اشاروں کے ذریعہ ترکیب استعمال بتلائی۔ بہت کچھ وقت ضایع ہوا اور دوسروں کو تفریح کا موقع ہاتھ لگا۔

راستہ بھولنا

اکثر اوقات راستہ معلوم نہیں ہوتا۔ انگریزی داں آدمی ہر موقع پر ملنا مشکل ہے۔ ایک دفعہ میں تنہا ہوٹل سے دور نکل گیا۔ واپسی کے وقت راستہ یاد نہ رہا۔ قریب نہ تو ٹریم تھی نہ موٹر بس۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ کس مقام سے ہوٹل جانے کے لئے موٹر بس مل سکتی ہے۔ پریشان پھرتا رہا مگر انگریزی داں آدمی نہ ملا۔ بہت دیر کے بعد ایک عورت ملی جو کچھ انگریزی جانتی تھی اس سے راستہ دریافت کیا۔ کہتی تھی کہ یہ کام میرا نہیں ہے کسی پولیس کے جوان سے دریافت کرو۔

تہذیب جدید کی دل آویزیوں کا ایک نمونہ

میں نے کہا یہاں کی پولیس انگریزی سے واقف نہیں ہے۔ اس لئے مجھ کو کچھ امداد نہیں مل سکتی۔ تم انگریزی جانتی ہو تم کو چاہیئے کہ میری مدد کرو۔ اس نے کہا کہ افسوس ہے کہ میں راستہ سے واقف نہیں ہوں۔ اس لئے تمھاری مدد نہیں کر سکتی۔ میں نے کہا میں تم کو چھوڑوں گا نہیں اور جہاں جہاں تم جاؤ گی تمھارے ساتھ جاؤں گا اس نے جواب دیا کہ آخر میں کس طرح تمھاری مدد کروں میں نے کہا تم میرے ساتھ پولیس کانسٹبل کے پاس چلو اور اس سے دریافت کر کے مجھے بتلاؤ اس پر وہ راضی ہوگئی۔ چنانچہ میرے ساتھ کانسٹبل کے پاس گئی۔ اور دریافت کر کے بتلایا کہ فلاں نمبر کی موٹر بس ملیگی اور فلاں مقام سے اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس طرح یہ مشکل آسان ہوئی۔ برلن کے پولیس کی ایک بات سب سے اچھی معلوم ہوئی بات کرنے سے پہلے پولیس کانسٹبل باقاعدہ سلام ضرور کرتا تھا۔ اور مجھ کو فوراً اپنا مجسٹریٹ ہونا یاد آجاتا تھا۔ موٹر بس میں سوار ہو کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔ حالانکہ وہاں سے ہوٹل کوئی نصف میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہ بھی خوف تھا کہ کہیں ہوٹل سے بہت آگے نہ نکل جاؤں۔ غرض یہ کہ غلط جگہ اُتر گیا۔ مغرب کا وقت تھا اور تمام دن کی گردش کی وجہ سے تکان غالب تھی کسی قدر حرارت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

ایک عورت کی امداد

موٹر بس سے اُترتے ہی ایک مشکل کا سامنا ہوا۔ یعنے ایک عورت نے بلا تکلف میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔ میں نے انگریزی میں بات کی مگر وہ کوری نکلی اشارہ سے مجھ کو سڑک کے ایک طرف بُلایا وہاں ایک بڑا تھیلا پڑا ہوا تھا۔ عورت نے اشارہ سے کہا کہ اس کو اُٹھانے میں میری مدد کرو۔ میں سمجھا یہ کسی قریب مقام پر جاتی ہوگی۔ اخلاقی طور پر بھی امداد کرنا مناسب

معلوم ہوا۔ کچھ فاصلہ تک ہم دونوں اس تھیلے کو اُٹھا کر لے گئے۔ عورت تھک گئی اور سانس چڑھنے لگا۔ اس نے تھیلا زمین پر چھوڑ دیا میں جانے لگا تو اشارہ سے روکا اور کہا کہ ٹھہر جاؤ ابھی اور آگے جانا ہے۔ چنانچہ کچھ دور تک پھر تھیلا اٹھا کر لے گئے۔ عورت دوبارہ تھک گئی۔ اور آرام لینے لگی۔ میں نے کہا کہ میں جاتا ہوں اس نے اشارہ سے بتایا کہ سڑک کی دوسری جانب جو مقام ٹریم کے کھڑے ہونے کا ہے۔ وہاں مجھے جانا ہے وہاں تک یہ تھیلا لے چلو میں نے کہا سڑک بہت چوڑی ہے اور ٹرافک کی کثرت ہے یہ کام مشکل اور خطرناک ہے۔ مگر اس نے اصرار کیا کہ وہاں تک جانا ضروری ہے۔ بالآخر موٹروں سے بچتے ہوئے بڑی مشکل سے تھیلے کو دوسری جانب لے گئے۔ میں رخصت ہونا چاہتا تھا۔ لیکن عورت نے روکا اور جلدی سے بٹوا نکال کر کچھ معاوضہ دینا چاہا میں نے شکریہ کے ساتھ اس کو روک دیا مگر وہ مانتی نہیں تھی۔ اس لئے میں نے بٹوا بند کر کے تھیلے میں رکھ دیا۔ اور وہاں سے جانے لگا اس نے کہا کم سے کم ہاتھ تو ملاتے جاؤ۔ مصافحہ کر کے میں مقابل کی پٹری پر چلا گیا۔ جہاں سے توقع تھی کہ ہوٹل کو ٹریم جاتی ہے اس مقام سے میں نے دیکھا کہ ایک ٹریم آئی اور اس میں سوار ہونے کی کوشش اس عورت نے کی لیکن یہ معلوم ہوا کہ وہ ٹریم اس کے مقام کو نہیں جاتی اور وہ غلط جگہ پر کھڑی ہوئی ہے اس کو دراصل وہاں آنا چاہیئے۔ جہاں میں کھڑا ہوا تھا۔ یہ معلوم کر کے اس کو بڑی پریشانی ہوئی اور امداد کے واسطے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ مگر کوئی مدد نہ ملی کچھ دور تک تنہا تھیلے کو گھسیٹا لیکن بہت وزنی تھا اس لئے بیچاری کو اس کا گھسیٹنا مشکل ہو گیا۔ آخر میں دوبارہ اس کی مدد کو گیا اور ہم دونوں نے مل کر اس تھیلے کو دوسری جانب منتقل کیا۔ اس عورت سے معلوم ہوا کہ

میں خود غلط جگہ پر ٹھہرا ہوں۔ میری ٹریم اس جگہ نہیں آئے گی۔ اس نے اشارہ سے دوسری جانب وہ مقام بتایا جہاں میری ٹریم آتی تھی۔ میں نے کہا اس دفعہ میں تم کو ٹریم میں سوار کرا کر جاؤں گا۔ تھوڑی دیر میں ٹریم آ گئی۔ اور میں نے اس کو سوار کرا دیا۔

برلن کے بازار میں گاندھی کی جے

ایک روز میں خط ڈالنے کے واسطے لیٹر بکس کی تلاش میں تھا۔ ایک اخبار فروش ملا اس سے دریافت کیا وہ انگریزی جانتا تھا اس کو جب معلوم ہوا کہ میں ہندوستان سے آیا ہوں تو اس نے ہاتھ اٹھا کر تین دفعہ (بندے ماترم گاندھی جی کی جے) کا نعرہ مارا۔ یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا۔ مگر امریکہ میں رہ چکا ہے اس لئے انگریزی جانتا ہے وہ ہندوستان کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر مجھے ایک ضروری کام تھا اور بازار میں اجنبی آدمی سے اس قسم کی گفتگو مناسب بھی نہ تھی۔ اس لئے میں نے اس کو ٹال دیا۔ اکثر لوگ ہندوستان کے سیاسی معاملات پر گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر انگریزی میں کافی مہارت نہ ہونے کی وجہ سے مجبور رہتے ہیں۔

ہوائی جہاز

ایک مقام (ٹیمپل ہاف) برلن کے ہوائی جہازوں کا مرکز ہے۔ اس جگہ بڑی رونق رہتی ہے۔ مختلف مقامات سے ہوائی جہاز مسافروں کو لئے ہوئے آتے ہیں اور جاتے ہیں ہم نے دو دفعہ برلن پر ہوائی جہاز کو اڑتے ہوئے دیکھا۔ پہلی دفعہ ایک رسٹوران میں لب سڑک بیٹھے ہوئے تھے کچھ آواز سی آئی دیکھا کہ لوگ سڑک کی طرف جا رہے ہیں اور بہت شوق کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔ ہم بھی باہر نکلے ایک ہوائی جہاز

آسمان پر قلابازیاں کھا رہا تھا۔ دُم میں سے ایک باریک لکیر دھوئیں کی نکلتی تھی کمال یہ تھا کہ قلابازی کی گردش سے دھوئیں کے حروف بنتے جاتے تھے۔ یہ چند منٹ تک قائم رہے پھر معدوم ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ کسی دکان کا اشتہار ہے کیا خوب طریقہ نکالا ہے۔ لیکن یہ اشتہار قیمتی ضرور ہوتا ہو گا۔ انسان کی یہ بلند پروازی آجکل سائنس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔

خاک کے پتلے نے دیکھ کیا ہی مچایا ہی شور
فرش سے لے عرش تلک کر رہا ہے اپنا زور

البتہ عقل انسانی چونکہ کسی حال میں خطا سے خالی نہیں ہے اس لئے انسان کی اس ایجاد میں بھی نقائص موجود ہیں۔ دوسری دفعہ میں ایک دکان میں کچھ خرید رہا تھا۔ دفعتہً دکاندار کاروبار چھوڑ کر کچھ کہتا ہوا سڑک کی طرف بھاگا۔ میں پریشان ہوا کہ یا الٰہی کیا مصیبت آنے والی ہے۔ ممکن ہے کہ زلزلہ آ رہا ہو مصلحت وقت کو مناسب خیال کر کے دکاندار کے پیچھے دوڑا۔ باہر آ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک زپلین اُڑ رہا ہے۔ اور اس کو دیکھنے کے لئے سینکڑوں آدمی عورت مرد جمع ہو گئے ہیں۔ راستہ چلنے والے اپنی اپنی جگہ رُکے ہوئے تھے۔ اور مکانات کی کھڑکیوں سے لوگ باہر لٹکے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بہت تعجب ہوا کہ یہ لوگ بھی ہوائی جہاز کو اب تک اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہندوستان کے لوگ۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس زپلین میں کوئی خاص بات ہوگی۔ شاید گراف زپلین ہو جس کی پرواز کی ابھی تک دھوم مچی ہوئی ہے۔

آب و ہوا

برلن کی آب و ہوا اچھی اور صحت بخش ہے۔ یورپ کے دوسرے شہروں کی نسبت یہاں جاڑوں میں سخت سردی اور گرمیوں میں زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ ہم کو گرمی کا تجربہ ہے۔ جون کا مہینہ تھا۔ گرمی خاصی تھی

موسم گرما میں مقیاس الحرارت بالعموم (۷۰) ستر ڈگری سے اوپر نہیں جاتا۔ بعد میں بارش ہونے کی وجہ سے سردی بھی ہوگئی۔ مکانوں میں پنکھے نہیں ہوتے اس لئے گرمی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اکثر لوگ محض قمیص سے بازاروں میں پھرتے دکھائی دیے۔ یہ بھی دیکھا کہ ریستوران میں کوٹ اتار کر کھانا کھا رہے تھے۔ ایک روز ہم کو بھی گرمی سے تکلیف ہوئی۔ ہوٹل میں کھانے کی میز پر ایک امریکن سیاح تھے ان کو بھی گرمی معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کے لحاظ سے کوٹ نہیں اُتارتے تھے۔ میرے قریب ان صاحب کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا آج گرمی بہت ہے اگر اجازت دو تو کوٹ اتار دیں انہوں نے کہا "بہت خوشی کے ساتھ۔ میرے خاوند کو بھی گرمی معلوم ہوتی ہے لیکن تم لوگوں کی وجہ سے وہ کوٹ نہیں اُتارتے" بالآخر ہم سب نے کوٹ اُتار دیے۔ گرمیوں میں آئس کریم اور آبشورہ کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ آئس کریم کی اچھی اچھی دکانیں بازاروں میں ہر جگہ دکھائی دینگی۔

زمین دُوز ریل برلن میں انڈر گراونڈ یعنے زمین دوز ریلوے بھی ہے گاڑیاں نفیس اور صاف ستھری ہیں۔ اسٹیشن بھی اچھے بنے ہوئے ہیں۔ کئی دفعہ اس میں بیٹھنے کا موقع ہوا۔ زبان کی وجہ سے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کس پلیٹ فارم سے کون سی ٹرین پر سوار ہونا چاہیے۔ یہی مشکل موٹر بس اور ٹریم کی سواری میں پیش آتی ہے۔ ہم زیادہ تر پیدل چلتے تھے یا ٹیکسی میں سوار ہوتے تھے پیدل چلنا زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ سیر کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ بالخصوص دوکانوں

دوکانیں کی رونق اور سجاوٹ خوب دیکھنے میں آتی ہے) برلن کی دکانیں بہت دل آویز طریقہ پر سجائی جاتی ہیں۔ ریشمی

پاتا ہے اور چمڑے کا سامان اچھا و ارزاں ہے۔ یہاں کے بنے ہوئے سگریٹ اچھے نہیں ہوتے۔ انگریزی سگریٹ مہنگا ملتا ہے۔ البتہ سگار یہاں کا اچھا ہوتا ہے۔ قیمت بھی کم ہوتی ہے۔ ایک آنہ میں اچھا سگار ملیگا۔

پبلک ٹیلیفون جابجا لگے ہوئے ہیں۔ اگر زبان آئے تو بات کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ لندن کی نسبت فیس بھی کم ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ اگر بات نہ ہوسکے تو پیسے واپس نہیں ملتے اس کے خلاف لندن میں پیسے واپس ملتے ہیں۔

جرمنی کے لوگ جرمن لوگ عام طور پر خلیق ہوتے ہیں۔ مصافحہ کرنے کی رسم بہت مقبول ہے۔ علی الصبح ایک دوسرے سے ہاتھ ضرور ملاتے ہیں۔ مجھ کو ان لوگوں کی جو چیز ناپسند ہے وہ ان کا منڈا ہوا سر ہے۔ سر کے بال اس قدر خشخشی ہوتے ہیں کہ دور سے منڈا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور خصوصیت ان لوگوں کی تذکرہ کے لائق ہے وہ یہ کہ انکار کے موقع پر شانے اونچے کر دیتے ہیں مثلاً اگر ان سے کوئی سوال کیا جائے اور جواب میں وہ آدمی شانہ اونچا کرے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم۔ اٹلی اور فرانس میں بھی یہ شانے چڑھانے کی رسم عام ہے۔

اس ملک کی عورتیں بھی مضبوط اور دوہرے جسم کی ہوتی ہیں ان کو بچپن ہی سے امور خانہ داری سکھائے جاتے ہیں۔ اس لئے گھریلو کاموں میں بہت سلیقہ شعار ہوتی ہیں۔ ان کا تمامتر وقت خانہ داری کے جھمیلوں میں گذرتا ہے۔ بیرونی دنیا کے حالات سے چنداں سروکار نہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی عورتوں کی طرح حد سے زائد آزاد خیال نہیں ہوتیں۔ سنا ہے کہ جنگ کے بعد سے طرز تمدن اور خیالات میں بھی بہت کچھ انقلاب پیدا

ہو گیا ہے۔

برلن سے لندن کو روانگی

۲۴ جون کو دن کے ایک بجے برلن سے لندن روانہ ہو گیا۔ درجۂ دوم کا کرایہ پانچ پونڈ کے قریب ہوتا ہے۔ اس میں اسٹیمر کا کرایہ بھی شریک ہے۔ لندن کی ریل فرڈیرش بان ہاف سے روانہ ہوتی ہے۔ سلیم بیگ اور رفیق بیگ کو برلن میں کام تھا اس لئے وہیں ٹھہر گئے یہ دونوں مجھ کو اسٹیشن پر پہنچانے آئے تھے۔ لندن کا ٹکٹ امریکن اکسپرس کے ذریعہ سے خرید لیا تھا۔ اسٹیشن پر پلیٹ فارم ٹکٹ کی ضرورت ہوئی۔ ہر چند خریدنے کی کوشش کی مگر کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ بدرجۂ مجبوری دونوں مایوس ہو کر واپس جانے والے تھے کہ ایک انگریزی داں نے کہا تمہارے پیچھے مشین لگی ہوئی ہے اس میں پیسے ڈال کر ٹکٹ نکال لو۔ اس اسٹیشن پر ریل بہت کم ٹھہرتی ہے۔ جلدی میں یہ ہوا کہ جو درجہ ہمارے سامنے آیا اس میں ہم نے سامان رکھدیا اور ریل روانہ ہو گئی کچھ دیر بعد ٹکٹ کلکٹر آیا۔ ٹکٹ دیکھ کر جرمنی زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اتفاق سے ایک جرمن مسافر کچھ انگریزی جانتا تھا اس نے سمجھایا کہ یہ درجہ راستہ میں ایک مقام پر کٹ کر سیدھا امسٹرڈم جائے گا تم کو چاہئے کہ اس گاڑی میں بیٹھو جو ہوک آف ہالینڈ کو جاتی ہے۔ اب بھی سامان منتقل کرنے کا بہت موقع ہے نیچے اُترنے کی ضرورت نہیں۔ چلتی ریل میں سامان منتقل کر سکتے ہو۔ تمہارا درجہ انجن کے قریب ہے۔ ٹکٹ کلکٹر تو چلا گیا میں سوچتا رہا کہ کیا کروں دل چاہتا تھا کہ امسٹرڈم چلا جاؤں۔ سیر ہو جائے گی۔ مگر خیال آتا تھا کہ تنہا ہوں اور اس ملک کی زبان نہیں جانتا۔ زبان کی مشکلات کا تلخ تجربہ بہت کچھ ہو چکا تھا اس لئے پس وپیش

تھا۔ ٹکٹ کلکٹر دوبارہ آیا اور تقاضا کرنے لگا کہ یا تو سامان منتقل کردیا ایسٹرڈم کا ٹکٹ خرید لو۔ بالآخر لندن جانے کا ارادہ مصمم کرلیا۔ اور جگہ کی تلاش میں روانہ ہوا۔ لندن کے مسافروں کی گاڑی بہت دور انجن کے قریب تھی راستہ میں معلوم ہوا کہ اکثر مسافر میری طرح غلط درجہ میں سوار ہوگئے ہیں۔ یہ لوگ بھی جگہ کی تلاش میں تھے۔ لندن کی گاڑی میں ایک سیٹ مل گئی۔ وہاں اپنا ہینڈ بیگ رکھ دیا۔ اور اس فکر میں تھا کہ سامان کیسے منتقل کروں اتنے میں ایک شخص کو دیکھا کہ دوسروں کا سامان منتقل کرتا پھرتا ہے۔ اشاروں میں اپنا مطلب سمجھایا۔ اس نے آمادگی ظاہر کی تو اپنے ساتھ لے گیا اور سامان اٹھوایا۔

یورپ کی ریل

بر اعظم کی ریلوں میں تین درجے اول۔ دوم اور سوم ہوا کرتے ہیں۔ اول اور دوم میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ درجۂ اول میں مسافر کم ہوتے ہیں۔ اس لئے پاؤں پھیلانے کے لئے اکثر موقع مل جاتا ہے۔ تیسرے درجہ میں مسافروں کی کثرت ہوتی ہے اور بنچوں پر گدہ نہیں ہوتا۔ کسی درجے میں آٹھ مسافر سے زیادہ نہیں بیٹھ سکتے۔ ایک پسندیدہ طریقہ یہ دیکھنے میں آیا کہ جگہ تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوتی اول تو مقررہ تعداد سے زیادہ مسافر ایک درجہ میں بیٹھ نہیں سکتے دوسرے یہ کہ جگہ خالی ہو تو آنے والے مسافر کو نہ تو روکتے ہیں اور نہ مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں عام طریقہ یہ پڑگیا ہے کہ نئے مسافر کو حتی الامکان درجہ میں سوار ہونے سے روکتے ہیں غلط ہو یا صحیح اتنا ضرور کہہ دیتے ہیں کہ حضرت آگے تشریف لیجائیے۔ دوسرا درجہ خالی پڑا ہے بعض لوگ اندر سے کھٹکا لگا لیتے ہیں۔ کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جن کو ریل کی کنجی کہیں سے دستیاب ہوگئی ہے

سفر کے وقت اس کو ضرور اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے
ہیں۔ سیٹ کی خاطر بڑے بڑے ہنگامے بھی ہمارے ہاں ہوتے رہتے ہیں۔
یورپ میں یہ سب باتیں مفقود ہیں۔ مسافر ایک دوسرے کے ساتھ نہایت درجہ
اخلاق اور راست بازی سے کام لیتے ہیں۔ نیا مسافر کسی درجہ میں سیٹ خالی
بھی دیکھے تو بیٹھنے والوں سے اول دریافت کرے گا کہ سیٹ خالی ہے یا
نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی مسافر تھوڑی دیر کے لئے کسی ضرورت سے باہر
گیا ہو۔ بیٹھے ہوئے مسافر اس معاملہ میں کبھی دھوکا نہیں دیں گے۔ بعض دفعہ
مسافروں کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ گیلری میں بھر جاتے ہیں اور بلا
مبالغہ سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر کیا مجال کہ کوئی لڑائی جھگڑا ہو۔ کھانے
کی گاڑی تک جانے کے لئے مجھ کو اکثر مجمع میں سے گزرنے کا اتفاق ہوا
ایک ایک قدم اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ عورت اور مرد سب گتھم گتھا ہوتے ہیں
لیکن راستہ چلنے والے کی مدد بہت خندہ پیشانی کے ساتھ کرتے ہیں ہمارے
ہاں ان حالات میں ہاتھا پائی ہو جانا ایک معمولی بات ہے۔ یہاں کی ریلوں کے
باتھ روم میں کاغذ کے تولیے اور صابن کا بھی انتظام ہے۔ باریک کاغذ کے
تولیے ہوتے ہیں۔ ایک مسافر ایک ہی دفعہ اس کو استعمال کر سکتا ہے صابن
سیال ہوتا ہے۔ شیشہ کا ایک گولہ ایک طرف اس طرح لگا ہوتا ہے کہ اس کو
چکر دینے سے ایک قطرہ وقتِ واحد میں ٹپکتا ہے۔ ہمارے درجہ میں چار مسافر
اور تھے۔ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے میں نے دو ایک ساتھیوں سے
گفتگو کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نتیجے میں ع۔ بہت بے آبرو ہو کر ترے
کوچہ سے ہم نکلے۔ موسم کے متعلق دو ایک جملے کہنے کے بعد خاموش ہو گئی
قرائن سے معلوم ہوا کہ زیادہ گفتگو ناگوار خاطر ہے انگریز قوم کی ایک خصوصیت

یہ ہے کہ ضرورت سے زائد متین ہوتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی عادت اس کے
برعکس ہے ایسے موقع پہ چند ہی منٹ کی ملاقات میں ہندوستانی آدمی سوالات
کی بوچھار کر کے پریشان کر دیگا۔ اولاد۔ آمدنی۔ اور دیگر خانگی حالات کی تفتیش
اس طرح کریگا جیسے کوئی سُراغ رساں بیٹھا اپنے فرائض کو انجام دے رہا ہے۔
حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ اس خصوص میں دونوں اقوام انتہا پسند واقع
ہوئی ہیں۔ درمیانی روش اختیار کرنی چاہیئے نہ ضرورت سے زیادہ باتیں
اور نہ ضرورت سے زائد خاموشی۔ مردوں کی نسبت عورتیں کسی قدر باتونی ہوتی
ہیں۔ تین عورتیں اور ایک مرد۔ یہ سب انگریز تھے اور لندن جارہے تھے۔
مقابل کی سیٹ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ لندن کی رہنے والی
ہے۔ مجھ کو معلوم کرنا تھا کہ لندن کے کس اسٹیشن پر ہم لوگ اتریں گے اور وہاں
سے فارسٹ ہل جانے کا کونسا راستہ ہوگا۔ کیونکہ مجھ کو فارسٹ ہل میں ایک فیملی
کے ساتھ ٹھہرنا تھا معلوم ہوا کہ لیورپول اسٹریٹ اسٹیشن پر پہنچیں گے
وہاں سے فارسٹ ہل بہت دور ہے میم صاحب نے بَراست ٹیکسی میں
مت جانا کرایہ بہت زیادہ ہوجائے گا۔ بلکہ اسٹیشن سے ٹیکسی لے کر لندن
برج اسٹیشن تک جانا۔ وہاں سے فارسٹ ہل کو ریل جاتی ہے۔ چھ سات
منٹ کا راستہ ہے۔

اسٹیمر کا سفر

کھانے کے لئے کچھ سامان برلن سے چلتے وقت خرید لیا
تھا۔ جرمنی میں یہ بات معیوب نہیں ہے۔ اکثر لوگ ریل
میں کھاتے پیتے ہیں۔ نصف شب کے قریب ہک آف ہالینڈ پہنچے۔ یہ مقام
ملک ہالینڈ میں لب سمندر واقع ہے یہاں سے انگلستان کو اسٹیمر جاتے
ہیں۔ برلن سے لندن کو یہی راستہ قریب ترین ہے۔ اسٹیمر میں سوار

ہونے کے قبل پاسپورٹ وغیرہ کا معائنہ ہوتا ہے۔ زیادہ وقت ضائع نہیں ہوتا
البتہ اسٹیمر پر مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جگہ ملنے میں دیر ہوتی ہے اسٹیمر
کے منتظم کو پرسر کہتے ہیں۔ یہ مسافر کا پاسپورٹ اور ٹکٹ دیکھنے کے بعد کیبن
کا تعین کردیتا ہے۔ ہر کیبن میں دو برتھ ہوتے ہیں۔ ایک نیچے اور دوسرا
اوپر۔ مجھ کو نیچے والا برتھ ملا۔ دوسرا مسافر ایک انگریز تھا اور چین کے کسی شہر سے
اپنے وطن اسکاٹ لینڈ کو جارہا تھا۔ کسی قدر پریشان حال تھا۔ دریافت
پر معلوم ہوا کہ برلن سے لندن تک جو ٹکٹ اس کے پاس تھا وہ کہیں گم
ہوگیا۔ مجھ سے مشورہ لیا کہ کیا کروں۔ یہ ٹکٹ اس نے کک کمپنی سے خریدا
تھا۔ میں نے کہا بہتر ہوگا کہ لندن پہنچنے پر تم کک کمپنی کو مطلع کردو۔ انگلش
چینل (آبنائے انگلستان) میں اکثر تموج رہتا ہے اسٹیمر کسی قدر ہلتا رہا
اس لئے خاطر خواہ نیند نہیں آئی۔ علی الصباح اترنے کی گڑبڑ ہوئی۔ اسٹیمر پر
ناشتہ کا بندوبست ہے لیکن قیمت علٰحدہ دینی پڑتی ہے انگلستان کے
جس بندرگاہ پر اترے اُس کا نام ہارچ ہے یہاں محکمۂ کروڑگیری کا عملہ
مسافروں کا اسباب دیکھتا ہے۔ زیادہ تر تمباکو کی تلاش ہوتی ہے۔ میرے
پاس کوئی چیز محصول طلب نہ تھی۔ اس لئے آسانی کے ساتھ چھٹکارا ہوگیا۔
چین کا مسافر مجھ سے قبل اپنا سامان لیکر اسٹیمر سے اُتر گیا تھا۔ اس کی ایک
لکڑی کیبن میں رہ گئی تھی۔ قلی آیا اور کہنے لگا کہ صاحب اپنی کتاب یہاں
بھول گئے ہیں میں نے لکڑی دے کر کہا کہ یہ ان کی کتاب ہے لیجاؤ۔
صاحب بہادر اسٹیشن پر دکھائی دیے تو میں نے کہا تمھاری ایک لکڑی نما
کتاب کیبن میں رہ گئی تھی وہ قلی کو دیدی گئی۔ صاحب بہادر نے کسی قدر
شرمندہ ہوکر کہا مجھ کو یہ خیال ہوا کہ کتاب بھول گیا ہوں۔ میں نے مذاق کے

طور پر کہا کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے کوئی اور چیز کھودی اور خیال یہ ہے کہ ٹکٹ کھو گیا اس پر وہ ہنسنے لگا۔ پلیٹ فارم پر لندن کی ریل تیار رہتی ہے اس کو

کانٹینَنٹل اکسپرس

کانٹینَنٹل اکسپرس کہتے ہیں۔ انگلستان کی ریلوں میں عام طور سے صرف دو درجے ہوا کرتے ہیں۔ درجہ اول اور درجۂ سوم لیکن کانٹینَنٹل اکسپرس میں درجہ دوم بھی ہوتا ہے تاکہ امتیاز رہے۔ مسافروں کی کثرت تھی مشکل سے ایک جگہ ملی۔ جن لوگوں نے اسٹیمر پر ناشتہ نہیں کیا تھا وہ ڈائننگ کار میں جمع ہو گئے۔ جائے تنگ است و مرداں بسیار کا مضمون پیش آیا۔ مسلسل تین مرتبہ کھانا کھلایا گیا مگر پھر بھی کئی مسافر محروم رہے اور لندن کا اسٹیشن آ گیا۔

برلن سے لندن تک بذریعہ ریل اکیس گھنٹے کا راستہ ہے اور ہوائی جہاز کے ذریعہ آٹھ گھنٹے لگتے ہیں۔ ہوائی جہاز کا کرایہ ریل سے بہت زیادہ ہے آجکل نو پونڈ دس شلنگ ہے۔ دس بجے کے قریب ریل لندن کے لیورپول اسٹریٹ اسٹیشن پر پہنچی۔ وہاں سے ٹیکسی لیکر لندن برج اسٹیشن گیا یہاں سے متعدد ریلیں فارسٹ ہل جاتی ہیں۔ یہ مقام لندن کے جنوب مشرقی حصہ میں واقع ہے۔ چھوٹی جگہ ہونے کی وجہ سے اسٹیشن پر ٹیکسی نہیں ملتی البتہ ایک گھوڑے کی لینڈو گاڑی مل گئی۔ اس میں اسباب رکھ کر اس مقام پر گیا جہاں مجھ کو ٹھہرنا تھا۔

آبز اوک روڈ نمبر ۶۸ فارسٹ ہل

اس مکان کا پتہ مسٹر اور مسز لیشائی سے معلوم ہوا تھا انہوں نے لندن سے بذریعہ خط برلن میں اطلاع دی تھی اور یہاں ٹھہرنے کی سفارش کی تھی۔ مالکہ

ایک سن رسیدہ شریف عورت مسز ویب نامی ہے۔ مسٹر ویب بھی اسی مکان میں رہتے ہیں ان کی ایک لڑکی مس ویب ہے۔ بقیہ لوگ مسافرانہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مکان سہ منزلہ اور ہوادار ہے۔ متعدد کمرے خالی تھے۔ ایک کمرہ پسند کرلیا۔ فی ہفتہ ڈھائی اشرفی کرایہ مقرر ہوا جس میں کھانا پینا وغیرہ شامل تھا تین اور مسافر یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک مدرسہ میں ملازم تھا اور دوسرا کسی جہاز کی کمپنی میں۔ مس پالک نامی ایک لڑکی لٹویا کے طرف کی رہنے والی بھی ہے۔ لٹویا ایک چھوٹا سا ملک روس کے علاقہ سے ملحق ہے۔ وہاں سے یہ لڑکی انگریزی پڑھنے کے واسطے آئی ہوئی ہے۔ اسی زمانہ میں برادر عزیز غلام یزدانی صاحب (ناظم آثار قدیمہ ملک سرکار عالی) ایک سرکاری کام کے لئے لندن آئے ہوئے تھے۔ ان کو بھی یہ مکان پسند آیا۔ پہلے وہ کسی اور جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اسی مکان میں منتقل ہوگئے۔

مکان کی پشت پر ایک باغچہ ہے جس میں دن کے وقت کرسیاں ڈالکر بغرض تفریح بیٹھ سکتے ہیں۔ ایک کھانے کا کمرہ اور ایک ملاقاتی۔ یہ دونوں ساز و سامان سے آراستہ ہیں۔ مکان کا موقع اچھا ہے۔ تازہ ہوا خوب آتی ہے اگرچہ اصل لندن سے یہ مقام کسی قدر دور ہے لیکن حفظان صحت کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ لندن کے ہوٹلوں میں عام طور پر تازہ ہوا مشکل سے میسر آتی ہے۔ ماسوا اس کے کثرت ٹرافک کی وجہ سے شور و غل بھی رہتا ہے۔ ہوٹل کے جو کمرے لب سڑک ہوتے ہیں اُن میں رات کو نیند آنا مشکل ہے۔ بنسبتہ کرایہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ فی الجملہ مجھ کو فارسٹ ہل میں قیام پسند آیا۔ ڈھائی اشرفی کے تقریباً چالیس روپیہ سکہ عثمانیہ ہوتے ہیں۔ اِس حساب سے مکان کا کرایہ روزانہ چھ روپیہ سے کچھ کم پڑا۔ لندن کے کسی متوسط درجہ کے ہوٹل میں

اگر ٹھہرو تو کھانا پینا شامل کرکے کس طرح دس روپیہ روز سے کم خرچ نہ ہوگا اور مجھ کو یقین ہے کہ دس روپیہ خرچ کرنے پر بھی کھانا اس قدر افراط کے ساتھ نہیں ملے گا۔ جیسے اس مکان میں ملتا تھا۔ صبح کو ناشتہ میں پارج۔ انڈے مکھن روٹی۔ جام اور پنیر وغیرہ ملتا تھا ایک بجے کے قریب لنچ میں سوپ کے علاوہ گوشت۔ ترکاری اور میٹھا۔ مکھن۔ روٹی۔ پنیر۔ اور میوہ تو میز پر ہمیشہ رکھا ہی رہتا تھا۔ شام کو چائے کے وقت بہت سی چیزیں خانہ ساز ہوتی تھیں۔ رات کا کھانا ویسا ہی ہوتا تھا جیسا دن کا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ مالکہ مکان ہندوستانی طرح کا کھانا پکاتی تھیں۔ مقررہ کرایہ میں گرم غسل بھی شریک تھا۔ اکثر ہوٹلوں میں گرم غسل کے لئے ایک شلنگ علیحدہ چارج کرتے ہیں۔ مشکل اگر تھی تو صرف اتنی کہ لندن سے یہ مقام فاصلہ پر ہے۔ موٹر بس یا ٹریم کے ذریعہ اگر جاؤ پون گھنٹہ ضرور لگتا ہے۔ فارسٹ ہل سے ایک موٹر بس سیدھی پکا ڈلی سرکس کو جاتی ہے۔ ٹریم وکٹوریہ اسٹیشن تک جاتی ہے۔ صبح دس بجے سے قبل لندن تک کرایہ پانچ پنس ہوتا ہے دس بجے سے چار بجے تک دو پنس۔ اس کے بعد پھر پانچ پنس ہو جاتا ہے (ایک پنس ایک آنہ کے برابر ہے) لندن کے دوسرے مقامات کو بھی یہاں سے موٹر بسیں جاتی ہیں۔ ریل کے ذریعہ اگر لندن برج جاؤ تو کرایہ نو پنس ہوگا۔ بات یہ ہے کہ کسی ایک مقام پر ہر قسم کا آرام میسر آنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے میں نے آب و ہوا کے فائدے کو ترجیح دے کر فارسٹ ہل میں قیام مناسب پایا۔ گھر والے بھی خلیق اور شریف لوگ ہیں۔ ملاقاتی کمرے میں ایک پیانو بھی ہے شب کے وقت اکثر رقص و سرود رہتا ہے۔ اس خاندان کے چند ملاقاتی آجایا کرتے ہیں اور بعض دفعہ رات کو ایک بجے تک گانا بجانا ہوتا رہتا ہے۔

لندن آبادی اور وسعت کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے اور ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہمارے بادشاہ سلامت بھی اسی شہر میں رہتے ہیں۔ علاوہ اس کے زبان کی دقت نہیں۔ کیونکہ سب انگریزی بولتے ہیں اب تک اشاروں سے کام چلاتے رہے مگر یہاں زبان کی باری تھی لندن میں میرا قیام کم و بیش دو مہینے رہا۔ یہاں کی سیر کچھ تو بطور خود کی۔ اور کچھ دوستوں کے ساتھ۔ تمام دن سیر کرنے میں گذرتا تھا۔ مولوی غلام یزدانی صاحب سے لندن کے حالات معلوم کرنے میں بہت بڑی امداد ملی صاحب موصوف اس سے قبل دو دفعہ یورپ آ چکے تھے۔

لندن اس قدر وسیع شہر ہے کہ اس کو تفصیل سے دیکھنا اور پورے حالات سے واقف ہونا کسی سیاح کے لئے تقریباً ناممکن ہے سینکڑوں چیزیں نظر کے سامنے آتی ہیں اور سینکڑوں نظر سے مخفی رہتی ہیں۔ آبادی کا ایک وسیع سمندر ہے جس میں انواع واقسام کی دلچسپیاں اور قابل دید چیزیں موجود ہیں۔

ٹیمز

دریائے ٹیمز کے دونوں جانب یہ شہر آباد ہے۔ یہ دریا اپنے منبع سے دوسو میل بہکر بحر شمالی میں گرتا ہے نقشہ دیکھنے سے واضح ہوگا کہ شہر میں اس دریا کا گذر بہت ہی پیچدار واقع ہوا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سانپ بل کھاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ لندن کی روز افزوں تجارت اور رونق کا دارومدار بہت کچھ اسی دریا پر ہے ٹیمز کی برکت سے یہ شہر آج تجارت کا مرکز بنا ہوا ہے کثرت سے جہاز اور اسٹیمر اس میں چلتے رہتے ہیں۔ لندن برج کے قریب اس کا پاٹ (۲۲۵) گز ہے لیکن آگے بڑھ کر چوڑا ہوتا گیا ہے۔

لندن کے پُل

تقریباً چوبیس پُل اس دریا پر صرف لندن میں ہیں۔ جن کے منجملہ چند کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ٹاور برج

انتہائی مشرقی حصے میں ٹاور آف لندن کے متصل ٹاور برج ہے نوعیت کے لحاظ سے یہ پُل خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہے۔ دونوں جانب گوتھک وضع کے بُرج بنے ہوئے ہیں۔ اوپر کے حصہ میں دریا کی سطح سے (۱۴۲) فیٹ کی بلندی پر ایک راستہ پیدل چلنے والوں کے واسطے ہے۔ مگر کسی وجہ سے بند رہتا ہے عام راستہ ایک لوہے کی کمان پر سے ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ ضرورت کے وقت بیچ میں سے دو ٹکڑے ہو کر الگ اُٹھ آتے ہیں۔ جب کبھی کوئی جہاز اس قدر اونچا آتا ہے کہ پُل کے نیچے سے نہیں گزر سکتا تو مشین کی مدد سے دونوں ٹکڑے اونچے کر دیے جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر پہلے ایک گھنٹی بجتی ہے تاکہ عوام کو اطلاع ہو جائے کہ راستہ بند ہونے والا ہے یہ عظیم الشان پُل (۱۵۰۰۰۰۰) پندرہ لاکھ پونڈ کی لاگت سے ۱۸۹۴ء میں مکمل ہوا۔ دن بھر میں اس پُل پر سے پانچہزار کے قریب گاڑیاں اور بیس ہزار سے زیادہ پیدل آدمی گذرتے ہیں۔ قریب میں جہازوں کی گودی اور گودام وغیرہ ہیں۔

لندن برج

ٹاور برج کے بعد جانب مغرب سب سے پہلے لندن برج واقع ہے۔ یہ سنگین پُل (۹۲۸) فیٹ طویل اور (۶۵) فیٹ عریض ہے۔ اس کے دونوں جانب پندرہ فیٹ چوڑے راستے پیدل چلنے والوں کے واسطے بنے ہوئے ہیں۔ موٹر بس کی چھت پر سے یہاں کا منظر نہایت دلکش ہوتا ہے۔ ٹرافک کا یہ حال ہے

جرمنی کا جنگی ٹینک جو زمانہ جنگ میں
انگریزوں کو بطور مال غنیمت حاصل ہوا ۔
لندن میں ہر اس مشہور ٹینک کے متصل محفوظ رکھا ہے
اس بطور مصنف کی تصویر ۔

کہ ایک لاکھ سے اوپر راہ رو بھر میں اس پر سے گذرتے ہیں۔ سواری گاڑیوں کا اندازہ بیس ہزار سے اوپر کیا جاتا ہے

بلیک فرائرس برج

تیسرا لائق تذکرہ پل بلیک فرائرس برج ہے

یہ شہر لندن کو جنوبی حصہ سے ملا دیتا ہے لندن کا سب سے چوڑا پل بھی یہی ہے مگر یورپ بھر میں سب سے بہتر پل واٹرلو برج ہے۔ شمالی جانب وکٹوریہ امبیانکمنٹ کے درمیانی حصہ سے شروع ہوتا ہے لنبائی (۱۳۸۰) فیٹ ہے۔ دس لاکھ پونڈ سے اوپر اس کی لاگت شمار کیجاتی ہے۔

ویسٹ منسٹر برج

اس کا شمار بھی یورپ کے بہترین اور وسیع پلوں میں کیا جاتا ہے۔ پل پر سے شہر کی جانب کا منظر بہت دلفریب ہے۔ کنارہ پر پارلیمنٹ کے ایوان اور اچھے اچھے ہوٹل ہیں۔

سٹی آف لنڈن

لندن کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لئے اس کو تین حصوں میں منقسم کرنا چاہئے۔ ٹیمز کے شمالی کنارے پر سب سے چھوٹا حصہ سٹی یعنے شہر کہلاتا ہے۔ جیسے حیدرآباد کے دو حصہ ہیں ایک بیرون بلدہ اور دوسرا اندرون بلدہ۔ شہر لندن کو اندرون بلدہ سمجھو۔ یہی اصلی اور قدیم شہر ہے۔ کسی زمانہ میں یہ حصہ ایک فصیل سے محصور تھا جس کے آثار دو ایک جگہ معمولی سے باقی ہیں۔ رفتہ رفتہ آبادی مغرب کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ شہر لندن کا موجودہ رقبہ چھ سو پچھتر (۶۷۵) ایکڑ سے زیادہ نہیں ہے یا ایک میل مربع سمجھو۔ مشرق میں اس کی سرحد

ٹاور آف لندن تک اور مغرب میں ٹیمپل بار تک ہے۔ چنانچہ جب کبھی بادشاہ سلامت جلوس کے ساتھ شہر میں داخل ہوتے ہیں تو رواج قدیم کے مطابق لارڈ میئر ٹیمپل بار تک پیشوائی کے لئے آتے ہیں۔ یہاں جلوس رُک جاتا ہے اور بادشاہ کے سامنے تلوار پیش کیجاتی ہے۔ شہر کا رقبہ اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن تجارت اور کاروبار کے لحاظ سے یہی ایک میل مربع حصہ آج دنیا میں فوقیت رکھتا ہے۔ انگلستان کا بلکہ دنیا کا سب سے بڑا بینک اسی محدود رقبہ میں ہے سینکڑوں تجارتی کوٹھیاں جن میں کروروں روپیہ کا لین دین ہوتا رہتا ہے یہیں واقع ہیں۔ البتہ رہنے کے مکانات اس حصہ میں نہیں ہیں۔ چھ بجے کے بعد کاروبار بند ہونے پر شہر میں سناٹا ہو جاتا ہے اندازہ کیا گیا ہے کہ رات کے وقت اس رقبہ کی آبادی (۱۵۰۰۰) پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن دن کو ساڑھے تین لاکھ سے زاید مرد اور عورت شہر کے حدود میں کام کرتے ہیں اور آمد و رفت رکھنے والوں کی تعداد روزانہ دس لاکھ سے اُوپر ہے ان اعداد سے یہ واضح ہوگا کہ اس چھوٹے سے شہر میں کاروبار کی اہمیت کس قدر ہے۔

شہر کے حدود میں صفائی، پولس اور عدالت وغیرہ کا انتظام لندن کے دوسرے حصّہ سے بالکل علٰحدہ ہے۔ لارڈ میئر حاکم اعلیٰ ہوتا ہے اِس کے دو افسر ہوتے ہیں جن کو شریف کہتے ہیں۔

شہر کا انتظام

لارڈ میئر کا انتخاب سالانہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی افسر عدالت کا بھی حاکم اعلیٰ ہوا کرتا ہے اس لئے ہر نومبر کی نویں تاریخ کو قدیم رسم کے مطابق بڑی شان و شوکت کے ساتھ جلوس کے ہمراہ یہ ملکی اعلیٰ ترین عدالت میں چیف جسٹس کے سلام کو جاتا ہے جملہ اراکین عدالت کے سامنے پیش ہوتا ہے اور ان کو رات کے وقت کھانے پر دعوت

دیتا ہے۔ سنتے ہیں کہ ان مراسم میں ساٹھ ہزار روپیہ کے قریب اخراجات
لاحق ہوتے ہیں جس کا بار لارڈ میئر اور اس کے مددگاروں کو اٹھانا پڑتا ہے
* لارڈ میئر کی تنخواہ سالانہ دس ہزار پونڈ ہوتی ہے۔ اس خدمت کے ساتھ
اخراجات کثیر وابستہ ہیں۔ سنا ہے کہ ختم ملازمت پر لارڈ صاحب مفلس ہو جاتے
ہیں۔ شہر کے حدود میں پولیس کی تعداد گیارہ سو آدمیوں کے قریب ہے
پورا انتظام لارڈ میئر اور ایک کونسل کے ہاتھ میں ہے۔ شہر کی آمدنی بھی ان ہی
کے اختیار سے شہر ہی کے اغراض کے لئے خرچ ہوتی ہے۔

ہجوم کی سیر

اس محدود رقبہ میں دیکھنے کے لائق بہت کچھ ہے
یہاں کے ہجوم کو دیکھنا ہے تو ایک بجے دن کے
جاؤ۔ یہ وقت لنچ کا ہوا کرتا ہے۔ جملہ ملازمین کھانے کے واسطے ریسٹوراں میں
آتے ہیں۔ پہلے سے نہ جاؤ تو جگہ ملنی دشوار ہو جاتی ہے۔ دوسرا وقت ہجوم کو دیکھنے
کا شام کو چھ بجے ہے۔ اس وقت نوکری سے فارغ ہو کر سب باہر نکلتے ہیں
موٹر بسیں اس قدر لدی ہوئی جاتی ہیں۔ کہ اکثر انتظار میں بہت دیر تک کھڑا
رہنا پڑتا ہے اس ہجوم کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنے کا موقع ملیگا کہ کس میں کثرت
سے نوجوان لڑکیاں دفاتر اور دوکانوں میں ملازم ہیں۔ جس زمانہ میں شہر فصیل
سے محصور تھا اس میں متعدد دروازے تھے جو اب محلوں کے نام سے مشہور
ہیں مثلاً مورگیٹ۔ نیوگیٹ اور لڈگیٹ وغیرہ۔

انگلستان کا بینک

شہر کے تقریباً وسط میں بینک آف انگلینڈ ہے
اس مقام پر متعدد بڑی بڑی سڑکیں ملتی ہیں
ٹرافک کی کثرت کا یہ حال ہے کہ دن بھر
میں چھ سو زمین کے نیچے چلنے والی ریلیں اس نواح میں آتی جاتی ہیں تین بجے

اُوپر موٹروں کی کثرت رستہ چلنے والوں کے لئے باعث حیرت ہے۔ لندن
کی پولس قابل تعریف ہے کہ ایسے بازاروں میں انتظام کی خوبی کی وجہ سے
حادثات برائے نام ہوتے ہیں۔ بینک کی یک منزلہ عمارت چار ایکڑ زمین پر
واقع ہے۔اس تمام عمارت میں کوئی دریچہ نہیں ہے۔ اندرونی حصہ میں صحن
بنا دیے ہیں۔ جہاں سے روشنی آتی رہتی ہے۔ یہ ترکیب حفاظت بینک کی
خاطر کی گئی ہے۔ شب کے وقت پہرے کا انتظام بہت سخت ہے۔

رائل اکسچینج

بینک کے متصل جنوب مشرقی گوشہ میں رائل اکسچینج
کی خوشنما عمارت ROYAL EXCHANGE
ہے۔ موجودہ عمارت سے قبل اس جگہ دو دفعہ عمارتیں بنیں۔ لیکن ان میں آگ
لگ گئی۔ حالیہ عمارت ۱۸۴۴ء میں ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ میں تیار ہوئی یہ انگلستان
کی کاروباری دنیا کا مرکز ہے۔ بینک کے جنوب مغربی گوشہ میں مینشن ہاوز
لارڈ میئر کے رہنے کے لئے مخصوص ہے۔

گلڈ ہال

بینک کے شمال میں کچھ فاصلہ پر وہ تاریخی مکان ہے جس کو
گلڈ ہال کہتے ہیں جس روز لارڈ میئر کا انتخاب ہوتا ہے
اس رات یہاں بڑی دھوم کی ضیافت ہوتی ہے۔ اسی مکان میں فریڈم
آف دی سٹی FREEDOM OF THE CITY کا اعزاز ملکی اور غیر
ملکی اکابر کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لارڈ میئر اور اس کے مددگاروں
کا انتخاب بھی اسی مکان میں ہوتا ہے۔ مکان کے اندر بہت سی چیزیں
دیکھنے کے لائق ہیں۔ ایک کتب خانہ اور میوزیم بھی اس میں ہے۔

لندن کا بڑا گرجا

ایک اور مشہور عمارت سینٹ پال ہے
(ST. PAUL) یہ ایک

زبردست گرجا ہے۔ اس سے قبل جو عمارت تھی وہ آتش زنی سے زائل ہو گئی گرجا کا اندرونی حصہ بہت آراستہ ہے۔ بعض اکابر قوم کی قبریں بھی اس میں ہیں مثلاً نلسن اور ڈیوک آف ولنگٹن یہیں مدفون ہیں۔ رہبر کے ذریعہ تمام عمارت کی سیر ہو سکتی ہے۔ گرجا کے میناروں سے لندن کا منظر دیکھنے کے لائق ہے۔

عدالت فوجداری

شہر کی اعلیٰ عدالت کو اولڈ بیلی کہتے ہیں۔ یہ عدالت فوجداری ہے۔ میں دو ایک دفعہ اجلاس کے کمرے میں جا چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اجلاس پر زیادہ ہجوم نہیں ہونے دیتے کیونکہ دو جگہ پولیس کا پہرہ تھا۔ مجھ سے دریافت کیا گیا کہ کس کام سے اندر جانا چاہتے ہو میں نے کہا ہندوستان سے سیر کی غرض سے آیا ہوں اور خود بھی مجسٹریٹ ہوں۔ یہاں کی عدالت دیکھنا چاہتا ہوں۔ پولیس افسر نے ایک کانسٹبل کو میرے ساتھ کر دیا کہ کمرۂ عدالت پر جو پہرہ ہے اس سے کہدو کہ یہ مجسٹریٹ ہیں ان کو اندر جانے دو اس طرح میں کمرۂ عدالت میں پہنچا۔ مقدمہ پیش تھا ایک جانب میں بھی بیٹھ گیا۔ مگر فاصلہ ہونے کی وجہ سے کچھ سنائی نہیں دیا۔ کمرۂ عدالت میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اگر سوئی بھی گرے تو آواز سنائی دے۔ ہمارے ہاں "خاموش خاموش" کہتے کہتے بیچارے چپراسیوں کے حلق خشک ہو جاتے ہیں۔ شہر کے اندر متعدد بازار ہیں جن کے منجملہ کنین اسٹریٹ۔ پرنس اسٹریٹ۔ تھریڈنیڈل اسٹریٹ کارن ہل۔ چیپ سائڈ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

لندن بزرگ

یہ تو شہر لندن ہوا۔ اب لندن کی کاونٹی یا ضلع کا حال سنیئے۔ انتظامات اندرونی کے لحاظ سے

شہر لندن کاونٹی کے ماتحت نہیں ہے۔ کاونٹی کا رقبہ ایک سو سترہ (۱۱۷) مربع میل کے قریب ہے جس کو اٹھائیس حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ ہر حصہ کو برو کہتے ہیں۔ لندن کی کاونٹی کے علاقہ میں پینتالیس لاکھ سے زاید آدمی بستے ہیں لیکن ایک لندن اور ہے جس کو GREATER LONDON یا لندن عظیم (بزرگ) کہتے ہیں۔ اس میں لندن کی کاونٹی کے علاوہ اطراف کے اضلاع کا بھی کچھ حصہ شامل کر لیا گیا ہے۔ حدود اس کے یہ ہیں کہ چیرنگ کراس کے محلہ کو قلب لندن قرار دے کر اس کے اطراف پندرہ پندرہ میل تک کے فاصلہ کو شامل کر لیا ہے اس لندن بزرگ کا رقبہ سات سو مربع میل کے قریب ہے اور مردم شماری ستر لاکھ سے زائد ہے کہا جاتا ہے کہ اس رقبہ کے اندر محلوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں ہے جن کو اگر ایک قطار میں کر دیا جائے تو لمبائی سات ہزار میل ہو گی یا یوں سمجھو کہ ہندوستان سے لیکر انگلستان یا اور آگے تک سلسلہ قائم رہے گا۔

گوشۂ مغربی

شہر لندن کے حدود جانب مغرب ٹمپل بار پر ختم ہو جاتے ہیں اور یہاں سے ایک دوسرا شہر شروع ہوتا ہے جو ضلع لندن کے علاقہ میں ہے اس کو سٹی آف ویسٹمنسٹر CITY OF WESTMINISTER کہتے ہیں۔ مشرق میں ٹمپل بار اور مغرب میں کینسنگٹن۔ شمال میں اکسفورڈ اسٹریٹ اور جنوب میں دریائے ٹیمز۔ ان حدود کے اندر کا لندن کا یہ بہترین حصہ ہے۔ اس کو ویسٹ اینڈ (یعنی گوشۂ مغربی) کہتے ہیں۔ عالیشان عمارتیں فیشن ایبل دکانیں رستوران اور ہوٹل وغیرہ اسی حصہ میں ہیں

وکٹوریہ ایمبنکمنٹ

ٹیمپل پارک کے قریب بلیک فرائرز برج ہے۔ یہاں سے جانب مغرب ہلالی وضع کی ایک مشہور سڑک دریا کے کنارے ڈیڑھ میل لمبی چلی گئی ہے دونوں جانب سایہ دار درخت ہیں تفریح کے لئے اکثر لوگ موٹر میں اس طرف آتے ہیں یہاں بعض سرکاری دفاتر اور ایک باغ بھی ہے۔ یہ سڑک ویسٹ منسٹر برج پر ختم ہو جاتی ہے۔

ایوان پارلیمنٹ

دریا کے کنارے ویسٹمنسٹر برج پر عالیشان عمارت پارلیمنٹ کی ہے خاص مقررہ دنوں میں مقررہ اوقات کے اندر اس محل کی سیر ہو سکتی ہے۔ اندر جا کر ضرور دیکھنا چاہئے۔ ساری عمارت آٹھ ایکڑ زمین پر تیس لاکھ پونڈ کی لاگت سے تیار ہوئی ہے۔ ہاؤز آف لارڈز کا کمرہ بہت آراستہ اور لائق دید ہے (۹۰) نوے لمبا اور (۴۵) پینتالیس فیٹ چوڑا ہے۔ صدر میں بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ کا تخت ہے جس پر ایک سنہری شاندار چھتری مکان کی عظمت کو دوبالا کر رہی ہے۔ تخت کے دونوں جانب ممبران عالی مرتبت کے بیٹھنے کے لئے سرخ چمڑے کے صوفے ترتیب وار بچھے ہوئے ہیں۔ سامنے کی بنچیں خاندان شاہی کے افراد کے لئے محفوظ ہیں۔ ہاؤز آف کامنس کا کمرہ آرایش اور زینت میں اس کمرے سے بہت پیچھے ہے۔

بگ بن

عمارت کے ایک گوشہ پر زبردست گھنٹہ گھر ہے جس کو بگ بن (BIG BEN) کہتے ہیں) اس نام کا ایک ٹائم پیس بھی بازاروں میں بکتا ہے۔ یہ گھنٹہ وقت کی صحت کے لحاظ سے دنیا میں بہترین شمار کیا جاتا ہے گھنٹہ کا مینار چالیس فیٹ مربع اور تین سو سولہ فیٹ بلند ہے۔ گھنٹہ کے حلقہ کا قطر ہر جانب ساڑھے بائیس فیٹ ہے

بڑی سوئی کی لنبان چودہ فیٹ اور چھوٹی سوئی کی نو فیٹ ہے۔ جنوب مغربی

وکٹوریہ ٹاور

گوشہ میں اس سے بھی بڑا ایک گھنٹہ گھر یعنی وکٹوریہ ٹاور ہے یہ تین سو چھتیس فیٹ بلند اور پچھتر فیٹ مربع ہے۔ اس گھنٹہ کے نیچے جو کمان ہے اس میں سے بادشاہ سلامت پارلیمنٹ میں داخل ہوا کرتے ہیں۔

ویسٹ منسٹر ایبی

ایوان پارلیمنٹ کے قریب ہی لندن کی مشہور اور قدیم عمارت ویسٹ منسٹر ایبی ہے ایک قلیل فیس دے کر رہبر کے ذریعہ اس مکان کی سیر ہوا کرتی ہے۔ تنہا آدمی کو سیر نہیں کراتے بلکہ کچھ لوگوں کے جمع ہونے کا انتظار کرتے ہیں انگلستان کے بادشاہوں کی تاج پوشی اسی عمارت میں ہوتی ہے اور یہیں دفن بھی کئے جاتے ہیں۔ غرض ایک ہی مقام پر تخت اور تختہ نصب ہوتا ہے عبرت کی جگہ ہے کہ کیسے کیسے جلیل القدر تاجدار بے بسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ؎

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تو انگر ہو گئے
خاک میں جس دم ملے دونو برابر ہو گئے

بادشاہوں کے علاوہ بعض مشہور افراد قوم بھی یہاں دفن ہیں۔ اس تاریخی اور قدیم عمارت میں دیکھنے کے لائق متعدد چیزیں ہیں۔ وقت واحد میں پوری سیر ممکن نہیں۔ چنانچہ میں تین دفعہ یہاں آیا۔ سب سے اچھا حصہ اس عمارت کا ایک چیپل (عبادت گاہ) ہے جس کو شاہ ہنری ہفتم نے بنوایا تھا۔ مگر اس کی تکمیل شاہ موصوف کے انتقال کے دس سال بعد ہوئی۔ یہ عبادت گاہ نہایت پر تکلف اور آراستہ ہے اس بادشاہ اور اس کی ملکہ کی قبریں بھی اسی عمارت میں ہیں۔

ایک کمرہ بیت المقدس کے نام پر ہے شاہ ایڈورڈ سوم کے زمانہ میں یہ تیار ہوا اس کے متعلق ایک عجیب روایت بیان کیجاتی ہے کہتے ہیں کہ شاہ ہنری چہارم نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اس کی موت بیت المقدس میں واقع ہوگی۔ اگرچہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہوا لیکن بیت المقدس کو روانگی کے روز اسی کمرہ میں اس کا انتقال ہوا۔ ایک اور دلچسپ کمرہ ہے جس میں موم کی مورتیں رکھی ہوئی ہیں۔ قدیم زمانہ میں یہاں ایک رسم یہ تھی کہ جنازہ کے ساتھ مرنے والے کی ہمشکل موم کی مورت بنا کر لیجایا کرتے تھے۔ اس عمارت میں جو لوگ دفن ہیں ان میں سے بعض کی مورتیں اس کمرے میں محفوظ رکھی گئی ہیں۔ ایک مورت ڈچس آف بکنگھم کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جارج دوم کی تاج پوشی کے وقت جو لباس اس خاتون نے پہنا تھا وہی اس مورت کو پہنایا گیا ہے۔

بکنگھیم پیلس

کچھ دور آگے جاؤ تو مال کی کشادہ سڑک پر سینٹ جیمس پیلیس دکھائی دے گا۔ اب اس میں بادشاہ نہیں رہتے۔ شاہ ہنری ہشتم نے یہ محل بنوایا تھا۔ اسی نواح میں کسی قدر جنوب و مغرب کی طرف بکنگھم پیلس ہے۔ اس میں بادشاہ سلامت رہتے ہیں اصل میں یہ مکان ڈیوک آف بکنگھم نے بنوایا تھا۔ ان سے شاہ جارج سوم نے خرید لیا بعد میں شاہی ضروریات کے لحاظ سے بہت کچھ ترمیم کی گئی۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم اسی محل میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا جس زمانہ میں بادشاہ اس میں ہوتے ہیں صبح ساڑھے دس بجے پہرے کا تبدیل ہونا ایک لائق دید تماشا ہے محل کے سامنے جو سڑک ایڈمرلٹی آرچ تک جاتی ہے اس کو مال روڈ کہتے ہیں یہ (۶۵) فٹ چوڑی ہے اور دونوں جانب (۳۸) فیٹ وسیع روشیں چھوڑ کر سایہ دار درخت لگائے ہیں پوری سڑک

لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔

ملکہ وکٹوریہ کی یادگار

محل کے روبرو ملکہ وکٹوریہ کی خوبصورت یادگار ہے اس کا افتتاح بادشاہ سلامت نے ۱۶ مئی ۱۹۱۱ء کو کیا تھا خالص سنگ مرمر کا مجسمہ ایک وسیع چبوترے پر قائم کیا گیا ہے۔ اطراف میں انصاف اور استقلال وغیرہ کی خیالی مورتیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ شاندار یادگار (۸۲) فیٹ بلند ہے جس مقام پر مال کی سڑک وائٹ ہال کی سڑک سے ملتی ہے وہاں ایک عالیشان کمان ایڈمرلٹی آرچ ہے۔ بکنگھیم پیلس سے جو شاہی جلوس وائٹ ہال کو جاتا ہے وہ اس کمان کے نیچے سے گذرتا ہے۔ وائٹ ہال کی سڑک پر متعدد مشہور دفاتر مثلاً انڈیا آفس دفتر خارجہ اور ہوم آفس وغیرہ ہیں۔

سینوٹاف

جنگ عظیم کی مشہور یادگار سینوٹاف ہے جسے غیر معلوم سپاہی کی قبر بھی کہتے ہیں اسی محلہ میں ہے ہر سال ۱۱ نومبر کو یہاں ایک کثیر مجمع صلح کی یادگار میں ہوتا ہے۔ اس میں بادشاہ سلامت بھی بہ نفس نفیس شریک ہوتے ہیں۔ دو منٹ کے لئے سب لوگ ٹوپی اتار لیتے ہیں اس ملک میں یہ تعظیم کی نشانی ہے لیکن ہمارے ہاں طریقہ برعکس ہے۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ چڑھاوے کے پھولوں کا انبار یہاں ہمیشہ رہتا ہے۔

ٹریفلگر اسکوئر

وائٹ ہال سے اگر سیدھے جانب شمال چلے جاؤ تو ایک وسیع چوراہے پر نکلو گے جسے ٹرافلگر اسکوئر کہتے ہیں۔ لندن جیسی بند آبادی میں اس قدر وسیع اور کھلا ہوا چوراہا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۰۵ء میں نلسن نے جو فتح ٹرافلگر کی بحری جنگ میں

فرانسیسوں کے مقابلہ میں حاصل کی تھی۔اس کی یادگار میں یہ نام رکھا گیا ہے
چنانچہ ۱۴۵ فیٹ بلند مینار پر اس بہادر جنگجو کا مجسمہ (۱۶) فیٹ طویل قائم ہے
مینار کے نیچے کی طرف چاروں کونوں پر زبردست ببر شیر بنے ہوئے ہیں
مقابل میں ایک خوبصورت فوارہ ہے اطراف میں بعض دوسرے مشہور جنرلوں
کے مجسمے ہیں۔

نیشنل گیلری

چوراہے کے شمالی رُخ پر نیشنل گیلری کی عظیم الشان
عمارت ہے۔ افسوس ہے کہ کرسی زیادہ اونچی
نہیں ہے۔ ورنہ عمارت کی شان کچھ اور ہوتی۔اس میں دنیا کی بہترین قلمی تصاویر
جمع ہیں۔اس کی سیر ضرور کرنی چاہئے۔ورانڈہ میں کھڑے ہو کر دیکھو تو چوراہے
کا منظر بہت اچھا معلوم ہوگا۔

شاہ چارلس اوّل کا مجسمہ

ٹرافلگر اسکوئر کے قریب ہی ایک سڑک پر شاہ
چارلس اول کا ایک پتلا گھوڑے پر سوار دکھائی
دیگا۔اس کے متعلق ایک روایت بیان کیجاتی
ہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۶۳۳ء میں یہ جب تیار ہوا
تو ملک میں لڑائی یعنی سیول وار شروع ہوگئی۔ پارلیمنٹ اس پتلے کی مخالف
تھی اس لئے ایک برتن ڈھالنے والے کے ہاتھ فروخت کردیا۔ جنگ کے
ختم ہونے پر بادشاہ قید کرلیا گیا اور اس پر مقدمہ قائم ہوا۔ بالآخر وہ قتل
کیا گیا۔ زندگی کی آخری شب اس نے سینٹ جیمس پیلس میں گذاری وہاں
سے اپنی قتل گاہ پر نہایت اطمینان کے ساتھ پیدل آیا جس مردانہ وار طریقہ
پر اپنی قسمت سے دوچار ہوا اس کا گہرا اثر عوام پر اس درجہ ہوا کہ لوگ
اس کی چیزوں کو یادگار اور تبرک کی طرح رکھنے لگے قلعی گر کو اس موقع پر

خوب سوجھی پتلے کو تو محفوظ کر کے رکھ دیا۔ لیکن جو پتلی دستے اس میں لگے ہوئے
تھے ان کو توڑ کر چاقو اور قینچی وغیرہ بنا ڈالے اور مشہور یہ کیا کہ اصل مورت سے
یہ اشیا بنائی گئی ہیں۔ لوگوں نے خوب خریدا مگر کچھ عرصہ بعد اس کے
باغ میں سے پتلا محفوظ حالت میں برآمد ہوا۔ جو اب تک قائم ہے۔ سنتے
ہیں کہ صنعت کے لحاظ سے لندن میں اس سے بہتر کوئی مجسمہ نہیں ہے۔

چوراہے کے مغرب کی طرف مشہور سڑک پال مال ہے۔ شاہ چارلس دوم
کو ایک کھیل کا بہت شوق تھا جسے پیل میل کہتے ہیں۔ اسی نواح میں یہ کھیل
ہوتا تھا اسی مناسبت سے سڑک کا نام رکھ دیا گیا اس محلہ میں لندن کے
بڑے بڑے کلب واقع ہیں یہاں سے دو راستے شمال کی جانب سیدھے
پکاڈلی سرکس کو جاتے ہیں ایک کا نام (ہے مارکٹ) اور دوسرے کو
واٹرلو پلیس کہتے ہیں۔ ہے مارکٹ میں امریکن اکسپرس کا دفتر ہے جس کی
معرفت ہماری ڈاک آتی تھی۔ اکثر یہاں جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ واٹرلو پلیس
میں بعض مشہور اکابر قوم کے خوشنما مجسمے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں کارلٹن ہاؤز
تھا جس میں جارج چہارم ولی عہدی کے زمانہ میں رہا کرتے تھے۔ یہ سڑک آگے
چل کر لوئیر ریجنٹ اسٹریٹ کہلاتی ہے۔ اس ہی نام پر یہ سڑک ریجنٹ اسٹریٹ
کہلانے لگی۔

پکاڈلی سرکس

پکاڈلی سرکس لندن کا مشہور اور پُر رونق چوراہا ہے
اسی چوراہے پر دو مشہور تھیٹر لندن پویلین اور
اور کرائی ٹیرین واقع ہیں۔ رات کے وقت اس نواح میں حسن فروش
عورتوں کی گرم بازاری رہتی ہے۔ پولیس کی نظروں سے بچتی ہوئی راستہ
چلنے والوں کو سو سو گھاتوں سے اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ عیسائی پادریوں کو

اکثر یہ کہتے سُنا ہے کہ انگلستان میں پیشہ ور عورتیں نہیں ہیں بلکہ مشرقی ممالک اس بدکاری میں مبتلا ہیں۔ کاش کہ کوئی ان مادریوں کو رات کے وقت اس نواح میں لیجائے اور یہاں کا تماشا دکھائے۔ مانا کہ قانوناً زناکاری بطور پیشہ اس ملک میں ممنوع ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قانون اس بارے میں بیکار ہے عملی طور پر سب کچھ ہوتا ہے میں آگے چل کر مناسب موقع پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ اِن باتوں کا تذکرہ کروں گا۔

پکاڈلی سرکس سے چار بڑی سڑکیں نکلتی ہیں۔ دو سڑکیں مشرق کی طرف جاتی ہیں ایک کو شیفٹسبری ایونیو کہتے ہیں۔ دوسری سڑک لیسٹر اسکوائر کو جاتی ہے۔ اس کو چیرنگ کراس روڈ بھی کہتے ہیں۔ مغرب کی طرف پکاڈلی اسٹریٹ اور ریجنٹ اسٹریٹ ہیں۔ ریجنٹ اسٹریٹ شمال مغرب کو جاتی ہے اور پکاڈلی جنوب و مغرب کو۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں بازار لندن کے بہترین بازاروں میں سے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی سجی ہوئی دکانیں اور اونچی عمارتیں اس نواح میں بہت ہیں اور یہی محلہ لندن کے فیشن کا مرکز ہے۔ پکاڈلی کی سڑک تقریباً ایک میل تک جانے کے بعد ہائیڈ پارک کارنر پر نکلتی ہے جو ایک بارونق چوراہا ہے پکاڈلی کے شروع میں لندن کا مشہور پکاڈلی ہوٹل ہے اس کے مقابلہ میں ایک لائق تذکرہ رسٹوراں لائنس یا پیولر کیفے ہے جس میں دو ہزار آدمی وقت واحد میں کھانا کھا سکتے ہیں۔ اس کمپنی کے متعدد رسٹوراں لندن میں ہیں۔ مناسب موقع پر اِن کا تذکرہ آئیگا۔

پکاڈلی کے دونوں جانب متعدد گلیاں ہیں جن کا ذکر خالی از طوالت نہیں مگر ایک گلی کے نکڑ پر کک کمپنی کا عالیشان صدر دفتر ہے۔ بغیر کسی کام کے بھی اندر چلے جاؤ تو وقت ضائع نہ ہوگا۔ کئی منزل کی عمارت ہے

برقی جھولوں کے ذریعہ آمدورفت ہوتی ہے۔ پیر کے دن ہندوستان کی ڈاک لینے کے لئے کثرت سے ہندوستانی طالب علم اور سیّاح یہاں نظر آتے ہیں اس کمپنی کے کاروبار کی وسعت کا اندازہ کرنا مقصود ہے تو ضرور ایک دفعہ اس دفتر کی سیر کرنا چاہیئے اس کی متعدد شاخیں لندن میں ہیں بلکہ دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کا دفتر یا کوئی ایجنٹ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تجارت کو فروغ دینے کے لئے سلیقے کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کمپنی کا بانی ایک شخص تھامس کک تھا۔ اس نے ۱۸۴۱ء میں ایک نیا خیال پیدا کیا۔ ریل کے ذریعہ ایک چھوٹا سا قافلہ سیر کے واسطے اپنے زیر انتظام لے گیا۔ اگرچہ مسافت زیادہ نہیں تھی مگر اس خیال کو جب ترقی ہوئی تو رفتہ رفتہ ایک عظیم الشان کاروباری صورت اس نے اختیار کرلی۔ چنانچہ سیر و سیاحت کے متعلق اس سے بڑی کوئی کمپنی دنیا میں نہیں ہے پانچ ہزار کے قریب تنخواہ یاب ملازم اس کمپنی میں کام کرتے ہیں۔

یہ بیان ہو چکا ہے کہ پکاڈلی ہائیڈ پارک کارنر پر ختم ہو جاتی ہے یہاں سے ایک سڑک جانب مغرب جاتی ہے جس کو نائٹس برج کہتے ہیں۔ یہ سڑک سیدھی کنسنگٹن کو چلی جاتی ہے دوسری سڑک پارک لین شمال کی طرف آکسفورڈ اسٹریٹ میں مل جاتی ہے اس سے متصل جانب غرب ہائیڈ پارک ہے جس کا ذکر باغوں کے سلسلے میں کیا جائے گا۔

پارک لین جس مقام پر آکسفورڈ اسٹریٹ سے ملتی ہے۔ اس چوراہے کو ماربل آرچ کہتے ہیں یہ ہائیڈ پارک کا شمال مشرقی گوشہ ہے یہاں ٹرافک کی بڑی کثرت رہتی ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ دن بھر میں کوئی تیس ہزار کے قریب موٹریں اس سڑک پر سے گذر جاتی ہیں۔ یہاں سنگ مرمر کی

ایک زبردست کمان ہے۔ شاہ جارج چہارم نے اسی ہزار پونڈ کے صرفہ سے یہ کمان بنوائی تھی مقصد یہ تھا کہ بکنگھم پیلس کے لئے پھاٹک کا کام دے یہاں سے مشرق کی جانب اکسفورڈ اسٹریٹ شروع ہوتی ہے۔ یہ قدیم بازار ایک میل کے قریب لمبا ہے۔ درمیان میں ایک چوراہا ہے اس کو اکسفورڈ سرکس کہتے ہیں۔ یہ بڑے سوکہ کی جگہ ہے۔ یہاں بعض مشہور ومعروف دکانیں ہیں سنتے ہیں کہ اس طرف زمین کی قیمت پانچسو روپیہ فی مربع فٹ ہے اکسفورڈ سرکس کے جنوب میں ریجنٹ اسٹریٹ ہے جو پکاڈلی سرکس کو جاتی ہے۔ یہ سڑک بھی اکسفورڈ سرکس سے گذر کر شمال کو چلی جاتی ہے اس کی لمبائی تین میل کی ہے جارج چہارم نے اپنی سہولت کے واسطے اس کو بنوایا تھا۔ ہندوستان میں محمد شاہ رنگیلے اور انگلستان میں جارج چہارم رنگیلے پن میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اس بازار میں بعض بہترین دکانیں ہیں۔ اکسفورڈ سرکس سے سیدھے اگر مشرق کو چلے جاؤ تو کچھ دور جاکر ایک عظیم الشان چوراہا سینٹ گائلس سرکس ملیگا۔ یہاں اکسفورڈ اسٹریٹ ختم ہو جاتی ہے اور نئی اکسفورڈ اسٹریٹ شروع ہوتی ہے۔ چوراہے کے شمال میں ٹاٹن ہیم کورٹ روڈ اور جنوب میں چیرنگ کراس روڈ ہے۔

چیرنگ کراس ایک اہم مقام ہے یہ قلب لندن سمجھا جاتا ہے یہیں سے پندرہ میل کے دائرے میں لندن کے حدود کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے نام کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شاہ ایڈورڈ اول کی ملکہ الیانور کا جنازہ شہر لندن سے وسٹ منسٹر کی طرف لے گئے تو راستہ میں بارہ دفعہ آرام لینے کی خاطر قیام ہوا اور ہر مقام پر بادشاہ نے ایک صلیب استادہ کی۔ اس زمانہ میں اس جگہ ایک قصبہ چیرنگ نام سے تھا۔ چونکہ یہاں بھی آرام لینے کو ٹھہرے تھے

قاعدے کے مطابق ایک صلیب استادہ کردی گئی اس مناسبت سے چیرنگ کراس
کہنے لگے۔ بعد میں پارلیمنٹ کے حکم سے یہ صلیب یہاں سے اٹھا دی گئی۔
یہاں سے مشرق کی طرف ایک مشہور بازار اسٹرینڈ ہے اس جانب ہوٹل
اور تھیٹر وغیرہ تفریح کے مقامات کثرت سے ہیں۔ یہ بازار ٹمپل بار پر ختم ہو جاتا
ہے اور یہاں سے شہر لندن کے حدود شروع ہوتے ہیں۔ قریب ہی لندن
کی عدالتوں کی عمارت ہے جسے لاکورٹس کہتے ہیں۔ دس لاکھ پونڈ اس عمارت
کی لاگت بتلائی جاتی ہے اسی نواح میں مشہور انس آف کورٹس بھی ہیں جہاں
بیرسٹری کی تعلیم ہوتی ہے کچھ اور آگے بڑھو تو فلیٹ اسٹریٹ ہے یہ لندن کے
اخباروں اور رسالوں وغیرہ کا مرکز ہے۔ اسٹرانیڈ سے متصل شمالی حصہ میں
ایک ہلالی وضع کا بازار آلڈوچ ہے اس کے دونوں کونے اسٹرانیڈ میں
نکلتے ہیں۔ آلڈوچ سے دو سڑکیں شمال کی طرف جاتی ہیں۔ ایک کنگس وے
ہے اور دوسری ڈروری لین کنگس وے اور آلڈوچ دونوں جدید بازار ہیں
اول الذکر میں ایک شاندار عمارت انڈیا ہاؤز حال ہی میں بنی ہے اس کا
افتتاح بادشاہ سلامت نے ۱۹۳۰ء میں کیا۔ ڈروری لین سے اگر
شمال کی جانب جاؤ تو برٹش میوزیم پر نکلو گے اور کنگس وے اس سے کسی قدر
آگے ہائی ہال برن پر پہنچائے گا۔ کنگس وے کے نیچے ایک ٹنل ہے
جس میں سے ٹرام جنوبی لندن کو جاتی ہے۔ برٹش میوزیم کے قریب دو محلے
قابل تذکرہ ہیں۔ ایک رسل اسکوائیر اور دوسرا گاور اسٹریٹ۔ رسل اسکوائیر ایک
کھلا ہوا مقام ہے یہاں متعدد ہوٹل ہیں۔ لندن کے آخری زمانہ قیام میں کچھ
دنوں کے لئے میں اس محلہ میں ٹھہرا تھا سستے اور مہنگے دونوں قسم کے ہوٹل
ہیں لیکن گاور اسٹریٹ میں جو اس سے ملحق ہے سستے ہوٹل بہت ہیں چنانچہ

زمین دوز ریل کا اسٹیشن - پکاڈلی سرکس لندن

ہندوستانی طالب علم اس محلہ میں کثرت سے قیام کرتے ہیں۔ پانچ چھ شلنگ روزانہ میں ناشتہ کے ساتھ ایک کمرہ ان ہوٹلوں میں مل جاتا ہے۔ لیکن یہ سب ہوٹل ایسے ہیں کہ صحن نہ ہونے کی وجہ سے تازہ ہوا مفقود ہے گاور اسٹریٹ میں ہندوستانی طلبا، کی ایک انجمن بھی ہے۔

اب تک جن مقامات اور بازارات کا ذکر کیا گیا۔ یہ سب دریا کے شمال میں ہیں۔ جنوبی حصہ اس قدر فیشن ایبل اور آباد نہیں ہے۔ تاہم بعض محلے اور بازار جنوب میں بھی بارونق اور اچھے ہیں۔ چنانچہ ایک زبردست چوراہا ایلیفنٹ اینڈ کیسل ہے۔ جہاں چھ بڑی بڑی سڑکیں آکر ملتی ہیں۔ ماسوا اس کے یہ مقام ٹریم اور موٹر بسوں کا مرکز بھی ہے۔ زمین دوز ریل کے واسطے بھی یہ ایک سنٹر ہے۔ اسی طرح ڈلچ اور برکسٹن وغیرہ بازار بھی اچھے ہیں۔ لندن جیسے شہر کے تمام بازاروں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کرنا باعثِ طوالت ہے۔ میں نے ضروری اور مشہور بازاروں کا ذکر کر دیا ہے۔

لندن کا ایک مشہور حصہ ایسٹ اینڈ یعنی گوشہ مشرقی ہے جس کو ویسٹ اینڈ یعنی گوشۂ مغربی سے کوئی مناسبت نہیں۔ نہ تو یہاں اچھی اچھی فیشن ایبل دکانیں ہیں۔ نہ کوئی آثار تمول اور امارت کے پائے جاتے ہیں بلکہ غریب اور کچھ متوسط درجہ کے لوگ رہتے ہیں۔ قدیم زمانے کی ناولوں اور کتابوں میں لندن کے اس حصہ کی بہت کچھ برائیاں پڑھی تھیں چنانچہ میں اس توقع کے ساتھ وہاں گیا۔ کہ کوئی غیر معمولی منظر دیکھنے میں آئیگا مگر مایوسی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ قدیم زمانہ کا ایسٹ اینڈ اب باقی نہیں رہا زمانہ کی رفتار نے ان غریب اور مزدور پیشہ لوگوں کی آنکھیں کھول دیں

ان کو اپنی ترقی کا احساس ہوا اور حکومت نے بھی ان کے اصلاح کی طرف توجہ کی۔ قدیم اور بوسیدہ عمارتیں گرادی گئیں۔ ان کی جگہ جدید مکانات بنائے گئے۔ قانون کی گرفت روز بروز زیادہ ہوتی گئی اس لیے اب نہ ویسے جرائم پیشہ باقی ہیں اور نہ اتنے جرائم ہوتے ہیں۔ جن کے لئے ایسٹ اینڈ مشہور تھا۔ تاہم اس حصہ کی سیر ضرور کر لینی چاہیئے۔ تاکہ تمول اور تہذیب کے مختلف مدارج کا معائنہ کر کے انسان عبرت حاصل کر سکے۔

اب چند دلچسپ مقامات اور عمارتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

برٹش میوزیم۔ یہ عمارت گریٹ رسل اسٹریٹ میں واقع ہے۔ اس میں انواع و اقسام کے عجائبات جمع کئے گئے ہیں۔ غالباً اس نمونہ کا عجائب خانہ دنیا میں نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص مہینوں اس مکان کی موجودات کا مطالعہ کرتا رہے۔ تو بھی کماحقہ سیر نہیں کر سکتا۔ داخلہ کے لئے کوئی فیس نہیں لیجاتی۔ دروازے پر موجودات عجائب خانہ کی چھوٹی اور بڑی فہرستیں ملتی ہیں۔ ان کی امداد سے سیر اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ سالانہ آٹھ لاکھ کے قریب آدمی اس عمارت میں داخل ہوتے ہیں۔

ہیمپٹن کورٹ

لندن سے پندرہ میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب کی جانب دریا کے قریب یہ محل واقع ہوا ہے۔ ۱۵۱۵ء میں کارڈینل اولسی نے اپنے واسطے بنوایا تھا۔ دس سال بعد ہنری ہشتم کو اس نے یہ عمارت نذر دیدی۔ اس کے بعد کئی بادشاہ اس محل میں رہے۔ ولیم سوم نے اس میں بہت کچھ ترمیم کروائی۔ شاہ جارج دوم کے زمانہ سے اس کی حیثیت شاہی محل کی باقی نہیں رہی۔ ایک حصہ میں کچھ وظیفہ خوار لوگ رہتے ہیں

سُرخ اینٹ کی زبردست عمارت ہے۔ انگلستان کے شاہی محلات میں اس
سے بڑی کوئی عمارت نہیں ہے۔ بلکہ بعض امور کے لحاظ سے یہ بہترین مانی
جاتی ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے ایک ہزار کمرے ہیں۔ قلمی تصاویر کا جو
ذخیرہ یہاں ہے وہ انگلستان میں بہترین تسلیم کیا جاتا ہے۔ داخلہ کے
واسطے قلیل فیس لیجاتی ہے۔ باغ میں ایک انگور کی بیل بہت قدیم
ہے کہتے ہیں کہ ۱۷۶۸ء میں لگائی گئی تھی۔ محل کے بالمقابل چمن میں ایک
بھول بھلیاں ہے۔ اکثر لوگ تفریح طبع کے لئے اس میں جاتے ہیں۔ واٹرلو
اسٹیشن سے اس مقام تک ریل جاتی ہے دریا میں کشتیاں پڑی رہتی ہیں
چاہو تو کرایہ پر کشتی لے کر دریا کی سیر کرو۔ منظر بہت اچھا ہے۔

کرسٹل پیلیس یہ زبردست عمارت لندن کے جنوب میں ہے ۱۸۵۱ء
میں ایک نمائش ہائیڈ پارک میں ہوئی تھی۔ اس
کے ختم پر جو سامان بچا اس سے تیار کی گئی۔ موسم گرما میں جمعرات کے
روز یہاں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے میلے وغیرہ بھی ہوا کرتے ہیں۔
دونوں طرف ایک ایک برج (۲۸۲) فیٹ بلند ہے اور درمیانی ہال
جس کی چھت کانچ کی ہے سولہ سو فیٹ لمبا ہے۔ شمالی برج پر زینے یا
جھولے کے ذریعے جاسکتے ہیں۔ اوپر سے لندن کا منظر دور تک دیکھنے
کے لائق ہے۔ نمائش کے طور پر اس عمارت میں بعض اشیاء رکھی گئی
ہیں۔ یہاں ایک آرکسٹرا بہت بڑا ہے۔ اس کے مقابل پانچ ہزار آدمی کی
نشست کا بندوبست ہے۔ عمارت کی پشت پر خوبصورت چمن ہے۔

ونڈسر کیسل یہ انگلستان کا مشہور اور قدیم شاہی محل لندن سے ۲۵ میل
کے فاصلہ پر جانب غرب واقع ہے۔ اگر بادشاہ سلامت

اس میں سکینٹ پڑ ہوئے ہوں تو اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ خالی ہونے کی حالت میں رہبر کے ساتھ اس کی سیر کرائی جاتی ہے۔ پیڈنگٹن یا واٹرلو اسٹیشن سے بذریعہ ریل جا سکتے ہیں۔ میں موٹر کوچ سے گیا تھا۔ ہائیڈ پارک کارنر سے متعدد کوچیں جایا کرتی ہیں۔

میڈم ٹوساڈ کی نمائش

یہ عجیب و غریب نمائش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے میڈم ٹوساڈ ایک عورت سوئیٹزرلینڈ کی رہنے والی تھی۔ پیرس میں موم کے پتلے بنانے کی صنعت سیکھی۔ وہاں بغاوت سیاسی ہوئی تو بھاگ کر لندن آئی اور یہاں موم کے پتلوں کی نمائش قائم کی۔ سینکڑوں پتلے قدِ آدم ایسے دکھائی دیں گے کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ جس آدمی یا عورت کا مجسمہ ہے اس کو لباس بھی اصل کے مطابق پہنایا ہے۔ انگلستان کے تمام بادشاہ و مشہور و معروف اکابر کے پتلے یہاں موجود ہیں۔ ایک کمرہ ایسا ہے جس میں مشہور مجرمین کے پتلے ان کے متعلقہ واقعات کے ساتھ دیکھنے میں آتے ہیں۔ مشابہت ایسی پیدا کی گئی ہے کہ اصل سے ملا کر دیکھ لو کچھ فرق نہ ہوگا اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ دھوکے میں آکر پتلوں سے راستہ دریافت کرنے لگتے ہیں۔ مجھ کو بھی اس قسم کی غلط فہمی ایک دفعہ ہوئی۔ یہ نمائش میرلی بون روڈ میں ہے۔

ٹیٹ گیلری

یہ نمائش دراصل نیشنل گیلری کی ایک شاخ ہے اس میں بہترین ماہرینِ فن کی تصاویر جمع کی گئی ہیں۔

ویلیس کلکشن

اپنے قسم کی بہترین نمائش گاہ ہے۔ مختلف اقسام کی نادر الوجود تصاویر یہاں دیکھنے میں آئیں گی یہ نایاب ذخیرہ ایک امیر کبیر سر رچرڈ ویلیس کا ذاتی تھا۔ جس نے ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔ اس کی بیوہ لیڈی ویلیس نے اس بیش بہا متروکہ کو گورنمنٹ کی نذر کر دیا۔ نمائش کی عمارت بیکر اسٹریٹ میں ہے۔

لندن میوزم

یہ ڈوور اسٹریٹ کے قریب ہے۔ قدیم زمانہ کے تمدن اور معاشرتی پہلو کا اندازہ کرنا ہے تو اس نمائش کو ضرور دیکھو۔ قدیم لندن کا ایک ماڈل دیکھنے کے لائق ہے۔ اس میں روشنی کر کے لندن کی اس تاریخی آتش زدنی کا منظر تبلایا جاتا ہے۔ جو ۱۶۶۶ء میں پانچ روز تک ہوتی رہی۔

ٹاور آف لندن

جو شخص تاریخ انگلستان سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہو وہ اس مشہور اور قدیم عمارت کے نام سے ضرور آشنا ہوگا۔ لندن کے مشرقی گوشہ میں دریائے ٹیمز کے شمالی کنارے پر اور ٹاور برج کے متصل یہ عمارت واقع ہوئی ہے۔ یہ بات تحقیق نہ ہوسکی کہ سنگ بنیاد کس زمانے میں کس نے رکھا لیکن یہ معلوم ہے۔ کہ گیارہویں صدی عیسوی میں ولیم فاتح نے بہت کچھ اضافہ کیا۔ اس عمارت نے نہ صرف قلعہ کا کام دیا۔ بلکہ شاہی محل بھی رہی ہے۔ ایک حصہ میں سیاسی قیدیوں کو بھی رکھا جاتا تھا۔ اب یہاں فوج رہتی ہے۔ اطراف کی خندق خشک کر دی گئی۔ اس میں فوجی لوگ ڈرل کرتے ہیں۔ خندق کو شامل کر لیا جائے تو اٹھارہ ایکڑ رقبہ میں یہ عمارت واقع ہوئی ہے۔ رہبر کے زیر نگرانی مختلف حصوں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ کشت و خون کے بعض

دلچسپ تاریخی واقعات اس عمارت میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ سب سے دردناک قتل شاہ ایڈورڈ پنجم اور اس کے بھائی کا تھا۔ شاہ مذکور ایک کمسن تیرہ سالہ لڑکا تھا۔ اس کا چچا رچرڈ سوم اس کو قید کر کے خود بادشاہ ہو گیا۔ اور دونوں بھتیجوں کو قتل کروا دیا۔ دوسرا دردناک واقعہ ملکہ این بولین کا ہے۔ یہ حسین عورت شاہ ہنری ہفتم کی پہلی ملکہ کیتھرین کی سہیلیوں میں داخل تھی قسمت کی یاوری دیکھو کہ بادشاہ اس کے گندمی رنگ اور رسیلی آنکھوں پر بُری طرح فریفتہ ہو گیا۔ ؎

غلامِ نرگسِ مستِ تو تاجدارانند　　خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیارانند

دل کی لگی کو پورا کرنے کے لئے بادشاہ اپنی بیوی کیتھرین کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔ بہانہ یہ نکالا کہ اس بیوی سے اولاد نرینہ نہیں ہوتی بڑی جدوجہد کے بعد اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔ آخرکار جون ۱۵۳۳ء میں این بولین سہیلی سے ملکہ بنی۔ لیکن اس سے قبل ہی بادشاہ نے خفیہ طور پر اس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ پہلے ہی سال ملکۂ الزبتھ پیدا ہوئیں۔ جس طرح دنیا کی اکثر چیزیں زوال پذیر ہیں حسن کی دل آویزی بھی ایک عارضی کیفیت رکھتی ہے چنانچہ کچھ دنوں بعد اس حسن کی ملکہ سے بادشاہ کا دل بھر گیا۔ طلاق لینے کی خاطر بادشاہ نے اس معصوم صفت ملکہ پر دو الزام رکھے۔ ایک بدچلنی کا اور دوسرا سازش کا۔ بہرحال تین سال کی حکومت کے بعد یہ نیک نہاد اور ہردلعزیز ملکہ ٹور آف لندن میں قید کر دی گئی اور وہیں قتل بھی ہوئی۔ جیمس اول اور چارلس دوم کی اسی قلعہ میں تاج پوشی ہوئی ایک کمرہ بل ٹور کے نام سے موسوم ہے اس میں کچھ عرصہ تک ملکہ الزبتھ اوائل عمری کے زمانے میں قید رہی ہیں۔ متعدد مقامات تاریخی دلچسپیوں سے مملو اس ٹور میں بتلائے جاتے ہیں۔

ہر ایک چیز کا تفصیل سے ذکر کرنا مشکل ہے۔ لیکن دو ایک مقامات اور لائق تذکرہ ہیں۔ ایک کمرہ وہ ہے جس میں مشہور و معروف سر والٹر ریلی اور فاکس وغیرہ قید رہے ہیں۔ اول الذکر ملکہ الزبتھ کا بہت مقرب درباری امیر تھا۔ شاہ جیمس اول اس سے ناراض ہو گیا۔ ایک سازش کے الزام میں اس پر مقدمہ قائم کیا گیا اگرچہ قتل کا حکم ہو گیا تھا لیکن عین وقت پر معافی اس طرح ملی کہ بجائے قتل کرنے کے قید میں رکھا گیا چودہ سال اس محبس میں مقید رہا اور اس عرصہ میں دنیا کی ایک تاریخ تالیف کر دی۔ گائی فاکس نے شاہ جیمس اول کے زمانہ میں ایک سازش میں حصہ لیا تھا جس کا منصوبہ یہ تھا کہ پارلیمنٹ کا محل بارود کے ذریعہ اڑا دیا جائے۔ تاریخ انگلستان میں یہ واقعہ گن پوڈر پلاٹ یعنے بارود کی سازش کے نام سے مشہور ہے سب سے زیادہ دلچسپ وہ کمرہ ہے جس میں شاہی جواہرات محفوظ ہیں بادشاہ اور ملکہ کے تاج مع بیش بہا ہیروں کے یہاں رکھے ہوئے ہیں اس کمرے کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔

لندن کے باغ

جن مقامات کا تذکرہ اوپر کیا گیا ان کے علاوہ لندن میں بیشمار عجائبات اور تاریخی عمارتیں ہیں۔ دیکھنے والے کے مذاق پر اس کا انحصار ہے کہ کون سی چیز دیکھے اور کون سی نہ دیکھے۔ میں نے مشہور اور عام پسند مقامات کا حوالہ دیدیا ہے اب چند ایسے باغ اور کھلے ہوئے مقامات کا تذکرہ کرتا ہوں جو لندن کے پھیپھڑے کہلاتے ہیں۔ ان ہی کے وجود سے لندن کو تازہ ہوا نصیب ہوتی ہے۔ یہ مقامات بڑی سیر و تفریح کے ہیں۔ سب سے مشہور ہائیڈ پارک ہے۔ پکاڈلی کی سڑک کا ایک حصہ اس باغ کے دروازہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس مقام کو ہائیڈ پارک کارنر کہتے ہیں۔ شام کے وقت یہاں مجمع کثرت سے

اس باغ سے ملحق مغرب کی طرف ایک ہی سلسلہ میں دوسرا باغ کنسنگٹن گارڈن ہے
اگر ہائیڈ پارک کارنر کے دروازے سے باغ میں داخل ہوں تو سامنے ہی ایک
سڑک ملیگی۔ جو گھوڑوں کی سواری کے لئے مخصوص ہے۔ اس کو راٹن رو
کہتے ہیں۔ حالانکہ اصل لفظ روٹ ڈی رائے ہے۔ قاعدہ ہے کہ غیر زبان کا
لفظ بعض دفعہ کثرت استعمال سے ایک دوسری شکل میں رواج پا جاتا ہے چنانچہ
اس فرانیسی لفظ کی انگریزوں نے پوری طرح گت بنا دی ہے یہاں تفریح
کرنے والوں کے لئے آہنی کرسیاں سلیقہ کے ساتھ کثرت سے رکھی ہوئی ہیں ایک
آنے کا ٹکٹ لے کر ان پر بیٹھ سکتے ہو۔ قریب ہی میں ایک مصنوعی تالاب ہے
اس کو سرپنٹائن کہتے ہیں۔ صبح اور شام مقررہ اوقات کے اندر کچھ فیس دینے پر
اس میں نہانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ اکثر شام کو بینڈ نوازی بھی ہوتی ہے
یہ طریقہ دوسرے باغوں میں بھی ہے باغ کے ایک جانب پھولوں کے تختے
نہایت دلفریب اور فرحت بخش ہیں۔ باغ کا شمال مشرقی دروازہ ماربل آرچ
یعنے سنگ مرمر کی کمان کہلاتا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ باغ اگرچہ تفریح
کی جگہ ہے۔ لیکن کسی قدر بدنام بھی ہے۔ اکثر شریف خیال عورتیں اس طرف
آنا پسند نہیں کرتیں۔ بعد مغرب درختوں کے نیچے راز و نیاز کے دلچسپ مناظر
دیکھنے میں آئیں گے۔ شمالی جانب جو وسیع میدان ہے اس میں بڑا مجمع
ہوا کرتا ہے متعدد گروہ کھڑے ہوئے دکھائی دیں گے۔ کہیں سیاسی مسائل پر
گفتگو ہو رہی ہے اور کہیں مذہبی لکچر ہو رہا ہے۔ موسیقی کے شوقین بھی اپنی جماعت
کے ساتھ مصروف بہ تفریح ہیں۔ ایک روز ایک دلچسپ مظاہرہ دیکھا۔ دو ڈھائی سو
آدمیوں کا مجمع تھا۔ درمیان میں ایک میز پر چند ہندوستانی کھڑے تھے سوراج
کا جھنڈا ہوا میں فرفر اڑ رہا تھا۔ ہندوستانی نمایندے باری باری سے آزادی طلب کیے

موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ قریب میں دو ایک کانسٹبل بھی نگرانی کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ میں بہت دیر تک تماشا دیکھتا رہا۔ افسوس ہے کہ یہ ہندوستانی نمایندے محدود قابلیت کے لوگ تھے۔ مافی الضمیر پوری طرح ادا کرنے پر قدرت حاصل نہ تھی۔ اکثر غیر متعلق امور پر گفتگو کرتے تھے۔ سامعین میں سے بعض ان پر معترض بھی ہوئے۔ جوابات کسی طرح معقول نہ ہوتے تھے۔ غل وشور بھی زیادہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ ایک مقرر نے تنگ آکر کہا کہ تم سننے کو آئے ہو یا غل مچانے کو بلکہ یہ بھی کہا کہ اپنی زبان کو منہ کے اندر رکھو تاکہ بدشکل نہ معلوم ہونے لگو۔

سامعین میں سے دو ایک آدمیوں نے خواہش کی کہ ہم اسٹیج پر اپنے اعتراضات خود بیان کریں گے۔ چنانچہ دو یورپین یکے بعد دیگرے اسٹیج پر آئے اور جتنا وقت ان کو دیا گیا تھا۔ اس میں ہندوستان کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردانہ کارگزاریوں کا ذکر کرتے رہے۔ عام طور پر مناظرہ کا جو حشر ہوا کرتا ہے وہی صورت یہاں بھی پیش آئی۔ ہر شخص اپنی اپنی کہتا تھا۔ جب غل زیادہ ہونے لگا تو میں وہاں سے چلا آیا۔ خوبصورتی کے لحاظ سے کنسگٹن پارک اس سے بہتر ہے۔

ہائیڈ پارک کے شمال میں کسی قدر فاصلہ پر ریجنٹس پارک ہے۔ لندن کے بڑے باغوں میں اس کا بھی شمار ہے۔ پرم روز ہل کو شامل کر کے اس کا رقبہ (۴۷۳) ایکڑ ہوتا ہے۔ شاہ جارج چہارم نے یہ باغ بنوایا تھا۔ اس کے ایک گوشہ میں ذوالعیتی چڑیا گھر ہے۔ تمام دنیا کے چرند اور پرند یہاں جمع کئے گئے ہیں کثرت سے لوگ تماشہ دیکھنے آتے ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں بائیس ہزار سے اوپر آدمی اس میں داخل ہوئے۔ اس چڑیا گھر کا افتتاح ۱۸۲۶ء میں جب ہوا تو صرف تین جانور تھے۔ ایک عقاب، ایک گدھ، اور ایک ہرن آج جاکر دیکھو تو ہر قسم کے جانور اور پرند سے اس کو بھرا ہوا پاؤ گے۔ کچھ فیس لے کر کمسن بچوں کو

ونٹ اور ہاتھی پر بھی بٹھاتے ہیں۔ قریب میں ایک مکان ہے جس میں سمندر کی مچھلیاں اور دوسرے جانور زندہ حالت میں رکھے گئے ہیں۔ اسے اکیوریم کہتے ہیں۔

دریا کے جنوب میں ایک مشہور باغ بیٹرسی پارک ہے اس میں بچوں کی تفریح کے لئے خاص انتظام کیا گیا ہے۔ نواح لندن میں چھوٹے چھوٹے متعدد پارک ہیں۔ فارسٹ ہل میں ہمارے مکان سے قریب ایک باغ تھا کبھی کبھی ٹینس کھیلنے میں وہاں چلا جایا کرتا تھا۔ متعدد لان کورٹ ہیں۔ غیر ممبر سے ایک شلنگ معینہ وقت کے اندر کھیلنے کے واسطے لیتے ہیں باغ کے ایک حصہ میں چھوٹا سا تالاب ہے۔ یہاں اسکول کے بچے آکر کھیلتے رہتے ہیں۔ کاغذ کی کشتیاں بنا کر پانی میں چلاتے ہیں۔ لندن جیسی گنجان آبادی کے لئے اس قسم کے کھلے ہوئے مقامات کی بہت ضرورت ہے

شاہی محل یعنی سینٹ جیمس پیلس کے تین طرف باغ ہی باغ ہیں۔ ایک سینٹ جیمس پارک اور دوسرا گرین پارک۔ ان دونوں باغوں کی تازہ اور نفیس ہوا سے بکنگھم پیلس میں بادشاہ سلامت بھی مستفید ہوتے ہیں۔ گرین پارک پکاڈلی اور ہائیڈ پارک کارنر سے ملحق (۵۳) ایکڑ کے ایک تکونہ رقبہ میں واقع ہے۔ لندن کا ایک پرتکلف اور مشہور ہوٹل رٹز اس باغ سے ملحق ہے۔ اور ایک گوشہ میں لندن میوزیم ہے جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔

لندن کے جنوب و مغرب میں تین سو ایکڑ زمین پر ایک خوبصورت نباتاتی باغ کیو گارڈن ہے۔ یہاں خاص چیز دیکھنے کے لائق کانچ کے مکانات ہیں ان میں گرم ملک کے اکثر درخت ایسے پائے جائیں گے جو سرد آب و ہوا میں نشو و نما نہیں پا سکتے۔ ترکیب یہ کی گئی ہے کہ ان مکانوں میں بقیاس الحرات

(۴۰) ڈگری پر رہتا ہے۔ اسی باغ سے متصل قصبہ رچمنڈ ہے۔ لندن کے نواح میں اس مقام کا منظر بہت خوبصورت شمار کیا جاتا ہے۔ دریا میں کشتیاں کرایہ پر چلتی رہتی ہیں تعطیل کے دن لوگ اس نواح میں تفریح کے لئے کثرت سے آتے ہیں۔

کھلے ہوئے مقامات میں سب سے بہتر اور مقبول جگہ ہیمپ اسٹڈ ہیتھ ہے اس کا رقبہ بہت وسیع ہے۔ تفریح کے لئے بکثرت لوگ یہاں آتے ہیں قریب میں ایک پہاڑی ہے جس کو پارلیمنٹری ہل کہتے ہیں۔ اس کی چوٹی پر سے لندن کا منظر دلکش اور بے نظیر ہے۔ سنتے ہیں کہ یورپ میں کوئی دارالسلطنت ایسا نہیں ہے جس میں اس قدر باغ اور تفریح کے مقامات ہوں۔ چنانچہ یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ لندن میں جو پارک ہیں۔ ان کا مجموعی رقبہ آٹھ ہزار ایکڑ سے کم نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اطراف لندن میں متعدد پارک اور تفریح گاہیں ہیں۔ مثلاً رچمنڈ پارک جس کا رقبہ دو ہزار ایکڑ سے زاید ہے۔ ایپنگ فارسٹ ایک خوشنما جنگل ہے جس کا ساڑھے پانچ ہزار سے زاید رقبہ ہے اور یہ پبلک کی تفریح کے واسطے مخصوص کر دیا گیا ہے اگر ان تمام باغوں کا ذکر کیا جائے جو لندن کے اطراف و جوانب میں ہیں تو فہرست بہت طول طویل ہو جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان باغوں کی بدولت لندن جیسے عظیم الشان شہر کی آب و ہوا خوشگوار اور صحت بخش رہتی ہے۔ تفریح کے بہت کچھ سامان ان باغوں میں ہوتے ہیں۔ کہیں ٹینس کورٹ ہیں کہیں کرکٹ کھیلا جاتا ہے اور کہیں نہانے کا انتظام ہے ایک روز شام کو میں ایک باغ میں چلا گیا۔ وہاں ایک سرسبز میدان میں ضعیف العمر لوگ جمع تھے۔ ان کے لئے ہلکی ورزش کا بندوبست تھا

مثلاً کچھ بڈھے قطار باندھ کر بالمقابل کھڑے ہو گئے۔ اور ایک لوہے کا گولہ اِدھر اُدھر سے لڑھکانے لگے کمسن بچوں کے لئے بھی الگ جگہ محفوظ ہوتی ہے۔ پانی یا ریت میں کھیلتے رہتے ہیں۔

محنت کے ساتھ ورزش اور تفریح کا بھی یہاں کے لوگوں کا بہت خیال ہے۔ کرکٹ کھیلنے کے لئے ایک وسیع میدان ریجنٹ پارک کے قریب ہے اس کو لارڈس کرکٹ گراونڈ کہتے ہیں۔ موسم گرما میں یہاں بڑے بڑے میچ ہوتے ہیں۔ جنوبی لندن میں ایک دوسرا کرکٹ گراونڈ اودل کے نام سے مشہور ہے۔ آسٹریلیا اور انگلستان کے درمیان کرکٹ۔ میچ یہیں ہو رہا تھا۔ لندن سے ۸میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب کی طرف ایک قصبہ ومبلڈن ہے۔ یہاں ٹینس کھیلنے کے لئے اعلیٰ درجہ کے کورٹ بنے ہوئے ہیں اور دنیا بھر کی چیمپین شپ کے میچ موسم گرما میں ہوتے ہیں تماشین لوگوں کا ہجوم اس قدر ہوتا ہے کہ بہت پہلے سے ٹکٹ نہ لئے جائیں تو جگہ نہیں ملتی۔

جسمانی ورزش اور کھیل کود کے علاوہ دوسری قسم کی تفریح کے بہت سے اسباب موجود ہیں۔ تھیٹر، سینما، وغیرہ بے شمار ہیں۔ البتہ پیرس اور برلن میں جس نمونہ کے ناچ گھر ہیں وہ لندن میں مفقود ہیں۔ بارہ بجے کے بعد سناٹا ہو جاتا ہے۔ ٹریم زمین دوز ریلیں اور موٹر بسیں یہ سب سواریاں نصف شب تک چلتی ہیں۔ الکٹرک ریل بھی نواح لندن میں بارہ بجے کے بعد نہیں چلتی۔ نصف شب کے بعد بازاروں میں وہ رونق اور چہل پہل نہیں رہتی جو پیرس اور برلن میں دیکھی گئی۔ سنا ہے کہ بعض کلب لندن میں ایسے ہیں جن میں صبح تک ناچ گانا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب تک ممبر نہ ہو جائے

یا کسی ممبر سے ملاقات نہ پیدا کرو اجنبی آدمی کا۔ داخلہ بند ہے یہ بھی سنا ہے کہ اس قسم کے کلب کے قیام کی اجازت آسانی سے مل جاتی ہے۔ چند آدمی ملکر درخواست دیدیتے ہیں اور ایک مکان میں فرضی کلب قائم کر کے عیش و عشرت کے سب سامان مہیا کر لیتے ہیں بعض خفیہ ذرایع ایسے ہیں جن کے توسل سے ہر اجنبی آدمی کچھ فیس دے کر کلب میں داخلہ کا ٹکٹ حاصل کر سکتا ہے مجھ کو ایسے مقامات پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس لئے وثوق کے ساتھ اس کے متعلق کچھ نہیں لکھ سکتا۔

تھیٹر، سینما اور میوزک ہال اعلیٰ قسم کے ویسٹ اینڈ میں بکثرت ہیں۔ وسعت کے لحاظ سے سب میں بڑا تھیٹر لائیسیم ہے۔ اس میں تین ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام ہے۔ یہ تھیٹر اسٹرانڈ میں ہے۔ دوسرا بڑا تھیٹر ہائن ہم کورٹ روڈ میں ڈومینین کے نام سے موسوم ہے۔ اور بھی مشہور اور اچھے تھیٹر ہیں جن کا ذکر باعثِ طوالت ہوگا ایک اشرفی سے لیکر دو شلنگ تک فی کس ٹکٹ ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی نشست میں جانا ہو تو پہلے سے جگہ محفوظ کرانا بہتر ہے۔ کم قیمت کے درجوں میں جگہ محفوظ نہیں ہوتی۔ اکثر ہجوم اس قدر ہوتا ہے کہ تھیٹر کے باہر لوگ قطار باندھے دور تک فٹ پاتھ پر کھڑے رہتے ہیں جب موقع جگہ خالی ہونے پر ان کو ٹکٹ ملتا ہے۔ پہلی دفعہ جب میں نے اس قطار کو دیکھا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا واقعہ ہے۔ خیال گزرا کہ یہاں بے روزگار آدمیوں کو شاید کھانا مفت دیا جاتا ہے اور یہ لوگ داخلہ کے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن بعد کو اصلیت معلوم ہوئی تماشہ کے شوقین جو زیادہ خرچ برداشت نہیں کر سکتے گھنٹوں قطار میں کھڑے رہتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ کسی بات کا شوق انتہا سے زائد

ہو جاتا ہے تو انسان اس کی تکمیل کے لئے انواع و اقسام کے مصائب اٹھاتا ہے۔ تماشہ دیکھنے کی خاطر سر بازار قطار باندھ کر کھڑا ہونا ایک بد نما طریقہ ہے لندن کے نواح میں جو تھیٹر اور سینما ہیں ان میں کرایہ کم ہوتا ہے سینما میں زیادہ تر بولنے والی تصویروں کا رواج ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ درمیان میں رقص و سرود کا پروگرام رکھ دیتے ہیں مجھ کو ان مکانات میں ایک تکلیف خاص طور پر محسوس ہوئی جس کی وجہ سے میں نے ویسٹ اینڈ کے تھیٹروں اور سینما میں جانا ترک کر دیا تھا۔ بات یہ ہے کہ یہاں پنکھوں کا رواج نہیں ہے۔ آدمیوں کی کثرت اور سگریٹ کے دھوئیں سے موسم گرما میں دم گھٹنے لگتا ہے۔ نواح لندن میں ہجوم کم ہوتا ہے۔ اس لئے تکلیف نہیں ہوتی۔ فارسٹ ہل میں ہمارے مکان سے قریب ایک بڑا سینما ہال تھا میں اکثر وہیں چلا جاتا تھا۔ جو لوگ مطالعہ کتب سے اپنے دماغ کو تفریح دینا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے متعدد کتب خانے اور ریڈنگ روم ایسے موجود ہیں جہاں بلا کچھ خرچ کئے ہوئے کام نکل سکتا ہے البتہ کوئی کتاب اپنے مکان نہیں لا سکتے تا وقتیکہ ممبر نہ ہو جاؤ۔

کھانے پینے کی دکانیں جو رسٹوران۔ ٹی روم۔ اور کیفے وغیرہ کے مختلف ناموں سے مشہور ہیں بکثرت اور ہر جگہ پائی جاتی ہیں بعض سستی ہیں اور بعض مہنگی۔ چند بڑے اور مشہور رسٹوراں ایسے بھی ہیں جہاں ڈھائی یا تین شلنگ میں خاصا کھانا مل جاتا ہے۔ مثلاً جے لائنس اینڈ کو کی متعدد دکانیں لندن میں اس نرخ پر کھانا مہیا کرتی ہیں۔ اس کمپنی کے تین رسٹوران بہت شاندار اور نہایت مقبول ہیں۔ ان کو لائنس کارنر ہاؤس کہتے ہیں۔ ایک ماربل آرچ کے قریب۔ دوسرا آکسفورڈ اسٹریٹ کے گوشہ پر

اور تیسرا پیکاڈلی سرکس کے قریب۔ یہ تینوں عمارتیں کئی منزل کی اور آراستہ ہیں۔ ان کے پیشاب خانے اور منہ ہاتھ دھونے کے کمرے دیکھو تو خیال کسی شاہی عمارت کی طرف جاتا ہے وقت واحد میں ہزاروں آدمی کھانا کھا سکتے ہیں۔ اکثر نشست خالی ملنی مشکل ہوتی ہے اور جگہ ملنے کے بعد بھی حکم کی تعمیل میں بعض دفعہ بہت دیر ہو جاتی ہے ان لوگوں کے حسن انتظام پر تعجب ہوتا ہے کہ کیسے صبح سے لیکر شام کے بارہ بجے تک ہزارہا آدمیوں کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔ جب جاؤ رسٹوران کو معمور دیکھو گے نہ صرف کھانے کی غرض یہاں پوری ہوتی ہے بلکہ سیر کا پہلو بھی مضمر رہتا ہے۔ موسیقی کے دلدادہ بھی لطف اندوز ہونے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن موسیقی کے لئے کچھ اس رسٹوران کی تخصیص نہیں جتنے بڑے رسٹوران ہیں سب میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ عام طور پر رسٹوران میں خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں منتخب کر کے ملازم رکھی جاتی ہیں۔ کاروبار کو فروغ دینے کی یہ ایک ترکیب ہے۔

ایک روز عجیب اتفاق ہوا۔ میں چائے پینے کی غرض سے کسی رسٹوران میں داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے پرانے دوست یعنی کولمبو والے شرابی صاحب بہادر اور میم صاحبہ ایک میز پر جلوہ افروز ہیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی بہت تپاک کے ساتھ دونوں کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے او ہو پولیس کمشنر، تم یہاں کیسے آئے۔ مجھے بھی اس وقت خوب سوجھی میں نے کہا کولمبو میں تم نے جو ہنگامہ برپا کیا تھا۔ اس کے متعلق تمہارے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہوا ہے۔ اور میں کئی روز سے تمہاری تلاش میں پھر رہا ہوں۔ وارنٹ کا نام سن کر صاحب بہادر کے ہوش اڑ گئے۔ لیکن میم تھی ذرا سمجھدار وہ فوراً تاڑ گئی

یہ مذاق کر رہے ہیں۔ کچھ دیر مزاج پرسی ہوتی رہی میز کے قریب ویٹر کھڑا ہوا تھا اور صاحب بہادر اس سے یہ کہنے ہی والے تھے کہ

لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا
جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

میں معذرت کر کے دوسری میز پر چلا گیا۔ کثرتِ شراب خواری کی وجہ سے بلا مبالغہ ان دونوں کے منہ پر پھٹکار برس رہی تھی۔ خدا اس بیماری سے محفوظ رکھے۔

کھانے پینے سے فارغ ہو کر یہ لوگ جب جانے لگے تو صاحب کو دروازے پر چھوڑ کر میم میرے قریب آئی اور نیچی آواز میں کہنے لگی "پولس کمشنر! یہ شخص لندن میں بھی مجھ کو ستاتا رہتا ہے۔ میرا روپیہ اب تک اس کے قبضہ میں ہے۔ کیا تم مجھ کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتے"۔ میں نے کہا مجھ کو بخشو۔ کیونکہ تمہاری کیفیت تو یہ ہے کہ کانا مجھ کو بھائے نہیں اور کانے بن سہائے نہیں۔ تم کو مشورہ دینا بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ تجربہ سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ نصیحت کا اثر تم پر الٹا ہوتا ہے

سیکھ دیجئے واکو جا کو سیکھ سہائے
سیکھ نہ دیجئے باندرا گھر بئے کا جائے

یہ جواب سن کر کسی قدر مایوسی کے ساتھ چلی گئی۔ بڑی بے حیا اور بے شرم عورت ہے۔ عالم شباب میں جو کچھ گلچھرّے اس نے اڑائے ہوں گے اس کے آثار چہرے سے نمایاں تھے۔ لیکن ہوس ابھی تک باقی ہے۔ خدا ایسی عورتوں سے بچاتا رہے۔

انگلستان میں نہانے کا ایک مقام

ہندوستانی اور غیر ملک کے رسٹوران

لندن میں ہر قسم کا کھانا میسر آتا ہے۔ شاید یورپ میں کوئی دوسرا شہر ایسا نہ ہوگا کہ جہاں اتنی کثرت سے مختلف مذاق کے کھانے مل سکتے ہوں۔ ایک محلہ سوہو اسکوئیر ہے۔ وہاں غیر ملک کے باشندے بہت رہتے ہیں۔ اس محلہ میں چینی۔ فرانسیسی۔ اطالوی اور کئی اقسام کے رسٹوران ہیں جس ملک کا کھانا چاہو یہاں ملسکتا ہے تین ہندوستانی رسٹوران مجھ کو معلوم ہیں جہاں پلاؤ۔ کوفتہ۔ اور دوسرے قسم کے ہندوستانی کھانے ملتے ہیں۔ ملازمین بھی ہندوستانی ہیں۔ رجینٹ اسٹریٹ اور پکاڈلی کے درمیان ایک گلی سوالو اسٹریٹ ہے اس میں ویرا سوامی کا رسٹوران ہے۔ یہ عمارت اچھی اور آراستہ ہے البتہ کھانا کسی قدر مہنگا ہوتا ہے سالنوں میں مرچ بھی زیادہ معلوم ہوئی۔ ایک رسٹوران لیسٹر اسکوئیر میں ہے۔ کھانا اگرچہ خاصا ہے لیکن مکان تنگ ہے تیسرا رسٹوران شفیع کا پکاڈلی کے قریب جیرالڈ اسٹریٹ میں ہے۔ یہ اگرچہ بہت مقبول ہے لیکن جگہ کی تنگی کے ماسوا باورچیخانہ کی قربت بھی تکلیف دیتی ہے۔ شفیع جس نے رسٹوران قایم کیا تھا اب زندہ نہیں ہے لیکن اس کی نوجوان بیوہ جو انگریزن ہے اس کام کو چلا رہی ہے۔ مجھ کو کئی دفعہ یہاں کھانے کا اتفاق ہوا ایک دفعہ رفیق بیگ اور سلیم بیگ نے اپنے چار احباب کو یہاں ڈنر دیا تھا۔ ایک کمرے میں لمبی میز بچھا دی گئی تھی اور ہمارے لئے مخصوص تھی۔ لیکن حبس کی وجہ سے بڑی تکلیف رہی۔ ایک دفعہ مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی (محکمۂ دارالترجمہ حیدرآباد دکن) نے غلام یزدانی صاحب کی اور میری دعوت اسی رسٹوران میں کی تھی۔ کھانا بحیثیت مجموعی اچھا ہوتا ہے لیکن یہ لوگ ہندوستانی وضع کا میٹھا اچھا نہیں بنا سکتے۔ چنانچہ گاجر کا حلوا بالکل ناقص تھی۔ اس

رسٹوران میں ہندوستانی عورتیں ساڑیاں پہنے ہوئے اکثر دکھائی دیتی ہیں اور ایسے انگریز بھی آیا کرتے ہیں جو ہندوستان میں رہ چکے ہیں۔ایک روز کسی بازار میں ایک شخص ملا جو بظاہر اینگلو انڈین معلوم ہوتا تھا مجھ کو ہندوستانی خیال کرکے اس نے روکا اور کہا کہ میں ۲۰ سال ہندوستان میں رہ چکا ہوں خشکہ اور سالن کھانے کو بہت دل چاہتا ہے۔سنتا ہوں کہ لندن میں ہندوستانی رسٹوران بھی ہیں مگر پتہ معلوم نہیں۔میں نے اس کو تینوں رسٹوران کے پتے بتا دیے۔بعض دکانیں ایسی ہیں جن میں ہلکا رفرشمنٹ ملتا ہے۔کیفیت یہ ہے کہ اونچے سائز کی لمبی میز ہوتی ہے اس کو کاؤنٹر کہتے ہیں۔میز پر کھانے کی چیزیں رکھ دیتے ہیں۔کھڑے کھڑے کھاؤ اور چلے جاؤ۔یہ طریقہ ان لوگوں کے لئے مناسب ہے جو جلدی میں ہوں اور ہلکی غذا کھانا چاہتے ہوں جرمنی میں جو آٹو بفے دیکھے تھے ان کا رواج یہاں ابھی نہیں ہوا ہے مگر اس قسم کا ایک رسٹوران بڑے پیمانہ پر اسٹرینڈ میں تیار ہو رہا ہے عنقریب جاری ہو جائے گا۔یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ کچھ انعام رسٹوران کے ملازمین کے واسطے چھوڑنا پڑتا ہے۔عام طور پر ایک پنس فی شلنگ کافی ہوگا یا یوں سمجھو کہ بارہ آنے کا کھانا کھایا جائے تو ایک آنہ انعام کا ہوا۔اس انعام کو یہاں کے محاورہ میں ٹپ کہتے ہیں اس کا دستور عام ہے۔ہوٹل کے ملازمین کو بھی ٹپ دینی پڑتی ہے۔اس ٹپ کے ذریعہ اس قدر آمدنی ہوتی ہے کہ بعض مالکین اپنے ملازمین کو تنخواہ بھی نہیں دیتے۔بلکہ الٹا ان سے وصول کر لیتے ہیں۔

انگریزی کھانا

انگریزی کھانا سیدھا سادھا اور زود ہضم ہوتا ہے۔اصل پوچھو تو یہاں کا کھانا ابلے ہوئے گوشت

اُبلے ہوئے آلو اور انڈوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سیاہ مرچ اور نمک حسب ضرورت کھانے کے وقت اوپر سے ڈال لیتے ہیں۔ کچے ٹماٹے بھی بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ انگریزوں نے فرانس اور اٹلی کے نفیس کھانوں کو اپنے ہاں شامل کرلیا۔ عموماً وقت واحد میں دو قسم کے کھانوں سے زیادہ نہیں کھاتے۔ دو تین قسم کے گوشت زیادہ مروج ہیں۔ بکرے کا گوشت مٹن کہلاتا ہے گائے کا گوشت بیف اور سور کا گوشت کئی قسم کا ہوتا ہے اس بات کا خیال رکھنا ضرور ہے کہ اکثر ہوٹلوں میں ناشتے کے ساتھ جو انڈا دیتے ہیں اس کے ساتھ ایک ٹکڑا بیکن یعنی سور کے گوشت کا بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ ہوٹل والوں کو منع کر دیا جائے تو وہ اس کی جگہ کوئی دوسری چیز بھی دے سکتے ہیں۔ گوشت کے متعلق کسی وقت شبہ ہو تو دریافت کرلینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ دھوکے کا موقع بہت کم ہوتا ہے کیونکہ میز پر کھانے کی فہرست لگی رہتی ہے جو چیز مانگو گے وہی دیجائیگی میٹھا کئی قسم کا ہوتا ہے۔ فروٹ سلاد زیادہ مقبول ہے۔ کئی قسم کے میوے شریک کرکے اسے تیار کرتے ہیں مچھلی کثرت سے ملتی ہے اور کئی قسم کی ہوتی ہے لیکن سول اور پلیس کا زیادہ رواج ہے اکثر اس کو اُبال کر کھاتے ہیں روٹی کا استعمال برائے نام ہے۔ کھانے کے ساتھ محض دفع الوقتی کی غرض سے ایک آدھ توس کھا لیتے ہیں۔ یہاں کی روٹی وہی ہے جس کو ہم نان پاؤ یا ڈبل روٹی کہتے ہیں۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے ایک سفید دوسری بھوری۔ بھوری روٹی زود ہضم ہے۔ کھانے کے ساتھ آئیس کریم کھانے کا بھی رواج ہے۔ برلن اور پیرس کی طرح یہاں شراب کا استعمال زیادہ نہیں ہے۔ کھانے کے ساتھ عام طور پر پانی پیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ

یہاں شراب مہنگی بہت ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں اکثر غیر ملک سے آتی ہیں۔ حتیٰ کہ گوشت اور انڈے وغیرہ بھی باہر سے آتے ہیں۔ ماکولات کے لئے یہ ملک ممالک غیر کا اس قدر محتاج ہے کہ اگر ان چیزوں کی درآمد بند کردی جائے اور زندگی کا انحصار ملکی پیداوار پر رہے تو غالباً چھ مہینے سے زیادہ یہ لوگ زندہ نہیں رہ سکتے۔

ایک تکلیف دہ طریقہ یہ ہے کہ کھانے کے بعد کلی نہیں کرتے جن کو عادت کلی کی ہے انہیں پہلے تو بے چینی رہے گی مگر بعد میں عادت پڑجاتی ہے اور خیال بھی نہیں آتا کہ ہم نے یہ کام نہیں کیا۔ لیکن یہ طریقہ دانتوں کے واسطے مضر ہے اس لئے اس ملک میں دنداں سازی کا پیشہ فروغ پر رہتا ہے غنیمت ہے کہ کھانا چکنا نہیں ہوتا ورنہ اور بھی مصیبت ہوتی۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں کھانے کے بعد خلال کرنے کا رواج ہے۔ اکثر رسٹوراں والے خود خلال پیش کرتے ہیں۔ مگر انگلستان میں یہ طریقہ معیوب ہے صبح کے ناشتہ کو بریک فاسٹ کہتے ہیں دوپہر کے کھانے کو بعض لوگ ڈنر اور بعض لنچ کہتے ہیں۔ ہماری مالکہ مکان دن کے کھانے کو ڈنر اور رات کے کھانے کو سپر کہتی تھی۔ ہندوستان میں عام طور پر ڈنر رات کے کھانے کو کہتے ہیں۔

پبلک کی سہولت کا خیال

پبلک کی سہولت کا خیال اس ملک میں بہت زیادہ ہے اگر ان باتوں کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ضرور ہے کہ کاروباری لوگوں کا قیمتی وقت ضایع ہوا کرے گا۔ وقت کی یہ لوگ بہت قدر کرتے ہیں جہاں تک ممکن ہے وقت بچانے کی ترکیب اختراع کرتے رہتے ہیں۔ اس موقع پر تمثیلاً چند چیزوں کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سگریٹ کی مشین

بعض چیزیں مشین کے ذریعہ مل جاتی ہیں۔ مثلاً سگریٹ، چاکلیٹ، کشمش، باوام وغیرہ شام کو ۶ بجے کے بعد دکانیں عام طور پر بند ہو جاتی ہیں اس لئے اس قسم کی مشینیں بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔ اس کی شکل ایک لیٹر بکس کی سی ہوتی ہے۔ اندر سگریٹ کی ڈبیوں کا ذخیرہ ہوتا ہے اوپر سگریٹ کی قسم لکھی ہوتی ہے عام طور پر چھ آنہ کی ہوتی ہے۔ ایک جانب مشین میں سوراخ ہوتا ہے اس میں نصف شلنگ کا سکہ ڈالدو اور سامنے والے خانے کو کھینچ لو اس خانہ میں ڈبیہ رکھی ہوگی۔ سگریٹ یہاں بہت اچھا ہے زیادہ تر گولڈ فلیک اور پلیرس وغیرہ پیتے ہیں۔ سیزر کوئی نہیں جانتا۔ یہاں کا گولڈ فلیک اچھا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں جو مستعمل ہے وہ ادنیٰ قسم کا ہے۔ سگار بہت مہنگا ہوتا ہے۔ میں نے ایک مشین جوتہ پوچھنے والی لندن کے کسی اسٹیشن پر دیکھی ہے اس میں ایک برش چرخی نما لگا ہوا تھا ایک پنس اس میں ڈال کر اگر پاؤں اندر کردو تو جوتہ پر برش ہوجاتا ہے۔

ٹیلیفون

جگہ بہ جگہ ٹیلیفون موجود ہے کوئی ہوٹل کوئی رسٹوران اور کوئی دکان اس سے خالی نہیں۔ عوام کے استعمال کے لئے بکثرت ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں۔ ریلوے اسٹیشنوں پر خواہ وہ زمین کے اوپر ہوں یا زمین کے نیچے یہ چیز موجود ہے بازاروں میں جابجا ٹیلیفون کے کمرے بنے ہوئے ہیں کیفیت اس کی یہ ہے کہ لکڑی کا ایک چھوٹا کمرہ ہوتا ہے۔ اکثر مقامات پر متعدد کمرے مسلسل بنے ہوئے ہیں ہر کمرے میں ایک ٹیلیفون لگا ہوا ہے۔ بات کرتے وقت دروازہ اندر سے بند کرلیا جاتا ہے تاکہ اطراف کے غل وشور کی وجہ سے ہرج واقع نہ ہو۔ تین منٹ کیلئے

بات کرنے کی فیس دو پنس ہے۔ اجنبی آدمی کو چاہئے کہ پہلے اس کی ترکیب بخوبی سمجھ لے ورنہ پریشانی ہوگی۔ مجھے ہمیشہ سے ٹیلیفون پر بات کرنی نہیں آتی۔ کچھ وحشت ہونے لگتی ہے اور بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ لندن میں اور بھی مشکل ہوئی ٹیلیفون کے پہلو میں طریقۂ استعمال بتانے کے لئے ایک ایک نوٹس لگا ہوا ہے۔ پہلے دو پنس سوراخ میں ڈال دو پھر رسیور اٹھاؤ ٹیلیفون آفس سے ملا پاؤ گے۔ ملازم لڑکی دریافت کرے گی کس نمبر سے بات کرنا چاہتے ہو نمبر کا یاد رکھنا لازمی ہے۔ اگر معلوم نہ ہو تو ڈائرکٹری دیکھ سکتے ہو جو وہیں لٹکی رہتی ہے ٹیلیفون کی اغراض کے لئے حلقے مقرر کر دیے ہیں۔ نمبر کے ساتھ حلقہ کا نام لینا ضروری ہے۔ مثلاً ہمارے مکان کے ٹیلیفون کا پتہ یہ تھا۔ (سیڈلن ہیم ۲، ۶، ۷) یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ نمبر بتلاتے وقت ہر ہندسہ کو الگ الگ بولنا چاہئے یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ سات ہزار چھ سو بہتر یا چھہتر۔ بہتر۔ بلکہ یوں کہنا پڑے گا۔ نمبر سات۔ چھ۔ سات۔ دو۔ یہ طریقہ اس لئے ہے کہ نمبر سمجھنے میں غلطی واقع نہ ہو۔ نمبر بتلا دینے پر دفتر والی لڑکی ٹیلیفون ملا دے گی۔ اگر وہاں بات کرنے والا آدمی موجود ہے تو بات کرنے سے پہلے ایک اور کام کرنا پڑتا ہے ٹیلیفون کے پہلو میں دو بٹن لگے ہوئے ہیں ایک پر (A) اور دوسرے پر (B) لکھا ہوگا۔ ملازم لڑکی بات نہیں کرنے دیگی۔ جب تک کہ بٹن (A) نہ دبا دیا جائے۔ اس کو دبانے سے وہ پیسے جو سوراخ میں ڈالے گئے تھے۔ ٹیلیفون کے خزانے میں جمع ہو جائیں گے۔ پیسوں کے جانے کی آواز بھی آتی ہے یہ عمل کر دینے کے بعد پیسے کسی حالت میں واپس نہیں مل سکتے۔ البتہ اگر بٹن (A) دبانے سے قبل معلوم ہو جائے کہ بات کرنے والا جگہ پر نہیں ہے۔ یا ٹیلیفون کی لائن

مصروف ہے تو ایسی صورت میں بٹن (B) دبا دینا چاہیئے۔ دونوں پیسے کھٹ سے باہر نکل آئیں گے گویا تمھاری رقم تم کو واپس دیدی گئی۔ مجھ کو شروع میں بڑی غلط فہمیاں ہوتی رہیں اکثر بازار سے اپنی مالکہ مکان کے ساتھ بات کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک روز لندن کے کسی بازار سے مالکہ مکان کو اطلاع دینا چاہتا تھا کہ کھانا باہر کھاؤں گا اس وقت تک ٹیلیفون سے زیادہ واقفیت نہیں ہوئی تھی۔ پیسے تو ڈال دیے تھے لیکن بات کرتے وقت ملازم لڑکی نے روک دیا اصل میں وہ کہتی تھی کہ پہلے بٹن (A) دبالو بعد کو بات کرنا کسی وجہ سے میری سمجھ میں نہ آیا۔ بار بار اس سے مطلب پوچھتا تھا بالآخر اس نے جھنجھلا کر کہا کہ میں سیدھی سادھی انگریزی بول رہی ہوں تمھاری سمجھ میں نہیں آتا تو مجبوری ہے میں نے پریشانی میں بٹن (B) دبا دیا۔ پیسے واپس نکل آئے بڑی کوفت ہوئی پیسے لے کر واپس جانے والا ہی تھا کہ اس لڑکی نے گھنٹی بجائی۔ میں نے ریسور کان سے لگایا تو اس نے کہا تم واپس کیوں جاتے ہو دوبارہ پیسے ڈالو اور بٹن (A) دباؤ۔ میں ٹیلیفون ملائے دیتی ہوں اس دفعہ بات سمجھ میں آگئی پھر کبھی ایسی غلطی نہیں ہوئی۔

پبلک بیت الخلاء

بیت الخلا اور پیشاب خانے بھی جابجا موجود ہیں۔ عورتوں کے واسطے الگ اور مردوں کے لئے الگ اکثر ان مکانات میں منھ ہاتھ دھونے کا سامان بھی ہوتا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی تولیہ استعمال کر لیا جائے تو خادم اس کو وہاں سے اٹھالے گا۔ اور اس کی جگہ دوسرا پاک ستھرا تولیہ رکھ دیگا منھ ہاتھ دھونے کی فیس تین آنے کے قریب لیجاتی ہے۔ پیشاب خانہ کا

استعمال بلا معاوضہ ہے۔ البتہ بیت الخلا کے واسطے دو پنس کا سکہ دروازہ کے
سوراخ میں ڈالنا پڑتا ہے۔ ورنہ دروازہ نہ کھلے گا۔ پبلک بیت الخلا میں
ایک چیز تکلیف دہ یہ ہے کہ پانی کا بندوبست نہیں ہوتا۔ البتہ کاغذ کا ذخیرہ
بہت کافی ہوتا ہے بعض ہوٹلوں میں بھی یہی مصیبت دیکھی گئی کہ بیت الخلا
الگ اور غسل خانہ الگ۔ ایسی صورت میں مشرقی معاشرت والوں کو بڑی تکلیف
گذرتی ہے اس سلسلہ میں ایک لطیفہ سننے کے لائق ہے۔ لندن میں باتھ روم
جانے وقت میں اپنے کمرے کا گلاس ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ لیکن باوجود
کوشش کے اکثر وہیں بھول آتا۔ چیمبر میڈ بیچاری انجان۔ اس کی ٹھوکر ضرور
لگتی اور گلاس ٹوٹ جاتا۔ جب دو تین گلاس اس طرح ٹوٹ چکے تو اس نے
غلام یزدانی صاحب سے شکایت کی۔ کہتی تھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر
باتھ روم میں گلاس لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ واقعی یہ بیچاری کیا جانے
کہ اس میں سٹریٹیجک کی کیا مصلحت ہے۔ مشرق اور مغرب میں زمین آسمان
کا فرق ہے۔ ایک ہندوستانی طالب علم وطن سے پانوں کا پارسل منگوایا
کرتے تھے۔ پیشاب کے برتن کو انھوں نے اگالدان قرار دیا۔ صبح کو چیمبر میڈ
کمرہ صاف کرنے آئی تو حیران رہ گئی۔ نہایت پریشانی کے ساتھ اس نے مالکہ
مکان کو رپورٹ دی کہ یہ شخص کسی مرض مہلک میں مبتلا ہے اس کو خون کی
قے آتی ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا تشخیص ہوئی ہے۔

گم شدہ مال کی بازیافت

گم شدہ مال کی بازیافت کا انتظام بھی بہت معقول ہے
کرایہ کی سواریوں میں اگر کوئی چیز بھول جاؤ تو
اس کے متعلق وکٹوریہ امبینک منٹ پر نیو اسکاٹ
لینڈ یارڈ کے دفتر میں دریافت کرو اغلب ہے کہ چیز مل جائے گی۔ تین مہینے تک

مالک کا انتظار کرکے چیز اس گاڑی والے کو دیدی جاتی ہے جس نے داخل کی تھی اس طریقہ میں خوبی یہ ہے کہ گاڑی والے آئندہ کی امید پر بھولی ہوئی چیزیں دفتر میں داخل کر دیتے ہیں۔ حکومت خود اس مال کو لے لیا کرے تو نتیجہ اتنا اچھا نہیں ہوگا معلوم ہوا ہے کہ جس قدر مال سالانہ اس دفتر میں داخل ہوتا ہے اس کا تقریباً نصف مالکوں کو واپس ملتا ہے۔ بقیہ گاڑی والوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ مالک کو چیز واپس کرتے وقت ایک قلیل رقم اس سے وصول کرکے مال داخل کرنے والے کو دی جاتی ہے۔

ذرائع آمدورفت

آمدورفت کے ذرائع بہت وسیع ہیں اتنے بڑے شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جانے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ زمین کے اوپر اور نیچے دن بھر سینکڑوں ریلیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ بقول حکیم خواجہ محمد اسمعیل صاحب ذبیح۔

ریل ہے زیر زمیں طیارے اوپر صرف طیر
اور موجودات نامحسوس ہیں پیغامبر

زمین کے نیچے کی ریل

زمین کے نیچے چلنے والی ریل کو انڈر گراونڈ ریلوے کہتے ہیں سارے لندن میں زمین کے نیچے ان ریلوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ بعض مقامات پر تو دریا کے نیچے سرنگ لگا کر ریل لے گئے ہیں۔ ہر جگہ اسٹیشن موجود ہے۔ جہاں گہرائی زیادہ ہے وہاں برقی جھولے لگے ہوئے ہیں۔ بعض اسٹیشنوں پر ایک نئی ترکیب آمدورفت کی دیکھی گئی۔ مثلاً پکاڈلی کے انڈر گراونڈ اسٹیشن میں دو جگہ چلتے ہوئے زینے ہیں جن کو موونگ اسٹیس کہتے ہیں کثرت ٹریفک سے جو ہجوم ہوجاتا ہے اس کی مشکلات کو رفع کرنے کے لئے یہ ترکیب نکالی گئی ہے۔ یہ

زینے بجلی کی قوت سے چلتے رہتے ہیں۔ ایک زینہ سے نیچے اترتے ہیں دوسرے
سے اوپر جاتے ہیں۔ ہر وقت زینوں کو چلتا ہوا دیکھو گے۔ اوپر کی سیڑھی پر آدمی
کھڑا ہو جائے تو خود بخود نیچے پہنچ جائے گا۔ یہی طریقہ نیچے سے اوپر جانے کا
ہے۔ مسلسل لوگوں کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔ جن کو جلدی ہوتی ہے وہ
ان زینوں پر خود بھی چلتے جاتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک گھنٹہ میں
تقریباً گیارہ ہزار آدمی ایک زینہ کو استعمال کر سکتے ہیں۔ زمین کے نیچے ریل
۱۸۵۳ء سے چلتی ہے۔ زینے ۱۹۱۱ء سے جاری ہوئے۔ ان ریلوں کی صحیح
رفتار مجھے معلوم نہیں۔ مگر احساس یہ ہوتا ہے کہ بہت تیز جاتی ہیں۔ اسٹیشن بہت
صاف ستھرے، روشن اور ہوادار ہیں۔ پکاڈلی کا اسٹیشن بالخصوص بہت اچھا ہے
میوے اور سگریٹ وغیرہ کی دکانیں بھی ان اسٹیشنوں پر موجود ہیں۔ بعض
اسٹیشنوں پر رستوران بھی ہیں۔ کرایہ فاصلہ کے لحاظ سے لیا جاتا ہے۔ مگر ایک آنہ
سے کم نہیں ہوتا۔ اسٹیشن پر ٹکٹ گھر تو ضرور ہوتا ہے لیکن بعض بڑے اسٹیشنوں
پر مشین لگی ہوئی ہیں۔ ہر مشین پر ٹکٹ کی قیمت لکھی ہوتی ہے اور ان مقامات
کی فہرست لگی رہتی ہے۔ جہاں اس ٹکٹ سے جا سکتے ہو۔ مقررہ قیمت ڈالنے
پر ٹکٹ خود بخود نکل آتا ہے۔ نئے آدمی کو ان اسٹیشنوں پر کسی قدر پریشانی ضرور
ہوتی ہے لیکن غور و سمجھ سے کام لیا جائے تو کوئی دشواری نہ ہوگی۔ بڑے
اسٹیشنوں میں راستے کسی قدر پیچیدہ اور متعدد پلیٹ فارم ہیں۔ دیواروں پر
نقشے لگے رہتے ہیں اور راستہ معلوم کرنے کے لئے ہدایتیں لگی ہوئی ہیں
ہر تیسرے منٹ پر ایک ریل آتی ہے۔ یہ ریل کس طرف جائے گی۔ ٹھہرے گی
یا نہیں اس کے متعلق بجلی کی روشنی کے ذریعہ نوٹس دیتے رہتے ہیں الغرض
سہولت کا ہر طرح انتظام کیا گیا ہے۔ ان گاڑیوں میں بھی درجہ اول اور سوم

ہوتا ہے بعض دفعہ ریل تبدیل کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے ایک گائڈ بک
اگر خرید لو بڑی سہولت رہے گی۔ صبح کے دس بجے اور شام کو چھ بجے کے
قریب مسافروں کی بڑی کثرت رہتی ہے۔

دانایان فرنگ کو دیکھو زمین کے نیچے و نیز عالم بالا میں انھوں نے کیا کچھ ہنگامہ بپا
کر رکھا ہے عقل بھی کیسی نعمت خداداد ہے اسی نے انسان کو اشرف المخلوقات کا رتبہ بخشا اسی
کی وجہ سے انسان نہ صرف حیوانات کے مقابلہ میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے بلکہ آپس
میں بھی انفرادی طور پر یہی چیز ایک دوسرے پر برتری دیتی ہے اور بین الاقوامی دوڑ میں
ہار جیت کا دارومدار بہت کچھ اسی کے طریقۂ استعمال پر ہے۔ بزرگی بعقل است نہ بسال
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یورپین اقوام میں عقل قدرتی طور پر ہم سے زیادہ ہوتی ہے۔ تجربہ
اور مشاہدہ بتلاتا ہے کہ خداوند کریم نے ہندوستانیوں کو عقل بھی کافی مقدار میں عطا کی ہے۔
یوروپین اقوام کو کچھ خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ یہ لوگ
اپنی عقل کو مفید کاموں میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ ہماری کیفیت اس کے
برعکس ہے۔ ہم لوگ اپنے کاموں کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیتے ہیں بیشک
ہر چیز منجانب اللہ ہے۔ لیکن خداوند کریم نے دنیا کو کارخانۂ اسباب قرار دیا ہے
ہاتھ پاؤں ہلانا ضروری ہے۔

معمولی ریل

زمین کے اوپر اطراف لندن میں بجلی کی قوت
سے متعدد لوکل ٹرینیں چلتی ہیں۔ یہ سب
ریلیں رات کے بارہ بجے بند ہو جاتی ہیں لوگ عام طور پر تیسرے درجہ میں سفر
کرتے ہیں یہاں کا تیسرا درجہ ہمارے ہاں کے درجۂ اول سے اچھا ہوتا ہے۔
سگریٹ پینے والوں کے لئے گاڑیاں الگ ہوتی ہیں زنانہ اور مردانہ کی تخصیص
نہیں عورت مرد سب ساتھ بیٹھتے ہیں۔

موٹر بس

زمین دوز ریلوں کے علاوہ موٹر بس۔ ٹریم اور ٹیکسیوں کا کوئی حساب نہیں۔ موٹر بس لندن کے ہر حصہ میں چلتی ہے البتہ ٹریم صرف باہر کے حصوں میں جاری ہے۔ موٹر بس دو منزل کی زبردست گاڑی ہوتی ہے۔ ان کا بھی ایک جال تمام شہر میں پھیلا ہوا ہے۔ کانڈیک ہر جگہ مل جاتی ہے بعض موٹروں میں اوپر کی منزل کھلی ہوتی ہے۔ اور بعض میں ڈھکی ہوئی۔ سگریٹ پینے والوں کے لئے یہی سہولت بخش ہے۔ کیونکہ نیچے کی منزل میں سگریٹ پینے کی ممانعت ہے اس میں شبہ نہیں کہ لندن کی سیر کرنے کا ایک بہترین ذریعہ موٹر بس ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اوپر کی منزل پر بیٹھو بالخصوص موٹر بس (E .۱۱) جو وکٹوریہ اسٹریٹ سے لیورپول اسٹریٹ تک جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے نہایت اہم ہے۔ لندن کے بہترین حصہ میں سے یہ گذرتی ہے۔ کرایہ فاصلہ کے لحاظ سے لیتے ہیں۔ لیکن ایک آنہ اقل ترین ہے۔ یہ سواری اتنی مقبول ہے کہ اکثر اوقات مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جگہ نہیں ملتی۔ معلوم ہوا ہے کہ سالانہ اسّی کروڑ آدمی ان میں سوار ہوتا ہے اور اب تک ایک روز میں زیادہ سے زیادہ پچیس لاکھ آدمی ان میں بیٹھے ہیں۔ یہ گویا ایک روز کی ٹرافک کا ریکارڈ ہے۔ ہر گاڑی کی پیشانی پر تختی لگی ہوتی ہے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ کہاں جا رہی ہے اور راستہ میں کون سے مقامات پڑینگے جا بجا ان کے ٹھہرنے کے لئے اسٹیشن بنے ہوئے ہیں۔ وہاں ضرور ٹھہرتی ہے بعض مقامات ایسے ہیں جہاں اشارہ کرنے پر ٹھہرتی ہے۔ ہر گاڑی پر نمبر رہتا ہے مقررہ نمبر کی گاڑیاں مقررہ مقامات پر جاتی ہیں۔ یہی کیفیت ٹریم گاڑیوں کی ہے ساڑھے دس اور ساڑھے چار بجے کے درمیان کرایہ دو آنہ سے زیادہ نہیں ہوتا ان اوقات کے بعد پانچ آنے تک ہو جاتا ہے۔

ٹیکسی

ٹیکسیاں کثرت سے ہیں۔ ان کے کرایہ کی کیفیت یہ ہے کہ دس منٹ کے اندر ایک میل کے واسطے ایک شلنگ لیتے ہیں۔ اس کے اوپر ہر چوتھائی میل اور ڈھائی منٹ کے واسطے تین پنس لیں گے اگر تیسرا آدمی بیٹھے گا تو اس کا کرایہ نو پنس لیا جائے گا۔ اور اگر کوئی سامان موٹر کے باہر رکھو تو فی پیکٹ تین پنس لیں گے۔ کرایہ کے علاوہ موٹر والے کو ٹپ دینے کا رواج بھی ہے۔ بہرحال یہ سواری مہنگی ضرور پڑتی ہے۔ ہر ٹیکسی میں کرایہ کا میٹر لگا ہوتا ہے۔ اس پہ ایک جھنڈی ہوتی ہے۔ سواری کی حالت میں یہ جھنڈی نیچے کردی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ کرے تو میٹر بند رہے گا۔ میٹر اگر خراب ہو گیا ہو تو موٹر والا عوام کی اطلاع کے لئے ایک دھجی اس پر باندھ دے گا۔ الغرض نقل و حرکت کے لئے ہر قسم کی سہولت موجود ہے۔

ٹریفک کا انتظام

بازاروں میں اگرچہ ٹریفک کی کثرت رہتی ہے۔ لیکن پولیس کا انتظام اس قدر اچھا ہے کہ حادثات بہت کم ہوتے ہیں۔ علاوہ حسن انتظام کے یہ بات بھی ضرور ہے کہ یہاں کے لوگ قاعدہ اور قانون کے پابند ہوتے ہیں بچپن ہی سے تربیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ ڈسپلن ان کی فطرت ثانی ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک پولیس کانسٹیبل ہزارہا آدمیوں اور موٹروں کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ راستہ چلنے اور سڑک عبور کرنے کے لئے جو کچھ قواعد اور ہدایات نافذ ہیں ان کی پابندی سب لوگ کرتے ہیں۔ پولیس کانسٹیبل کا فرض صرف اشارہ کر دینا ہے۔ باقی سب کام خودبخود ہوتا رہتا ہے۔ سڑکوں پر جہاں ٹریفک زیادہ رہتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے چبوترے بنے ہوئے ہیں۔ اور نوٹس لگا ہوا ہے کہ اس مقام پر سے عبور کرو۔ ماسوا اس کے اکثر مقامات پر زمین کے نیچے راستہ بنا دیا ہے جس کے

ذریعہ آدمی سڑک کی دوسری طرف بآسانی نکل سکتا ہے۔ اجنبی آدمی کو احتیاط کی بہت ضرورت ہے اول تو ہمیشہ فٹ پاتھ پر راستہ چلنا چاہیئے۔ نیچے اُترنے میں خطرہ ہے دوسرے یہ کہ سڑک کو عبور کرنے کے لئے بڑی احتیاط اور قواعد کی پابندی لازمی ہے کیونکہ موٹریں بالکل خاموشی کے ساتھ دوڑتی رہتی ہیں۔ ہارن عام طور پر نہیں بجاتے بلکہ خاص موقعوں پر۔ اس کا استعمال کرتے ہیں ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے ورنہ بازار میں شور وغل کی وجہ سے کچھ پتہ نہ چلے گا کہ کس طرف سے آواز آئی۔ پہلو کی گلیوں میں سے موٹریں اکثر چپکے سے آجاتی ہیں اسلئے اول دیکھ لینا چاہیئے کہ کوئی موٹر تو نہیں آرہی ہے۔

اسٹیشنوں پر ہجوم

لندن کے ہجوم کا اندازہ کرنا ہو تو واٹرلو اور لیورپول اسٹریٹ اسٹیشنوں پر صبح یا شام کے وقت جاؤ اور دیکھو کس قدر مخلوق اطراف سے کاروبار کی خاطر لندن میں آتی ہے اسٹیشن تو متعدد ہیں لیکن دو اسٹیشن جن کا اوپر نام لیا گیا خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہیں۔ اعداد و شمار سے یہ معلوم کیا گیا ہے کہ واٹرلو اسٹیشن پر روزانہ بارہ سو اسٹیم ریلیں اور ایک لاکھ چالیس ہزار مسافر آتے جاتے ہیں۔ بلحاظ وسعت یہی اسٹیشن سب سے بڑا ہے۔ بیس متعدد پلیٹ فارم ہیں۔ جن کی مجموعی لمبائی (۱۴۶۲۸) فٹ بتلائی جاتی ہے۔ لیورپول اسٹریٹ اسٹیشن پر مسافروں کی تعداد کا اوسط دو لاکھ بیالیس ہزار روزانہ ہے۔ البتہ ریلیں واٹرلو اسٹیشن کی نسبت کچھ کم ہیں۔ جو لوگ دوسرے اسٹیشنوں سے اور دیگر وسائل سے آتے ہیں۔ وہ ان کے علاوہ ہیں۔

ریلوں کی سہولت

ریل کے سفر میں بھی بڑی سہولتیں رکھی گئی ہیں ایک خاص رعایت تذکرہ کے لائق یہ ہے کہ ہر اتوار کو اسپشل ٹرینیں چھوڑی جاتی ہیں۔ ایک روز کی واپسی کا ٹکٹ کم نرخ پر

ملتا ہے۔ رات کو دس گیارہ بجے تک لندن کو واپسی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اتوار کے دن ہزارہا آدمی محض تفریح کی خاطر سمندر کے کنارے کے مقامات پر جایا کرتے ہیں۔ یہاں کی ریلیں عام طور پر تیز رفتار ہوتی ہیں۔ چنانچہ انتہائی رفتار ساڑھے اکسٹھ میل فی گھنٹہ ہے [1]۔ ایک مشہور ریل لندن سے ایڈنبرا تک ۳۹۲ میل کی مسافت بغیر کہیں ٹھہرے ہوئے طے کرتی ہے۔ سنا ہے کہ دنیا میں اس نوعیت کی کوئی ریل نہیں ہے۔

لندن کی دکانیں

اجنبی آدمی کے لئے لندن کے بازاروں میں بہت کچھ تفریح کا سامان ہے۔ آکسفورڈ اسٹریٹ ریجنٹ اسٹریٹ پکاڈلی اور ان کے گرد و نواح میں بڑی بڑی دکانیں آراستہ و پیراستہ دیکھنے کے لائق ہیں اس خوبی سے دکان کو سجاتے ہیں کہ گھنٹوں کھڑے دیکھا کرو اور دل نہ بھرے۔ دکانوں کے سامنے کانچ کے بڑے بڑے شوکیس ہوتے ہیں۔ ان میں دکان کی اشیاء بطور نمائش لگا دیتے ہیں اور ہر چیز کی قیمت بھی لگی رہتی ہے۔ یہ طریقہ لندن کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام یورپ میں دکانوں کی یہی کیفیت ہے۔ لندن تجارت کے لحاظ سے تمام شہروں پر فوقیت رکھتا ہے اس لئے دکانیں یہاں زیادہ اور اچھی ہیں اس میں شک نہیں کہ گوشۂ مغربی میں چیزیں کسی قدر گراں ہوتی ہیں۔ لیکن بہت سی دکانیں ایسی بھی ہیں جن میں معمولی قیمت پر اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ وہ دکانیں جن کو اسٹور کہتے ہیں بہت دلچسپ ہیں مہنگی سستی۔ چھوٹی۔ بڑی ہر قسم کی

---

[1] نوٹ:۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۱ء کو سونڈن سے پیڈنگٹن اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار پر ریل چلی، اور سنہ ۱۹۳۲ء میں اس سے بھی تیز چلکر دنیا کی تیز ترین ریل ہو گئی۔

چیز اسٹور میں خرید سکتے ہو اس نوعیت کے متعدد اسٹور ویسٹ اینڈ میں ہیں مثلاً
اکسفورڈ اسٹریٹ میں سلفریجز اور برامپٹن روڈ میں ہیرڈس یہ دکانیں کئی
منزل کی وسیع عمارتوں میں ہیں۔ برقی جھولے آمد و رفت کے لئے لگے ہوئے
ہیں۔ دکان کیا ہے بہت بڑا مارکٹ ہے جو چیز چاہو موجود ہے سلفریجز
کے ہاں ایک منزل پر بہت بڑا رستوران بھی ہے تاکہ گاہکوں کو کھانے کے
لئے بازار میں جانے کی ضرورت نہ ہو۔ کھانا اچھا اور واجبی دام پر ملتا ہے اسی
دکان میں ایک کمرہ ایسا ہے۔ جہاں بیٹھ کر کچھ آرام بھی لے سکتے ہو یا خطوط
وغیرہ لکھ سکتے ہو۔ میزیں لگی ہوئی ہیں۔ قلم دوات اور کاغذ بھی مفت ہے۔ اس
دکان کی آخری منزل پر سے لندن کا منظر چاروں طرف بہت اچھا ہے۔
وہیں ایک رفرشمنٹ کی دکان بھی ہے۔ یہاں اکثر مجمع رہتا ہے۔ برقی
جھولوں پہ نوجوان حسین لڑکیاں مقرر ہیں ان کو خوبصورت وردی مردانہ وضع
کی پہنائی جاتی ہے۔ دکان پر کام کرنے والوں میں بھی عورتوں کی تعداد
زیادہ ہے کسی کو کچھ خریدنا ہو یا نہ ہو لیکن ان دکانوں کی سیر ضرور کرنا چاہئے
دکان والے گاہکوں کی سہولت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اگر چاہو تو تمہاری
خریدی ہوئی چیز تمہارے مکان پر بھجوا دیں گے اور اس کام کے لئے کوئی
معاوضہ نہ لیں گے۔ میں نے ایک دکان میں ایک ۔ وز جوتہ خریدا قیمت وغیرہ
ادا کرنے کے بعد پارسل مانگا دکاندار نے کہا کہ آپ اپنے ساتھ کہاں لیے پھرینگے
اپنا پتہ بتلا دیجئے ہم پارسل وہاں پہنچا دیں گے۔ میں نے کہا میں بہت
دور رہتا ہوں اس نے کہا کچھ پروا نہیں۔ آپ خود زحمت نہ کریں میں نے
پتہ بتلا دیا۔ دوسرے دن پارسل مکان پر موجود تھا۔ بعض دکانیں ایسی ہیں کہ
ان میں ہر چیز چھ آنے کے اندر ملیگی۔ اس قیمت کے اندر جتنی چیزیں تمہارے

نپولین کی قبر۔ پیرس

خیال میں آسکتی اور بازاروں میں مل سکتی ہیں وہ سب ایک دکان میں مل جائینگی
بڑے اسٹوروں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر زیادہ چیزیں خریدنی ہیں تو ان کو
دکان میں لئے لئے پھرنے کی ضرورت نہیں جس ڈپارٹمنٹ میں جو چیز خریدی
ہے وہیں رکھوادو۔ ایک فہرست پر چیز کا نام اور قیمت لکھدی جائے گی
اسی طرح اس دکان کے جس ڈپارٹمنٹ پر کچھ خرید و وہیں چھوڑ دو اور فہرست پر
اندراج کرادو۔ آخر میں جہاں خرید و وہاں فہرست دید و وہ لوگ خود ہی تمام چیزوں
کو جمع کرلیں گے اور قیمت کا ٹوٹل کرکے بتادیں گے۔ خریدار کو کچھ بھی زحمت
کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعض بازار ایسے بھی ہیں جو خاص چیزوں کے لئے
مخصوص ہیں مثلاً فرنیچر کی دکانیں ٹاٹن ہیم کورٹ روڈ میں اچھی ہیں۔ اسی طرح
میں لیسٹر اسکوائر کے اطراف اور چیرنگ کراس کے قریب مستعملہ کتابوں کی
دکانیں ہیں۔ موٹروں کی دکانیں اگرچہ مختلف مقامات پر ہیں لیکن خاص کرکے
گریٹ پورٹ لینڈ اسٹریٹ میں کثرت سے ہیں مستعملہ موٹروں کے لئے اوسٹن روڈ
مخصوص ہے۔ رفیق بیگ ایک مستعملہ موٹر خریدنا چاہتے تھے مختلف محلوں میں دکانیں
ہیں لیکن اس محلہ میں کثرت دیکھی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ مستعملہ موٹر یہاں
سستی مل جاتی ہے لیکن بمبئی تک کرایۂ جہاز اور محصول دینے کے بعد مہنگی
پڑتی ہے اس لئے خیال ترک کردیا۔

خاص قسم کے بازار

میووں کا بازار دیکھنا ہو تو کونٹ گارڈن جاؤ۔ اس بازار
کی رونق علی الصباح ہے۔ اگرچہ بہت سویرے گھر
سے نکلنا خالی از زحمت نہیں۔ لیکن یہ سیر بھی لائق دید
ہے۔ ایک اور مقام کیبلڈونین روڈ ہے۔ چیرنگ کراس کے اسٹیشن سے
زمین دوز ریل میں سوار ہوجاؤ۔ صرف ایک جگہ لیسٹر اسکوائر پر ریل بدلنی

پڑے گی۔ پیر کے دن اس نواح میں مویشیوں کا بازار بھرتا ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں اس سے بڑا کوئی بازار مویشی کا نہیں ہے۔ فی الحقیقت عجیب و غریب منظر دکھائی دیتا ہے ایک ہی قسم کے ہزاروں جانور ایک جگہ دیکھنے میں آئے اس محلہ میں جمعہ کے دن سہ پہر کے وقت ایک دلچسپ بازار لگتا ہے۔ اسے خواہ گدڑی بازار کہو یا کباڑیوں کا بازار حیدرآباد میں بھی ایک بازار اس طرح نہ کا ہفتہ میں ایک روز بھرتا ہے جس کو چور بازار کہتے ہیں یہ بازار اسی وضع کا ہے۔ لیکن بڑے پیمانہ پر ہے۔ اکثر غریب طبقہ کے لوگ یہاں دکھائی دیتے ہیں۔

شار ابینک

لندن کی سیر کرنے کے دو ایک طریقے اور بھی ہیں۔ موسم گرما میں لندن برج سے متعدد اسٹیمر مختلف مقامات کو آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان مقامات کی سیر جو دریا کے کنارے ہیں اسٹیمر پر سے خوب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات سے بڑی بڑی موٹریں ہر سمت کو جاتی ہیں۔ ان موٹروں کو شار ابینک کہتے ہیں۔ میں ایک دفعہ شار ابینک کے ذریعہ ایسٹ بورن گیا تھا بہت پر تکلف گاڑی ہوتی ہے اس کے ذریعہ مضافات کی سیر اچھی طرح ہوتی ہے۔

موٹر چلانے کا لائسنس

میں نے موٹر چلانے کا ایک لائسنس لے لیا تھا۔ خود چلانے کے لئے کرایہ پر موٹریں مل جاتی ہیں۔ بالعموم ایک پونڈ روزانہ پر دیتے ہیں۔ پٹرول اس سے خارج ہے لائسنس بہت آسانی کے ساتھ مل جاتا ہے۔ ایک مطبوعہ فارم ہوتا ہے جو کسی ڈاک خانہ سے مل جائے گا۔ اس میں چند سوالات ہوتے ہیں جن کے ذریعہ اس امر کا اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ موٹر چلانی آتی ہے یا نہیں۔ فارم کی خانہ پری کر کے متعلقہ دفتر میں پانچ شلنگ کے پوسٹل آرڈر یعنے منی آرڈر کے

ساتھ بھجوادو۔ اگر دفتر والوں کو اطمینان ہو جائے تو لائسنس تمہارے پتہ پر وہ خود ہی بھجوادیں گے۔ میں نے ایک درخواست ڈاک کے ذریعہ مقررہ فیس کے ساتھ بھجوادی تھی۔ غالباً چوتھے روز ڈاک کے ذریعہ لائسنس مکان پر آگیا۔ نہ کسی نے کچھ پوچھا اور نہ امتحان لیا۔

خود چلانے کے واسطے کرایہ کی موٹر

فارسٹ ہل کے قریب ہی دو ایک موٹر خانے ایسے تھے جہاں موٹر کرایہ پر مل سکتی تھی۔ ان کے پاس ایک مطبوعہ فارم ہوتا ہے اس کی خانہ پری کرنی پڑتی ہے۔ معمولی سوالات ہوتے ہیں ایک قلیل فیس گاڑی کو بیمہ کرنے کے واسطے بھی لیتے ہیں۔ مجھے کئی دفعہ موٹر کرایہ پر لینے کا اتفاق ہوا۔ ہر دفعہ مختلف موٹر خانو سے لی۔ صرف ایک موٹر والے نے پوچھا کہ تم کو موٹر چلانی آتی ہے یا نہیں۔ میں امتحان لینا چاہتا ہوں محض لائسنس سے میرا اطمینان نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا۔ اور شہر کے کچھ حصہ میں ہم نے گشت لگایا۔ جب اس کو اطمینان ہو گیا تو موٹر دیدی۔ ایک موٹر والے نے اطمینان کے لئے صرف یہ سوال کیا کہ تمہارے ملک میں سیدھے ہاتھ پر چلنے کا طریقہ ہے یا بائیں ہاتھ پر۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی بائیں جانب کا قاعدہ ہے تو مطمئن ہو گیا۔ یورپ کے بعض ممالک میں سیدھے جانب چلنے کا طریقہ ہے اس لئے موٹر والے کو فکر تھی کہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ اس کی فکر حق بجانب تھی۔ کیونکہ جرمنی وغیرہ ممالک میں مجھ کو خود بعض دفعہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر میں یہاں موٹر چلاؤں تو باوجود احتیاط کے دن میں کئی دفعہ حادثہ ہوگا۔ بلکہ اکثر یہ بھی ہوا کہ جب ہماری ٹیکسی والے نے سیدھی جانب سے موٹر کو نکالا تو میرا قصد فوراً اس کو روک دینے کا ہو گیا مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہاں کا طریقہ یہی ہے میں

کرایہ کی موٹر ایک روز کے واسطے لیا کرتا تھا۔ رات کو بارہ بجے تک واپسی ہوتی تھی۔ موٹر کو دکان پر پہنچا دینا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ ایک روز میں سو ڈیڑھ سو میل کا چکر بخوبی ہو جاتا ہے۔ لندن کے قریب سمندر کے کنارے جو مقامات ہیں۔ اکثر میں اس طرف چلا جاتا تھا۔

ایک بے لطف سیر

ایک روز بارش کی وجہ سے کسی قدر بے لطفی ہو گئی صبح کو نو بجے کے قریب ہم لوگ فارسٹ ہل سے ہیٹنگس کی طرف روانہ ہوئے۔ غلام یزدانی صاحب اور میرے ایک دوست سراج الحق ساتھ تھے۔ موٹر خانہ کا ایک لڑکا بھی ساتھ تھا۔ اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے وہ بیکار تھا۔ مجھ کو خیال ہوا کہ موٹر کی مشین سے واقف اگر کوئی آدمی ساتھ رہے تو اچھا ہے۔ لڑکے سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ مجھ کو آج چھٹی ہے اس لئے بلا معاوضہ بھی تمھارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوں۔ صرف اس قدر مہلت دو کہ مکان جا کر اپنی ماں کو اطلاع دوں اور کپڑے تبدیل کر لوں۔ اس کو مکان کا پتہ بتلا دیا۔ وہ نو بجے تیار ہو کر آ گیا۔ کارخانہ میں جب اس کو دیکھا تھا تو بہت معمولی حالت میں تھا۔ گھر جا کر کچھ اس طرح تبدیل ہو کر آیا کہ پہچاننے میں تکلف ہونے لگا۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی فیشن ایبل آدمی کا لڑکا ہے۔ لندن سے چلتے وقت کسی قدر ابر آ گیا تھا اور خفیف بوندا باندی بھی تھی۔ یہاں موسم کا اعتبار نہیں ہوتا اس لئے ہم کو یہ بھی امید تھی کہ کچھ دیر میں مطلع صاف ہو جائے گا۔ راستہ میں کہیں بارش زیادہ ملی اور کہیں کم۔ لیکن اس قدر ضرور ہوا کہ موٹر زیادہ تیز نہ چلا سکے۔ نصف راستہ سے کچھ زیادہ دور رہ جانے کے بعد بارش زور دار ہونے لگی۔ لندن میں اتنی زور کی بارش اس روز میں نے پہلی دفعہ دیکھی یہاں بالعموم ہلکی بارش ہوا کرتی ہے۔ لب سڑک ایک رسٹوران تھا۔ بارش سے

بچنے اور کچھ کھانے کے لئے یہاں ٹھہر گئے بارش کسی طرح کم نہ ہوتی تھی حتیٰ کہ مغرب کا وقت ہو گیا اور ہم لوگ اِس سوچ میں پڑ گئے کہ لندن واپس ہوں یا سیدھے ہیسٹنگس جائیں۔ اِس مقام سے لندن تقریباً چالیس میل تھا۔ بارش اور اندھیرے کی وجہ سے میری ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس وقت چالیس میل موٹر چلاتا ہوا جاؤں غلام یزدانی صاحب اور سراج الحق کو لندن میں ضروری کام تھا اس لئے یہ طے پایا کہ ہم لوگ سیدھے ہیسٹنگس جائیں جو نسبتاً قریب تھا۔ وہاں سے ریل کے ذریعہ یہ دونوں حضرات لندن واپس ہو جائیں اور میں رات کو کسی ہوٹل میں قیام کر کے صبح کو لندن واپس آؤں۔ اگرچہ تنہا شب باشی کے لئے دل نہیں چاہتا تھا لیکن صورت مجبوری کی تھی۔ بالآخر آٹھ بجے رات کو ہم ہیسٹنگس پہنچے۔ ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا بندوبست کیا۔ قریب میں ایک موٹر خانہ تھا کرایہ دے کر رات کے لئے موٹر رکھی گئی اور ایک جگہ اس لڑکے کے قیام کا بندوبست کیا جو ساتھ تھا اس نے لندن اپنی ماں کو ٹیلیفون کے ذریعہ واقعات سے اطلاع دیدی۔ اس اہتمام کے بعد ہم اسٹیشن گئے۔ اتفاق سے لندن جانے والی ریل تیار تھی غلام یزدانی صاحب اور سراج الحق لندن چلے گئے۔ بارش کا سلسلہ برابر جاری رہا میرے پاس چھتری بھی نہیں تھی۔ لوگ بارش سے دوکانوں پر پناہ لیتے پھرتے تھے۔ میں بھی اسی طرح بمشکل تمام اپنے ہوٹل کو پہنچا۔ سیر کا کوئی موقع نہ تھا۔ صبح کو اُٹھا تو بارش ہو رہی تھی معلوم ہوا کہ تمام رات پانی پڑتا رہا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر لندن واپس ہو گیا۔ تمام راستے پانی پڑتا رہا بڑی بے لطفی رہی۔

ایک ناخواندہ مہماں

لندن کے قریب راستہ میں ایک عورت بھیگی ہوئی چلی جا رہی تھی اس نے ہاتھ سے موٹر روکنے کے لئے اشارہ کیا میں نے موٹر روک لی۔ تو اس نے کہا میں بالکل بھیگ گئی

ہوں اور ابھی دور جانا ہے کیا تم مجھ کو موٹر میں جگہ دے سکتے ہو میں نے کہا نہایت خوشی کے ساتھ۔ چنانچہ وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے کپڑوں سے پانی بہتا تھا۔ اس لئے میں نے اس سے کہا شاید تم کو اندر کی سیٹ پر آرام ملیگا۔ لیکن وہ اندر بیٹھنے پر راضی نہ ہوئی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ فارسٹ ہل سے آگے جو محلہ ڈیچ ہے وہاں جائے گی۔ بڑی باتونی عورت تھی کہنے لگی تم اجنبی آدمی معلوم ہوتے ہو تمہارا وطن کون سا ہے۔ میں نے کہا میں اجنبی نہیں ہوں بلکہ خاص لندن کا باشندہ ہوں کہتی تھی یہ ناممکن ہے تم مجھ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ میں نے کہا اچھا تم ہی بتاؤ کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ کچھ دیر سوچ کر کہا یا تو اسپین کے ہو یا اٹلی کے میں نے کہا غلط۔ اس پر اس نے کہا میں نہیں بتا سکتی اب تم خود ہی بتاؤ۔ مجھ سے ہندوستان کا لفظ سُن کر کہنے لگی۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ کیونکہ میں نے جن ہندوستانیوں کو دیکھا ہے وہ سب کالے ہیں۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ ہندوستان میں کالے اور گورے دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ پوچھتی تھی کہ تم کو یہاں آکر کتنا عرصہ ہوا اور کیا پہلی دفعہ آئے ہو۔ میں نے کہا ایک مہینہ سے یہاں ہوں اور پہلی دفعہ آیا ہوں کہنے لگی۔ پھر مجھ کو دھوکا دینے کی کوشش کی کیونکہ تمہاری انگریزی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم اس ملک میں عرصہ سے رہتے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ تم کو یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ ہندوستان میں تعلیم یافتہ سب لوگ انگریزی اچھی طرح جانتے ہیں۔ الغرض اس قسم کی گفتگو اس کے ساتھ ہوتی رہی۔ یہ عورت کسی تھیٹر میں ملازم تھی۔ کہتی تھی میرے تھیٹر میں ضرور آنا۔ راستہ میں ایک جگہ اس نے کہا مجھ کو سردی معلوم ہوتی ہے کسی دکان پر کچھ پینا چاہتی ہوں۔ مجھ کو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا۔ ایک دکان پر اس کو اتار دیا وہ سمجھتی تھی کہ میں بھی اس کے ساتھ شریک رہوں گا۔ لیکن میں نے عدیم الفرصتی کا عذر کیا اور اس کو وہیں چھوڑ دیا۔

موٹر والے کا ناجائز مطالبہ

موٹر والے سے یہ وعدہ ہوا تھا کہ علی الصباح اس کی موٹر واپس کردی جائیگی مگر میں گیارہ بجے لندن پہنچا موٹر والا باہر گیا ہوا تھا میں نے لڑکے کے حوالہ موٹر کردی۔ اور گھر واپس آگیا۔ تین روز بعد موٹر والے نے ایک بل روانہ کیا کہ مقررہ اوقات سے زیادہ تمہارے پاس موٹر رہی اس کی بابتہ ایک پونڈ مزید دینا پڑے گا۔ میں نے اس پر ایک قانونی اعتراض کرکے واپس کردیا واقعہ یہ تھا کہ موٹر دیتے وقت موٹر والے نے کہا تھا کہ اس میں چار گیلن پٹرول بھرا ہوا ہے۔ میں نے اس کے کہنے پر اعتبار کیا اس وقت ناپ کر نہیں دیکھا اور چار گیلن کی قیمت اس کو دیدی۔ لیکن دس بارہ میل گئے ہونگے کہ موٹر رک گئی معلوم ہوا کہ پٹرول نہیں ہے۔ نصف میل کے قریب پٹرول کے لئے لڑکے کو بھیجنا پڑا اس میں وقت بہت کچھ ضائع ہوا۔ میں نے بل پر اعتراض کیا کہ تمہاری غلطی کی وجہ سے ہمارا وقت ضائع ہوا اور تکلیف اٹھانی پڑی۔ تمہارا کام تھا کہ اطمینان کرکے پٹرول کے متعلق کہتے تم پر نالش کی جائے تو ہرجانہ ایک پونڈ سے زیادہ دینا پڑے گا۔ لہذا یہ سمجھو حساب برابر ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ غنیمت کہ موٹر خانہ کا لڑکا خود گواہی کے لئے موجود تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اس کے بعد بھی موٹر کے ذریعہ کئی دفعہ ساحلی مقامات پر گیا۔

ساحلی مقامات

دو دفعہ ریل پر جانا ہوا۔ لندن کے جنوب میں متعدد مقامات سمندر کے کنارے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ موٹر سے جانے میں زیادہ سیر ہوتی ہے مضافات کے مناظر بہت دلکش ہیں۔ جدھر دیکھو سبزہ ہی سبزہ نظر آئے گا سڑکیں جدید وضع کی بنی ہوئی ہیں۔ خاک کا نام نشان نہیں۔ اتوار کے دن

ہزارہا موٹر سڑک پر ملتی ہے۔ جابجا پٹرول کی دکانیں اور رسٹوران موجود ہیں جنگل کا تو نام ہی ہے جس طرف دیکھو آدمی نظر آئے گا۔ سمندر کے کنارے کے مقامات بڑی رونق کے ہوتے ہیں۔ لوگ تبدیل آب و ہوا کے واسطے یہاں آکر رہتے بھی ہیں۔ چند مقامات کا ذکر جہاں اکثر میرا جانا ہوا ہے دلچسپیوں سے خالی نہ ہوگا انگلستان کے جنوب مشرقی ساحل پر زیادہ مشہور اور مقبول تین مقامات ہیں اور یہ تینوں لندن سے قریب بھی ہیں۔

برائٹن سب سے بڑا مقام برائٹن لندن سے پچاس میل کے فاصلہ پر ہے میرے خیال میں یہ مقبول بھی سب سے زیادہ ہے۔ کثرت سے لوگ یہاں جاتے ہیں۔ آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے یہ مقام صحت بخش مانا جاتا ہے کہتے ہیں کہ دوسرے مقامات کی نسبت یہاں کی آب و ہوا خشک ہے اور دھوپ بھی لندن سے زیادہ ہوتی ہے ہندوستان میں صاحب بہادر دھوپ اور گرمی سے بچنے کی خاطر پہاڑی مقامات پر چلے جاتے ہیں مگر یہاں لوگ اِن مقامات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جہاں دھوپ اور گرمی کی زیادتی ہو۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جو چیز ضرورت سے زائد ہوتی ہے اس سے آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور کمیاب چیز کی قدر کرتا ہے۔ کاش کہ ہندوستان کی کچھ گرمی انگلستان کو دیکر اس کے معاوضہ میں سردی لے سکتے دھوپ کی تلاش یہاں کے لوگوں کو اس قدر رہتی ہے کہ باقاعدہ حساب رکھتے ہیں کہ کس سال کس مقام پر کتنے گھنٹے دھوپ رہی۔ جہاں دھوپ کے اوقات زیادہ معلوم ہوتے ہیں وہ جگہ سب سے زیادہ مقبول ہو جاتی ہے۔ برائٹن میں کھیل کود اور تفریح کے اسباب بہت ہیں ایک مشرقی وضع کی عمارت رائل پویلین کے نام سے موسوم بہت خوبصورت ہے۔ گنبد اس وضع کے ہیں

جیسے ہندوستان کی بعض درگاہوں پر پائے جاتے ہیں۔

ایسٹ بورن وغیرہ

دوسرا مقام ایسٹ بورن ہے۔ برائٹن سے اگرچہ چھوٹا ہے لیکن بعض باتوں میں اس پر فوقیت رکھتا ہے اچھے اچھے پارک اور سبزے کے میدان میلوں چلے گئے ہیں۔ سمندر کے کنارے عالیشان عمارتیں اور ہوٹل ہیں اس کے قریب ہیسٹنگس ہے۔ آبادی ستر ہزار کے قریب ہوگی۔ اس سے ملحق ایک ہی سلسلہ میں دوسری آبادی سینٹ لیونارڈس کی ہے۔ اس نواح میں ایک چھوٹا مقام بکس ہل ہے۔ یہاں لڑکوں کے لئے مدارس اچھے ہیں۔ ان سب مقامات پر رونق اور چہل پہل رہتی ہے بالخصوص اتوار کے دن مجمع زیادہ ہوتا ہے۔

سمندر کے کنارے جتنے مقامات ہیں وہاں ایک قسم کی عمارت ضرور ہوتی ہے جسے پیئر کہتے ہیں۔ سمندر میں دور تک اس کا سلسلہ ہوتا ہے اس کی شکل ایک جزیرہ نما کی سی ہوتی ہے۔ تین طرف پانی اور بیچ میں پیئر ہوتا ہے۔ اس عمارت میں داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ ہوا کرتا ہے اندر مختلف اقسام کی دلچسپیاں مہیا کی جاتی ہیں کھانے پینے کی دکانیں اور سینما اور ناچ گھر وغیرہ سب ہی کچھ ہوتا ہے۔

آئل آف وائٹ

انگلستان کے جنوب میں ایک جزیرہ آئل آف وائٹ ہے۔ مناظر قدرتی اور آب و ہوا کے لحاظ سے یہ حصہ ملک بھی اچھا مانا جاتا ہے یہاں متعدد مقامات سمندر کے کنارے ہیں۔ لوگ کثرت سے جاتے ہیں۔ لندن سے اس جزیرے کو جانے کے لئے دو راستے ہیں ایک پورٹس موتھ سے اور دوسرا ساؤتھ امپٹن سے جاتے وقت ساوتھ امپٹن ہو کر گیا تھا۔ وہاں ایک روز قیام بھی کیا۔ یہ جگہ لندن سے اسی میل کے فاصلہ پر ہے افریقہ و امریکہ وغیرہ سے یہاں جہاز آتے رہتے ہیں۔ سوا لاکھ کے قریب اس کی

آبادی ہے۔ تفریح کے لحاظ سے یہ مقام کچھ اچھا نہیں ہے۔ رات کو ایک ہوٹل میں قیام کر کے علی الصباح اسٹیمر کے ذریعہ رائنڈ چلا گیا۔ جو جزیرہ کا ایک مشہور مقام ہے راستے میں دو مقامات پر اسٹیمر ٹھہرا منظر بہت اچھا تھا۔

رائنڈ نو بجے کے قریب اسٹیمر رائنڈ پہنچا۔ یہ ایک خوبصورت چھوٹا سا شہر ہے بارہ ہزار کے قریب اس کی آبادی ہو گی۔ یہاں کا پیئر تقریباً ایک میل لمبا ہے کہتے ہیں کہ انگلستان میں اس سے لمبا پیئر نہیں ہے۔ یہی پیئر بندرگاہ کا بھی کام دیتا ہے۔ بندرگاہ سے ایک چھوٹی سی برقی ریل شہر تک جاتی ہے۔ تاکہ مسافروں کو اسباب کے لانے لیجانے میں سہولت ہو پیئر سے متصل کئی ایک ہوٹل ہیں لیکن جگہ کسی میں خالی نہ تھی اس لئے کسی قدر دور جانا پڑا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک ہوٹل میں صرف ایک کمرہ خالی ملا۔ ساڑھے آٹھ شلنگ روزانہ رہایش اور صبح کے ناشتہ کے تھے کھانا اس سے خارج تھا۔ اس مقام سے تمام جزیرے کی سیر موٹر کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

پورے جزیرے کا رقبہ ایک سو پینتیس مربع میل سے زاید نہیں ہے اور آبادی بھی ایک لاکھ کے اندر ہو گی۔ رائنڈ سے متعدد موٹریں اور شاراببنک جزیرہ کے مختلف مقامات تک جایا کرتی ہیں۔ صبح کو جا کر شام کو واپس آتی ہیں۔ سمندر کے کنارے جو مقامات یہاں دیکھنے کے لائق ہیں ان میں ایک سینڈون ہے۔ جو رائنڈ سے صرف ۵ میل کے فاصلہ پر جانب جنوب ہے چھ ہزار کے قریب اس کی آبادی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں کی آب و ہوا کسی قدر گرم اور ہندوستانیوں کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ فوجی لوگ جو ہندوستان اور چین میں ایک عرصہ تک رہ چکے ہیں۔ اگر ان کا تبادلہ انگلستان ہو جائے تو کچھ دنوں ان کو اس مقام پر رکھا جاتا ہے۔ تاکہ رفتہ رفتہ وہ سرد آب و ہوا کے عادی ہو جائیں۔ اس کے جنوب میں

کوئی دو میل کے فاصلہ پر ایک اور چھوٹا مقام شنکلن ہے۔ کچھ آبادی سمندر کے ساحل پر ہے اور کچھ آبادی پہاڑوں پر سطح سمندر سے (۱۵۰) فٹ بلندی پر ہے۔ یہاں سے تین میل اور پیچھے چلے جاؤ تو ایک خوبصورت مقام سمندر کے کنارے ونٹ نار ہے۔ یہاں کی آب و ہوا مرض دق کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ ایک شفاخانہ مخصوص اس مرض کے واسطے بنا ہوا ہے۔ اس کے قریب ایک اور قصبہ ننٹن ہے۔ یہ موسم سرما میں گرم اور گرمیوں میں سرد رہتا ہے۔ مناظر قدرتی یہاں بہت دلفریب ہیں۔

میں کچھ دنوں اس جزیرہ میں رہا۔ روزانہ شاراہنیک کے ذریعہ سیر کرتا تھا بہت ہی سرسبز اور شاداب جزیرہ ہے۔ پہاڑوں کا نشیب و فراز عجیب لطف دیتا ہے میں یہاں زیادہ دن قیام کرنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی ساتھی نہ تھا۔ اور رفیق بیگ لندن میں تھے۔ تنہائی بُری چیز ہے۔ سیر و سیاحت کا لطف اسی وقت ہے جب کوئی ہم خیال بھی ساتھ ہو۔ مجھ کو تنہائی سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ اس ملک کے لوگ فطرتاً دیر آشنا ہیں۔ اس لئے کسی سے دوستی پیدا ہونے کی بھی امید نہ تھی۔ ہوٹل میں یوں تو کئی ایک مسافر ٹھہرے ہوئے تھے لیکن ان سے معمولی گفتگو کے سوا اور کچھ توقع نہ تھی۔ ایک روز کچھ دیر تک ایک سن رسیدہ میم صاحبہ سے دلچسپ گفتگو رہی۔ ہم دونوں ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ حسب دستور موسم پر سے سلسلۂ گفتگو آغاز ہوا۔ اثنائے گفتگو میں اس نے کہا کہ تم اجنبی ملک کے رہنے والے معلوم ہوتے ہو۔ غالباً جنوبی فرانس کے باشندے ہو۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ میں ہندوستان سے آرہا ہوں تو اس نے کہا میں خود اگرچہ ہندوستان نہیں گئی۔ لیکن وہاں کے چند بڑے آدمیوں کو جانتی ہوں جو راجہ اور نواب ہیں۔ سوئیڈزرلنڈ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد اس نے سوال کیا کہ ہمارے ملک اور باشندوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے میں نے

زیادہ تر شکایت تو یہ ہے کہ تم لوگ ضرورت سے زیادہ روکھے اور خشک ہو تم سے ملاقات اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے مہینوں کا عرصہ درکار ہے اس نے جواب دیا کہ تمہارا خیال ایک حد تک صحیح ہے لیکن یہ چیز بجائے عیب کے دراصل کیرکٹر کی ایک خوبی ہے۔ تم کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دیر آشنا لوگ جب آشنا ہو جاتے ہیں تو ان میں صداقت بھی ہوتی ہے۔ ہم لوگ فرانیسی نہیں ہیں کہ فوراً شیر و شکر ہو جائیں۔ جو دوستی عجلت کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اس میں استقلال نہیں ہوتا جتنی جلد یہ پیدا ہوئی تھی اتنی ہی جلدی وہ جاتی بھی رہے گی۔ اس گفتگو کے بعد پھر اس خاتون سے ملاقات نہ ہوئی۔

غلط اسٹیمر پر سوار ہونا

واپسی کے وقت رائڈ سے ایک غلط اسٹیمر پر سوار ہو گیا۔ ٹکٹ اس اسٹیمر کا تھا جو سوتھمپٹن کو جاتا ہے لیکن میں جس اسٹیمر پر سوار ہوا وہ پورٹس موتھ کو جاتا تھا۔ دونوں مقامات گو کہ قریب قریب ہیں لیکن سروس علیحدہ ہے۔ اسٹیمر والوں نے اگرچہ ٹکٹ دیکھا لیکن کچھ اعتراض نہیں کیا۔ پورٹس موتھ پر جب میں اُترا تو اسٹیمر والوں نے اعتراض کیا وہ چاہتے تھے کہ میں اسی اسٹیمر سے یا تو واپس ہو جاؤں یا اس کا کرایہ علیحدہ دوں۔ بڑی حجت رہی اسٹیمر کا آدمی کسی اور کام میں مصروف ہو گیا۔ میں سیدھا اسٹیشن چلا آیا۔ اور لندن کا ٹکٹ خرید کر ریل میں بیٹھ گیا۔ واپس جانا بالکل خارج از بحث تھا اور دوبارہ کرایہ ادا کرنا بھی درست نہ تھا۔ کیونکہ سوار ہوتے وقت اسٹیمر والوں نے اعتراض نہیں کیا۔ غالباً اسی وجہ سے معترض بھی انجان ہو گیا۔

موسمی کیفیت

ہمارے ملک میں ابر و باراں کے زمانہ میں لوگ باغوں کو جاتے اور تلن وغیرہ کرتے ہیں۔ مگر یہاں کیفیت برعکس ہے ابر آیا تو سمجھو کہ اس روز کا لطف ہی جاتا رہا اور ساری تفریح ملیامیٹ ہو گئی۔

بالخصوص اتوار کے دن تو دعائیں مانگتے ہیں کہ سورج نکلا رہے۔ تاکہ سمندر کے
ساحل پر جاکر نہائیں اور تفریح کریں۔ لندن کے موسم میں تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ
کسی وقت اس کا اعتبار نہیں۔ دن بھر میں کئی رنگ بدلتا ہے ابھی ابر آیا
ہوا تھا۔ ابھی دھوپ نکل آئی اور پھر ابر آگیا۔ اکثر ہلکی ہلکی بارش رہا کرتی ہے چنانچہ
لندن میں بارش کا اوسط پچیس انچ سالانہ سے زیادہ نہیں۔ زور کی بارش کم ہوتی ہے
اگر ہوتی ہے تو اس کو یہاں کے لوگ طوفان سمجھتے ہیں۔ ایک روز صبح کو میں
نے دیکھا کہ زمین تر ہے خیال ہوا کہ بارش مسلسل ہوئی ہوگی۔ مکان والی سے جب
تذکرہ آیا تو اس نے کہا مسٹر بیگ تم کو شاید خبر نہیں کہ رات کو طوفان آیا تھا۔ گھر سے
باہر جب لوگ جاتے ہیں تو اکثر اپنے ساتھ اس خیال سے اورکوٹ رکھ لیتے ہیں
کہ خدا معلوم کس وقت بارش ہو جائے بعض لوگ چھتری بھی رکھتے ہیں۔ لیکن
نوعمر لوگ زیادہ تر اورکوٹ ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ٹوپی بھیگی رہتی ہے محض دھوپ
سے بچنے کے لئے مرد کے واسطے چھتری کا استعمال داخل عیب ہے۔ عورتیں البتہ
دھوپ کی شدت ہو تو چھتری لگاتی ہیں مگر ایسا موقع بہت کم آتا ہے۔ یہاں کے
موسم کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ ۲۱ مارچ سے ۲۲ جون تک بہار کا موسم سمجھا جاتا
ہے۔ اور یہی سب میں اعلیٰ ہے۔ اس کے بعد ۲۲ ڈسمبر تک گرمی کا موسم رہتا ہے
پھر خزاں شروع ہو جاتی ہے جس کا زمانہ ۲۲ ڈسمبر تک ہے۔ بعد ازاں جاڑے
کا آغاز ہوتا ہے۔ مجھے جاڑے کا تجربہ نہیں ہے لیکن یہ سنا ہے کہ تکلیف دہ
موسم ہوتا ہے۔ دن کو ایسی سخت کہر رہتی ہے۔ کہ سڑکوں پر روشنی کرنے کی
ضرورت ہوتی ہے۔ راستہ دکھائی نہ دینے کی وجہ سے اکثر حادثات بھی ہو جاتے
ہیں۔ جاڑے میں لندن کا مقیاس الحرارت عام طور پر (۴۲) ڈگری سے کم نہیں
ہوتا۔ اور گرمیوں میں ۶۲ ڈگری انتہا ہے لیکن یہ اوسط ہے۔ بعض اوقات زیادتی

اور کمی بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میرے زمانہ قیام میں تین روز شدید گرمی ہوئی۔ اخباروں میں اس کا چرچا رہا۔ گرمی کی لہر کے عنوان سے مضامین طبع ہوئے لیکن پارہ (۹۳) ڈگری سے اونچا نہیں ہوا اس سے قبل ۱۹۱۱ء میں ۱۹ اگست کو پارہ (۱۰۰) ڈگری پر پہنچا تھا۔ اس تین چار روز کی گرمی میں متعدد آدمی مر گئے۔ ہندوستان میں ایک سو بیس ڈگری ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ دراصل ۹۳ ڈگری کچھ زیادہ نہیں ہے اور لوگ ضائع نہ ہوتے بشرطیکہ لباس میں تبدیلی کی کوئی صورت نکل آتی۔ یہاں گرمیوں میں بھی اونی لباس پہنے رہتے ہیں پنکھوں کا رواج نہیں۔ بازار میں نکلو تو دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں، ہوا کا نام نشان نہیں۔ ان حالات میں گرمی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ کمزور قلب کے لوگ برداشت نہیں کر سکتے۔ عورتیں البتہ محفوظ رہتی ہیں۔ کیونکہ ان کا لباس مردوں کی نسبت ہلکا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس غیر معمولی گرمی میں کوئی عورت نہیں مری۔ جتنے مرے سب مرد تھے۔ یہ لوگ لباس میں تبدیلی اس لئے نہیں کرتے کہ موسم کا بالکل اعتبار نہیں۔ ایسی صورت میں لباس کو تبدیل کرنا صحت پر مضر اثر ڈالتا ہے۔ چنانچہ میں نے گرمی سے پریشان ہو کر اونی بنیان اور ویسٹ ترک کر دیا۔ چوتھے روز ایسی سخت خنکی ہوئی کہ نزلہ اور بخار ہو گیا۔ خاص طور پر باہر والوں کو احتیاط لازمی ہے۔ جولائی کے مہینے میں دن بہت بڑا ہوتا ہے چنانچہ صبح چار بجے سے پیشتر سورج طلوع ہو جاتا ہے اور سوا آٹھ بجے کے قریب غروب کا وقت ہے۔ لیکن روشنی نو بجے تک رہتی ہے۔ لندن اور کلکتہ کے وقت میں سات منٹ کم چھ گھنٹے کا فرق رہتا ہے۔ مثلاً کلکتہ میں اگر شام کے چھ بجے ہیں تو لندن میں دن کے بارہ بجے ہوں گے بحیثیت مجموعی لندن کی آب و ہوا صحت بخش اور خوشگوار مانی جاتی ہے۔

صفائی اور حفظانِ صحت

صفائی اور حفظان صحت کے انتظامات عمدہ اور اعلیٰ پیمانہ پر ہیں۔ نہ صرف گورنمنٹ کو صفائی کا خیال ہے بلکہ عوام بھی اپنے مکانوں میں اس کا خیال رکھتے ہیں بازاروں میں جابجا ایسے ظروف موجود ہیں جن میں ردی کاغذات یا کوئی بیکار چیز ڈال سکتے ہو۔ سڑک پر ایسی چیزیں ڈالنے کی سخت ممانعت ہے ایک دفعہ میں کسی بازار میں جارہا تھا۔ چھوٹی سی گاڑی میں ایک شخص آئسکریم کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں کاغذ میں لپٹی ہوئی بیچتا جارہا تھا۔ میں نے ایک ٹکیہ خریدی۔ کاغذ پر کچھ عبارت چھپی ہوئی تھی۔ جس کو میں نے غور سے پڑھا۔ منشا یہ تھا کہ اپنے شہر اور ملک کو غلاظت سے محفوظ رکھو۔ مہربانی کرکے اس کاغذ کو سڑک پر مت پھینکو اس قسم کی ہدایات موٹر بسوں اور ٹریموں میں لکھی ہوئی ہیں۔ کہ اُترتے وقت ٹکٹ گاڑی میں چھوڑ کر جاؤ ورنہ سڑکوں پر کوڑا ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہ باتیں محض نمائشی نہیں ہیں بلکہ ان پر عمل بھی ہوتا ہے صحت قائم رکھنے کے لئے اور بھی تدابیر اختیار کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً پیدل چلنا پھرنا عیب میں داخل نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک ہوسکتا ہے۔ پیدل چلتے ہیں۔

تفریح

کھانے پینے میں اوقات کی پابندی۔ دماغی محنت کے بعد تفریح اور جسمانی ورزش قواعد حفظان صحت کا عام طور پر خیال یہ سب باتیں ایسی ہیں۔ جن کی وجہ سے ان لوگوں کی عمر کا اوسط ہمارے ہاں سے بہت زیادہ ہے رشام کو جب نوکری سے فارغ ہوتے ہیں تو ضرور کسی نہ کسی قسم کی تفریح کرتے ہیں۔ اگر باہر نہ جائیں تو اپنے مکان ہی میں گاتے بجاتے ہیں۔ ہمارے مکان میں اکثر رات کو ایک بجے تک ناچ گانا ہوتا رہتا تھا۔ ہم لوگ اگرچہ عملی طور پر اس میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ لیکن صاحب خانہ کی!

شریک محفل ہونا پڑتا تھا۔ یہ لوگ تعجب ظاہر کیا کرتے تھے کہ ہندوستان میں زندگی کیسی روکھی پھیکی ہوا کرتی ہے۔ تم کو نہ تو گانا آتا ہے نہ ناچتے ہو اور نہ تیرنے کا شوق ہے۔ تم سب مردہ دل لوگ معلوم ہوتے ہو۔ میں نے کہا یہ صحیح نہیں ہے البتہ تفریح کا طریقہ جداگانہ ہے۔ جب کبھی دل چاہتا ہے ہم پیشہ ور لوگوں کو مکان پر بلاتے ہیں۔ اور ساری ساری رات محفل گرم رہتی ہے۔ مالک مکان کی لڑکی کہتی تھی کہ میں ہرگز ایسے ملک میں رہنا پسند نہ کروں گی۔ جہاں دوسروں کو ناچتا ہوا دیکھیں اور خود شریک ہونا عیب خیال کریں۔

اس گفتگو سے ناظرین باتمکین بخوبی اندازہ فرما سکتے ہیں۔ کہ اس ملک میں رقص و سرود کے متعلق عورتوں کے خیالات کس قدر آزاد ہیں۔ یہ چیز ان کی زندگی کا جزو لاینفک ہوگئی ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو غیر مرد کے ساتھ ناچنے کی بڑی آرزو رہتی ہے۔ مانا کہ روزمرہ ناچتے رہنے کی وجہ سے ان کے جذبات سرد ہوگئے ہیں لیکن جذباتِ شہوانی کہاں تک دبے رہیں گے۔ یہ اپنا کام آہستہ آہستہ کرتے رہتے ہیں۔ ناچ میں جو کچھ عمل ہوتا ہے وہ تیر نیم کش کا اثر رکھتا ہے جب تک یہ تیر جگر کے پار نہیں ہو لیتا۔ دل کی خلش کیسے دور ہو سکتی ہے۔ یورپ کی عورتوں کے اخلاق پر رقص و سرود کے شوق نے جو اثر ڈالا ہے وہ بالکل ظاہر ہے بھلا اس قسم کے ماحول میں کون مذہب کی طرف رجوع ہو سکتا ہے۔ بقول غالب مرحوم

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

یہ زہریلی ہوا کچھ ایسی عام ہوگئی ہے کہ اچھی باعصمت اور شریف الخیال عورتیں بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ یہاں کی عورتیں عام طور پر اگرچہ صاحب فہم

پیرس کی سڑک شانزالیزی

Chandrakanth Press, Hyd.

ہوتی ہیں لیکن اس مرض مہلک کے اثرات سے بے خبر ہیں تعلیم یافتہ ہیں سمجھدار ہیں روزمرہ کے کاروبار میں ہشیار ہیں۔ ؎

مگر نفس غافل کے مکر و فریب — لیے لیتے ہیں عقل و صبر و شکیب
جہاں جھونکا اک وسوسہ کا ان میں — تزلزل پڑا دین و ایمان میں
پڑا جس گھڑی معصیت کا حجاب — نہیں سوجھتا کچھ عذاب و ثواب

میرے خیال میں محض بے پردگی سے یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ ماحول اس قسم کے موجبات ترغیب سے پاک ہونا چاہیئے۔

آب و ہوا کا اثر

قدرت نے اس ملک کی آب و ہوا کو رُوح پرور بنایا ہے سردی کی وجہ سے جسمانی محنت تکان پیدا نہیں کرتی بلکہ کام کرنے کو دل چاہتا ہے آب و ہوا کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کے قوائے جسمانی مضبوط ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں گرمی قویٰ کو مضمحل کر دیتی ہے۔ نہ دماغی محنت ہو سکتی ہے نہ جسمانی بلکہ آرام طلبی کی طرف طبیعت مائل رہتی ہے۔ قدرت کے اس انتظام کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا لیکن خداوند کریم نے گرم ملک کے لوگوں کو عام طور پر ذہن اچھا بخشا ہے۔ اس نعمت خداداد سے ہم بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ماسوا اس کے یوروپین اقوام کی بعض خوبیوں کو اگر ہم اختیار کر لیں تو دنیوی ترقی میں بہت کچھ امداد ملیگی۔

انگریزوں کی خصوصیات

انگریزوں کو دیکھو یہ لوگ کیسے مستقل مزاج۔ دوراندیش منتظم اور وقت کی قدر کرنے والے ہیں۔ ان کے ملک میں کس قدر انصاف پسندی اور مساوات کا برتاؤ ہے زبردست اور کمزور۔ امیر و غریب سب کے حقوق برابر ہیں۔ مثلاً ریلوے اسٹیشن پر دیکھو گے کہ ٹکٹ لینے کے لئے کھڑکی کے سامنے ایک لمبی قطار کھڑی ہے۔

ہر شخص باری باری سے ٹکٹ لیتا ہے۔ بڑا آدمی قطار کے آخر میں کھڑا رہتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قوی کمزور آدمی کو ہٹا کر خود پہلے ٹکٹ خرید لے۔ قاعدہ کی پابندی سب پر لازم ہے۔ میرا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ یہ خوبیاں ہم میں مفقود ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ کمی کے ساتھ ہیں۔

فرائض منصبی کا احساس

فرائض منصبی کا احساس اِن لوگوں میں خصوصیت کے ساتھ ہے۔ بچپن ہی سے تربیت ایسی دی جاتی ہے کہ رفتہ رفتہ یہ خیال طبیعت ثانی کی صورت پیدا کر لیتا ہے۔ مرد ہو کہ عورت۔ بڑا ہو کہ چھوٹا۔ یہ احساس سب میں موجود ہے۔ فرائض کے اوقات میں نہ تفریح کا خیال پیدا ہوتا ہے اور نہ کسی سے فضول باتیں کر کے وقت ضائع کرتے ہیں بازار میں اکثر یہ منظر دیکھو گے کہ ملازم پیشہ لڑکیاں اپنی نوکری پر وقت مقررہ پر پہنچنے کے لئے تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی ہیں۔ بار بار اپنی گھڑی کو دیکھتی جاتی ہیں اور اس کوشش میں ہوتی ہیں کہ کسی طرح ایک منٹ کی بھی دیر نہ ہونے پائے۔ ڈیوٹی کے خیال نے اوقات کی پابندی کا بھی خیال پیدا کر دیا۔ یہ بات کچھ ملازمت پیشہ لوگوں ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ گھر کے کام کاج میں بھی یہی کیفیت دیکھی گئی۔ کام اول تو اوقات مقررہ کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں اس درجہ منہمک ہوتے ہیں کہ کسی سے غیر ضروری بات تک نہیں کرتے۔ سب کام خاموشی کے ساتھ اس طرح ہوتے رہتے ہیں گویا کہ ایک مشین کام کر رہی ہے۔ دوسری چیز قابل تعریف یہ ہے کہ کاروباری اور روزمرہ کے معاملات میں ایمان داری بہت ہے۔ دھوکا اور فریب کمتر دیکھا گیا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یورپ کے جملہ ممالک اس خصوص میں

یکساں نہیں ہیں بعض شہروں میں اجنبی آدمی کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے البتہ جرمنی اور انگلستان میں دہوکے کا احتمال بہت کم ہے۔ برلن کے ایک مشہور باغ لوناپارک میں ایک روز ہم سیر کر رہے تھے ریلہ بھرا ہوا تھا۔ آدمیوں کی کثرت تھی۔ ایک چھوٹی سی دکان سے ہم نے کچھ سودا خریدا۔ سکوں سے پوری وقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کچھ پیسے دکاندار کو زیادہ دیدیئے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد دکان کا ایک آدمی ہم کو تلاش کرتا ہوا ایک جگہ آیا اور فاضل پیسے واپس دے گیا۔ فرض کرو کہ یہ چند پیسے وہ واپس نہ کرتا تو ہم کو اس کی خبر ہوتی اور نہ اس پر کوئی الزام عائد ہوتا کیونکہ ایسے مجمع میں کسی کو تلاش کرکے نکالنا اور وہ بھی چند پیسوں کی خاطر کوئی آسان بات نہیں ہے۔

مقررہ قیمت ہر چیز کی قیمت مقرر ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ اجنبی آدمی کو دیکھ کر زیادہ قیمت وصول کریں۔ یہ مرض ممالک مشرقی میں بالعموم اور یورپ کے صرف چند شہروں میں دیکھا گیا۔ لندن میں اگر کسی ناسمجھ بچے کو بھی بازار میں بھجوا دیا جائے تو قیمت کے متعلق کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ اس کے خلاف قاہرہ میں اگر کوئی سمجھدار اجنبی بھی کامیابی کے ساتھ خرید و فروخت کر سکے تو اس کو خوش قسمت خیال کرو۔ یہ بات اب ہندوستان میں بھی ہو چلی ہے کہ ہر شہر میں بعض دکانیں ایسی ہیں جہاں قیمت مقررہ ہے خریدار کی حیثیت اس میں کوئی تغیر یا تبدل نہیں کر سکتی لیکن پھر بھی زیادہ تعداد ایسی دکانوں کی ہے جہاں قیمت کا دارومدار طرفین کی تجربہ کاری پر ہے قیمتوں کی یکسانیت کچھ دکانداری کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ جملہ کاروبار میں یہی حالت ہے مثلاً کپڑوں کی دھلائی مقرر ہے کسی تکرار کی ضرورت نہیں دھوبیا کی دکان پر کپڑے دیدو وہ ایک مطبوعہ فارم دیگی جس پر کپڑوں کی تفصیل

لکھی ہوئی ہے۔ صرف تعداد کے لحاظ سے اس کی خانہ پُری کردو۔ وہ وقت اور دن مقرر کردے گی۔ چاہے کپڑے اپنے مقام پر منگوالو یا خود دکان پر لینے کے لئے جاؤ وقت مقررہ پر ضرور مل جائیں گے۔ شاذ ایسا ہوگا کہ وقت مقررہ پر چیز نہ ملے۔

ہم کو بینکڑوں دفعہ تصویروں کے فلم دھلوانے کی ضرورت ہوئی۔ ہمیشہ دکان والا دن اور وقت مقرر کردیتا تھا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مقررہ وقت پر فلم تیار نہ ملا ہو۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ہم وقت مقررہ سے پندرہ منٹ پہلے دکان پر گئے اور فلم کا تقاضہ کیا۔ دکان پر ایک لڑکی کام کررہی تھی اُس نے

وعدہ کی پابندی

گھنٹہ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ تم پندرہ منٹ پہلے آگئے ہو۔ کچھ دیر ٹھہر کر آؤ تو فلم تیار ملے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا اس کے خلاف حیدرآباد میں جب ایک دکان پر فلم دھلنے کے لئے دیے تو متعدد مرتبہ چکر لگانے پڑے۔ ہر دفعہ دکاندار کچھ نہ کچھ بہانہ کرتا تھا۔ کبھی تو اس نے کہا کہ میں بھول گیا اور کبھی کہتا تھا کہ فرصت نہیں ملی۔ بالآخر کئی روز بعد اس نے فلم واپس کئے۔ مگر ایک فلم غائب تھا۔ عذر اس نے یہ کیا کہ دوسرے فلموں میں کہیں مل گیا ہے۔ فرصت سے تلاش کروں گا۔ ممکن ہے کہ یہ ایک معمولی بات معلوم ہو لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ چیزیں کاروبار کے فروغ میں بہت دخل رکھتی ہیں۔

مسلمان بھائیوں کے واسطے یہ مقام عبرت کا ہے کہ آج کل یورپین اقوام جن خوبیوں کی بدولت ترقی کررہی ہیں یہ سب کسی زمانہ میں مسلمانوں میں بھی موجود تھیں اگر ہم ان پر قائم رہتے تو آج یہ روز بد کیوں دیکھتے صفائی اور ستھرائی کے متعلق پیغمبر اسلام نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک معتبر حدیث یہ ہے۔ دُمْ عَلَى الطَّهَارَةِ يُوَسَّعْ عَلَيْكَ الرِّزْقُ (ہمیشہ پاک و صاف رہو

اس سے رزق زیادہ ہوگا) کیسی سچی بات ہے پاک وصاف رہوگے تو صحت بھی اچھی رہے گی۔ اور صحت اچھی ہو تو انسان کاروبار بھی کرسکیگا۔ یورپ نے اس بات کا ثبوت کافی طور پر دیدیا ہے یورپ کی ترقی کا ایک ذریعہ علم ہے دیکھو ہمارے سرکار دو عالم اس خصوص میں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ العلم لا یحل منعه یعنی (علم حاصل کرنے میں کوتاہی حرام ہے) اسی طرح پابندی اوقات۔ فرائض منصبی کے احساس اور کاروبار میں ایمانداری کے متعلق متعدد احکام موجود ہیں۔ خود پیغمبر اسلام نے اپنی دیانت اور امانت کی وجہ سے امین کا لقب حاصل کیا۔ کاش یہ تمام خوبیاں ہم میں واپس آجائیں پھر تو ترقی کا زینہ خود بخود کھل جائیگا۔

یورپین اقوام کے دو بڑے عیب

دنیا کی کوئی قوم عیوب سے پاک نہیں ہے۔ یورپ کی اقوام میں بھی اکثر باتیں ایسی پائی جاتی ہیں۔ جو ان کو تباہی کے راستہ پر تیز رفتاری کے ساتھ لیجارہی ہیں مجھ کو انگریزوں کی عیب جوئی مقصود نہیں ہے لیکن جو باتیں بالکل آئینہ ہیں اور بغیر کسی تلاش کے آنکھوں کے سامنے خود بخود آجاتی ہیں۔ ان کو میں ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا مس میو نے اپنی مشہور کتاب مدر انڈیا میں اہل ہنود کے عیوب کی پردہ دری کی ہے اگرچہ بہت مبالغہ کے ساتھ کام لیا گیا ہے لیکن ان باتوں کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو سوال یہ ہے کہ غیر قوم کے عیوب تلاش کرنے سے اپنی قوم کے حق میں کیا فائدہ برآمد ہوسکتا ہے حتی الامکان خوبیوں کی تلاش کرکے ان کو اخذ کرنا چاہیئے۔ مس میو نے اپنی کتاب میں اہل ہنود کی جن کمزوریوں کو ظاہر کیا ہے۔ ان میں سے اکثر خود یورپین اقوام میں شدت کے ساتھ موجود ہیں۔

دو بڑے عیب یورپین اقوام میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ

یہ کہ ان لوگوں نے مذہب کو بالکل چھوڑ رکھا ہے۔ خدا کا وجود ان کے نزدیک برائے نام ہے یہ ساری خرابی اس تعلیم و تربیت کی ہے۔ جو بچپن سے ان کو دیجاتی ہے۔ ماسوا اس کے سائنس کے حیرت ناک کرشموں کو روزانہ دیکھتے دیکھتے ذہنیت بھی بدل گئی ہے۔ ان کی عقل کسی بات کو تسلیم نہیں کرتی تاوقتیکہ اس کے اسباب سمجھ میں نہ آجائیں اور مشاہدہ سے اطمینان نہ ہو جائے اس حد تک تو مضائقہ نہیں۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ سائنس کو مذہب کی ضد سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے سائنس کی حیرت ناک ایجادات کو دیکھ کر خدا کی عظمت اور شان کا پہلے سے زیادہ قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہاں کیفیت برعکس ہے۔ دوسرا عیب عیش پرستی ہے میرے خیال میں نتیجہ ہے لامذہبی کا۔ کیونکہ خدا کو بھول جانے کے بعد انسان میں اچھے اور برے کی تمیز کم ہو جاتی ہے۔ مذہب ایک بڑا ذریعہ اصلاح باطن کا ہے اس سے اگر قطع تعلق کر لو تو اخلاق کے واسطے کوئی خاص معیار باقی نہیں رہتا۔ سامنے ایک وسیع میدان پاؤ گے۔ جس طرف جی چاہے دوڑتے پھرو اور کہدو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔ پوچھنے اور روکنے والا کون ہے۔ یہ کیفیت تمام یورپ میں پائی جاتی ہے۔ شرم اور حیا برائے نام رہ گئی ہے جو کچھ باقی ہے وہ بھی کچھ عرصہ میں جاتی رہے گی۔ برلن کا برہنہ کلب جس کی بنیاد لندن میں بھی پڑ گئی ہے صاف صاف اس منزل کی نشاندھی کر رہا ہے۔ جس کی طرف لامذہبی ان کو لیجا رہی ہے جدہر دیکھو کھلم کھلا حسن پرستی کے مزے لوٹے جا رہے ہیں۔ جائز اور ناجائز۔ حرام اور حلال کا امتیاز اٹھتا جاتا ہے۔ بالخصوص فرانسیسیوں کی حالت اس معاملہ میں بہت ناگفتہ بہ ہے وہ زمانہ بھی قریب آتا جاتا ہے کہ ہندوستان میں یہی رنگ نظر آئے گا۔ کیونکہ یورپ کی تعلیم کا اثر ہم لوگوں میں روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے جب تک ہمارے نونہالان چمن گلشنِ یورپ میں نشو و نما پاتے رہیں گے

وہاں کی زہریلی ہوا اپنا اثر پھیلاتی رہے گی۔ اِن باتوں کی روک تھام ابھی سے کرنا ضروری ہے۔

لیکن غضب تو یہ ہے کہ ہم لوگ خود مذہب سے دور ہوتے جا رہے ہیں عوام کو تو جانے دو۔ کیونکہ یہ طبقہ ہمیشہ گنہگار ہی سمجھا جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں کو دیکھو جو اپنے کو اصلاح ظاہر سے آراستہ رکھتے اور مذہبی پیشوائی کا دعویٰ کرتے ہیں کسی قوم یا ملت کے مقدس گروہ کو لے لو۔ بناوٹ اور نمائش ظاہری کی کمی نہ پاؤ گے روزہ، نماز، اور پوجا پاٹ میں بظاہر نہایت مستعد اور پابند۔ باتیں بھی اللہ والوں جیسی نصیحت کے پل باندھنے میں بڑے مشاق۔ لیکن ان کی خانگی زندگی کو ٹٹولو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب شیشہ بندی ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

بلاشبہ نوے فی صدی ایسے نکلیں گے جن کے اعمال دنیاداروں سے بھی بدتر ہیں تو اب صورت حال یہ ہوئی کہ ہماری اصلاح باطن جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ خود راہ راست پر نہیں ہیں۔ اور تعلیم و تربیت و تمدن میں ہم اس قوم کی تقلید کر رہے ہیں۔ جو مذہب سے بالکل دست بردار ہو چکی ہے۔ پس آئندہ ہمارا جو کچھ حشر ہونے والا ہے وہ معلوم

عیسائی پادریوں نے اپنی قوم کی ان خرابیوں کی طرف توجہ بھی کی ہے لیکن ان لوگوں کے نزدیک پادریوں کی نصیحت گوزشتر سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتی۔ وہ زمانہ گیا کہ پادری جنت کے چودھری سمجھے جایا کرتے تھے۔ اب تو اگر ان لوگوں کا بس چلے تو پادریوں کو جنت میں داخل بھی نہ ہونے دیں۔

مسٹر نارمن ڈگلس کے خیالات

ایک مستند انگریز مصنف نارمن ڈگلس نے ایک دلچسپ کتاب یورپ کے موجودہ طرز تمدن کے متعلق لکھی ہے مصنف مذکور نے لندن کی بازاری عورتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ زندہ ہو جائیں اور ان کو یورپ کی سیر کرائی جائے تو یقین ہے کہ وہ اپنی امت سے متنفر ہو کر سکونت کے لئے ہندوستان کو پسند کریں گے۔ لندن کے گوشہ مغربی میں عام طور پر نوجوان عورتیں مردوں کی گھات میں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ مسٹر نارمن ڈگلس ان عورتوں کا ذکر اپنی کتاب میں اس طرح کرتے ہیں کہ اکسفورڈ سرکس کے قریب نوجوان لیکن کنواری لڑکیاں اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ آئندہ چل کر کاروباری لوگوں کو راستہ چلنے میں بڑی دقت واقع ہوگی۔ اور زمین کے نیچے متعدد راستے بنانے پڑیں گے۔ یہی صاحب لکھتے ہیں کہ افسوس تو یہ ہے کہ ان میں سے بہت کم لڑکیاں پیشہ ور ہوتی ہیں مصنف مذکور کی رائے یہ ہے کہ ان لڑکیوں کو جہازوں میں سوار کرا کے مشرقی افریقہ کے علاقہ انگریزی میں بھجوا دیا جائے تو مناسب ہوگا۔ کیونکہ وہاں غیر شادی شدہ کثیر التعداد ملازمین کثیر تعداد میں ایسے ہیں جن کو گھرداری کے لئے عورتوں کی ضرورت ہے۔ لیکن خود ہی سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ عورتیں وہاں جانا پسند بھی کریں گی۔ پھر لکھتے ہیں کہ یورپ میں عورت کی عصمت اس قدر اہمیت نہیں رکھتی جتنی ہندوستان میں اور تحریر فرماتے ہیں کہ۔ اگرچہ اہل ہنود داشتہ رکھنا معیوب نہیں سمجھتے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ہندو کی داشتہ اس کے گھر میں رہتی ہے اور وہ اس کی پرورش کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن یورپین آدمی کی داشتہ یا تو بازار میں پھرتی رہتی ہے یا اپنے خاوند کے زیر پرورش رہتی ہے مسٹر نارمن ڈگلس نے یورپ کے متعلق اس خصوص میں جو کچھ لکھا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میں تمثیلاً دو واقعات ایسے بیان کرونگا

جن کا مجھ کو ذاتی تجربہ ہے۔ ایک روز رات کے وقت میں رسل اسکویئر کے قریب ایک گلی میں چلا جا رہا تھا۔ مقابل سے ایک نوجوان عورت آئی مجھ سے پوچھا کیا تم ایک سگریٹ دے سکتے ہو۔ میں نے اس کو ایک سگریٹ دیدیا۔ فوراً ہی اس نے کہا مجھے ایک شلنگ کی ضرورت ہے میں نے کہا افسوس ہے کہ میری جیب اس وقت خالی ہے۔ جواب دیکر میں جانا چاہتا تھا کہ اس نے مجھ کو روکا اور اصل مطلب پر گفتگو کرنے لگی میں نے اظہار مجبوری کیا۔ اور چلا آیا۔ دوسری دفعہ شام کو چار بجے کے قریب میں ایک بازار میں چلا جا رہا تھا۔ رفیق بیگ بھی ساتھ تھے۔ ایک نوجوان لڑکی سڑک کو عبور کرتے وقت ایک موٹر سے ٹکر کھا کر نیچے گر گئی۔ میں بالکل قریب تھا اس لئے اس کو نیچے سے اٹھایا۔ غنیمت کہ زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ اسی حادثہ کے متعلق باتیں کرتی ہوئی وہ ہمارے ساتھ ہو گئی۔ راستہ میں مجھ سے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو میں نے کہا امریکہ سے آتا ہوں۔ یہ سن کر اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور کہنے لگی پھر تو تم میرے دوست ہو۔ میں نے رفیق بیگ سے ہندوستانی میں کہا اس عورت سے کسی طرح پیچھا چھڑانا چاہیئے۔ ایک غیر زبان میں بات کرتے سن کر اس کے کان کھڑے ہوئے اور تعجب کے ساتھ پوچھا تم کس زبان میں گفتگو کر رہے ہو۔ میں نے کہا ہندوستانی زبان ہے۔ اس پر اس نے کہا تو کیا تم ہندوستانی ہو۔ یہ سن کر وہ مجھ سے بالکل الگ ہو گئی۔ اور سڑک کے دوسری جانب چلی گئی غالباً وہ سمجھتی تھی کہ امریکن دولتمند ہوتے ہیں ان سے کچھ فائدہ ہو جائیگا اور ہندوستانی اکثر طالب علم ہوتے ہیں جن سے نفع کی توقع زیادہ نہیں ہو سکتی۔

بیروزگاری

سنا ہے کہ لندن میں چار لاکھ عورتیں بے روزگار ہیں۔ ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان عورتوں کا

ذریعہ معاش کیا ہے۔ اگر اس کا جواب تفصیل کے ساتھ دیا جائے تو بجائے خود ایک دلچسپ کتاب ہوگی۔ اصل تو یہ ہے کہ ع

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما

ہر ملک کی معاشرت جداگانہ اصول پر ہوتی ہے۔ اور اس کے مطابق سب کام ہوتے رہتے ہیں لیکن آج کل بے روزگاری نے سب کا آنا گیلا کر رکھا ہے اخلاق پر اس کا اثر پڑنا ایک امر ناگزیر ہے۔

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی　　کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
رکھتی نہیں کسی کی یہ غیرت کی آن کو　　سب خاک میں ملاتی ہے حرمت کی شان کو

سرد مہری

انگلستان کے باشندوں کے متعلق غیر ممالک کے لوگوں کو عام طور پر یہ شکایت ہے کہ یہ لوگ سرد مہر اور دیر آشنا ہوتے ہیں۔ ایک حد تک یہ شکایت صحیح ہے۔ ہندوستان اور دیگر ممالک شرقیہ کی سی گرم جوشی یہاں نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے معاملات اور اغراض میں منہمک رہتا ہے۔ دوسروں کے حالات کی یہ لوگ جستجو کرتے ہیں اور نہ ان میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہندوستان میں پڑوس داری، محلہ داری، اور عزیزداری وغیرہ کے فرائض بہت مانے جاتے ہیں۔ اکثر تقاریب اور میل جول کے موقعوں پہ ان حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن یہاں اس قسم کی مروت اور معاشرت مفقود ہے برسوں ایک محلہ میں رہیں گے لیکن یہ بھی پتہ نہ چلیگا کہ پہلو میں کون رہتا ہے میں جس مکان میں مقیم تھا۔ اس کے قریب دو ایک اچھے مکانات تھے۔ لیکن ہمارے مکان کی مالکہ کو یہ خبر نہ تھی کہ ان مکانات میں کون رہتا ہے بلکہ اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پہلو کے مکان میں کون ہے۔ قرابت داری اور عزیزداری بھی محض میل جول کی حد تک ہوتی ہے۔ ہندوستان کی طرح یہ نہیں ہوسکتا کہ کمانے والا تو ایک لیکن

اس کے دست نگر متعدد افراد خاندان، یہاں کے لوگ ایسی قرابت داری کے معتقد نہیں ہیں۔ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنی پرورش کا خود ہی بندوبست کرے۔ مسافر نوازی اور مہمان نوازی کا جو دستور ہمارے ہاں ہے اس کا عشر عشیر بھی یہاں دیکھنے میں نہیں آتا۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ باتیں اچھی ہوں یا بری لیکن ایک نتیجہ اس روکھے پن کا یہ ضرور ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اس کو یہ معلوم ہے کہ اگر دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے تو ذاتی طور پر محنت اور مشقت کرنی چاہئے کسی سے مالی امداد کی توقع رکھنا بے سود ہے۔

بھیک مانگنے والوں کا طریقہ

اس ملک میں بھیک مانگنے والے بہت کم ہیں۔ میں نے چند معذور آدمیوں کو دیکھا جو محنت مزدوری کرکے گزر اوقات کرتے تھے۔ مثلاً دو ایک اندھے بعض مقامات پر کھڑے نظر آئے ان کے گلے میں ایک تختی لٹک رہی تھی جن پر نابینا لکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ دیا سلائی کی ڈبیاں لئے کھڑے تھے اسی طرح بعض معذور لوگ سڑک کے کنارے کسی گوشہ میں بیٹھے رہتے ہیں۔ زمین پر سفیدی سے کچھ نقش و نگار بنا کر ایک طرف نمایاں حروف میں "تھینک یو" یعنے آپ کا شکریہ لکھ دیتے ہیں۔ گویا نقش و نگار دیکھنے سے آپ کو اگر تفریح ہوئی ہے تو اس کے معاوضہ میں کچھ دیدیجئے۔ اتنے بڑے شہر میں صرف دو آدمی ملے جنہوں نے فقیروں کی طرح سوال کیا۔ ایک روز پکاڈلی میں کسی دکان کے سامنے میں کھڑا ہوا تھا ایک شخص میرے قریب آیا اور کہنے لگا۔ کہ میں بھوکا ہوں اور محتاج ہوں میری کچھ مدد کردیں میں نے اس کو ایک شلنگ دیدیا۔ دوسری دفعہ میں سراج الحق سے ملنے کے لئے جا رہا تھا سڑک پر ایک معمولی حیثیت کا آدمی کھڑا تھا۔ اس سے میں نے راستہ دریافت کیا وہ پندرہ

بیس قدم تک راستہ بتاتا ہوا میرے ساتھ آیا۔ میں جب شکریہ ادا کرکے اس سے الگ ہونے لگا تو اس نے کہا کہ مجھ کو پینے کے لئے کچھ دیتے جاؤ۔ پینے کے نام پر خیرات دیتے ہوئے مجھ کو پس و پیش ضرور ہوا۔ لیکن موقع کچھ ایسا تھا کہ انکار نہ کرسکا ایک شلنگ اس کو بھی دیدیا۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر میں انکار کر دیتا تو یہ شخص خاموشی کے ساتھ میرا پیچھا چھوڑ دیتا اور اس طرح دق نہ کرتا۔ جیسے مصر کے لوگ عام طور پر کرتے ہیں۔ ان دونوں واقعات کا تذکرہ میں نے اپنی مالکۂ مکان سے کیا تو اس نے کہا تم نے ناحق دو شلنگ خراب کئے۔ اس قسم کے لوگ ہرگز امداد کے لائق نہیں۔

بیکاری جنگ عظیم کے بعد سے بے روزگاری روز بروز زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جماعہ آبادی کے منجملہ تینتیس فی صدی بے روزگار ہیں۔ اکیس فی صدی کے قریب بچے ہیں۔ بقیہ کام پر ہیں۔ جو لوگ کام سے لگے ہوئے ہیں۔ ان میں (۷۰) فیصدی ایسے ہیں جن کی ہفتہ وار آمدنی پچپن شلنگ سے نیچے ہے۔ یا یوں سمجھو کہ ایک سو ساٹھ روپیہ ماہانہ کے اندر ہے۔ آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ طباعت اور اخبار نویسی سے متعلق ہے۔ چنانچہ بازاروں میں اخباروں اور کتابوں کی دکانیں بکثرت پاؤ گے بیکاری کے مسئلہ پر حکومت غور کرتی رہتی اور حتی الامکان اس کو رفع کرنے کی تدابیر عمل میں لاتی رہتی ہے جابجا اس کے متعلق دفاتر قائم ہیں جن کو لیبر ایکسچینج کہتے ہیں اس دفتر میں متعلقہ محلوں کے بیروزگار آدمیوں کی فہرست اور ان کی قابلیت کا اندراج ہوتا ہے جس کسی کو ملازم کی ضرورت ہو وہ اس دفتر میں اپنی ضروریات کی اطلاع دیدے تو آسانی کے ساتھ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غلام یزدانی صاحب کو ایک ٹائیپسٹ کی ضرورت تھی۔ قریب کے دفتر میں اطلاع دیدی گئی

دوسرے دن دفتر والوں نے ہمارے مکان پر ایک لڑکی کو بھجوایا۔ جو اس کام سے بخوبی واقف تھی۔ بیروزگار لوگوں میں ایک خاص قسم کی جماعت ہوتی ہے جس کو محتاج کہتے ہیں۔ یہ کثیر التعداد ہے۔ حکومت نے محتاجین کی گذر اوقات کے لئے خاص انتظام کر رکھا ہے۔ ایک کثیر رقم سالانہ اس گروہ کی پرورش میں صرف کی جاتی ہے۔ خود دار لوگ اس خیرات سے مستفید نہیں ہوتے۔ بعض اہل الرائے حکومت کی اس پالیسی کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کام کرنے والوں پر ٹیکس عاید کرکے بیکار لوگوں کی پرورش کرنا ملک کے حق میں مضرت بخش ہے۔ اس رعایت کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ محتاجین کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یہ اعتراض صحیح ہو یا غلط لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ لندن کے بازاروں میں گداگروں کی مصیبت نہیں ہے۔

افلاس کا بڑا سبب یہاں کا معیارِ زندگی ہے اگر ضرورتیں محدود اور زندگی سیدھی سادھی ہو تو اس مصیبت میں بہت کچھ کمی ہو جائے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ضرورتوں میں روزانہ اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے اور آجکل تہذیب و شائستگی کا معیار بھی یہی رکھا گیا ہے۔ صاحب بہادر کو صبح اٹھتے ہی کنگھا۔ برش۔ خوشبو۔ صابن۔ تولیہ منجن۔ دانتوں کا برش۔ آئینہ۔ جوتے کا برش۔ پالش اور پچاسوں چیزیں درکار ہیں۔ ناشتہ میں چائے۔ انڈا۔ اور ڈبل روٹی وغیرہ ناگزیر ہے۔ میز کرسی کانٹے چمچے۔ جوتا۔ جراب اور آرایش کی بہترین چیزیں لوازماتِ زندگی میں داخل ہیں سینما تھیٹر اور دوسرے اخراجات تفریح علیحدہ ناک میں دم کر رہے ہیں۔ آخر روپیہ آئے تو کہاں سے آئے۔

آج سے سو برس پہلے علم معاشیات کا ایک مشہور عالم مالتھس یہ بات بتا گیا ہے کہ انسان کی ضرورتیں جس تیز رفتاری کے ساتھ زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔ اس مناسبت سے

آمدنی میں اضافہ نہیں ہوتا لازمی نتیجہ اس کا افلاس ہے۔ البتہ اس کا توڑ یہ ہے کہ دنیا میں وبائی امراض شائع ہوں یا عالمگیر جنگ ہو۔ جنگ تو ایسی ہوئی کہ باید وشاید لیکن حفظان صحت کی تدابیر نے یورپ میں عمر کا اوسط بڑھا دیا ہے۔ معیارِ زندگی ہندوستان میں بھی اونچا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ہنوز ابتدائے عشق ہے آنیوالی مصیبت کو گاندھی جی نے خوب تاڑ لیا ہے۔ انہوں نے عملی طور پر سیدھی سادھی زندگی کا نمونہ پیش کر دیا۔

وسعتِ اخلاق

یہ لوگ عام طور پر خلیق ہوتے ہیں اجنبی آدمی کو راستہ بتانے یا اور کوئی واجبی امداد دینے میں دریغ نہیں کرتے۔ اکثر راستہ پوچھنے کا اتفاق ہوا کبھی کسی نے پہلوتہی نہیں کی بہت اخلاق کے ساتھ ممکنہ امداد دی کسی نے معاوضہ بھی نہیں مانگا۔ عام طور پر قاعدہ یہ ہے کہ پولیس کانسٹیبل سے امداد لیجاتی ہے مگر بعض دفعہ یہ شخص موقع پر نہیں ملتا ایسی صورت میں راستہ چلنے والوں سے مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ لندن میں رات کے گیارہ بجے تک میں رہا۔ نیا نیا آیا ہوا تھا۔ مکان جانے کا راستہ ذہن سے نکل گیا۔ سب سے آسان طریقہ تو یہ تھا کہ لندن برج اسٹیشن چلا جاتا۔ وہاں سے فارسٹ ہل کو ریل سیدھی جاتی ہے۔ یا وکٹوریہ اسٹیشن سے ٹریم میں سوار ہو جاتا۔ اس وقت ان راستوں کا خیال نہ رہا۔ ایک شخص نے کہا کہ وکٹوریہ سے ریل کے ذریعہ سیدھے کرسٹل پیلس چلے جاؤ۔ وہاں سے فارسٹ ہل کی ریل مل جائے گی ظاہر ہے کہ یہ راستہ بہت چکر کا تھا۔ مگر اس شخص کے معلومات محدود تھے۔ اس کی ہدایت کے مطابق وکٹوریہ اسٹیشن جا کر کرسٹل پیلس کا ٹکٹ خریدا ابھی ریل میں نہ بیٹھا تھا کہ پلیٹ فارم پر ایک ٹکٹ کلکٹر ملا اس نے یہ مشورہ دیا کہ کرسٹل پیلس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ راستہ میں ایک اسٹیشن ویسٹ نار وڈ ملیگا

وہاں اُتر جاؤ۔ وہاں سے فارسٹ ہل کو ریل جاتی ہے۔ میں نے اس مشورے پر عمل
کیا۔ لیکن ناراوڈ کے پلیٹ فارم پر ریلوے کے ایک ملازم نے کہا تم نے بڑی غلطی
کی سیدھے کرسٹل پیلس چلے جاتے تو فارسٹ ہل کی ریل مل جاتی۔ یہاں سے بھی
ریل جایا کرتی ہے لیکن اس وقت بارہ بجے ہیں آخری ریل ابھی چھٹ گئی اب صبح
تک کوئی ریل نہیں جائے گی۔ یہ سن کر بڑی پریشانی ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں لندن
میں بالکل اجنبی ہوں۔ وکٹوریا پر ایک ٹکٹ کلکٹر نے یہاں اترنے کا مشورہ
دیا تھا۔ اب تم لوگ کچھ امداد کرو۔ اس نے کہا اچھا تم میرے ساتھ آؤ۔ میں کوشش کرتا
ہوں اس نے میرے سامنے کرسٹل پیلس کے اسٹیشن ماسٹر کو ٹیلیفون دیا اور کہا کہ اس
طرح ایک اجنبی آدمی یہاں اتر گیا ہے۔ ریل والوں نے انہیں مشورہ غلط دیا اسلئے
ہمارا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں۔ یہ دوسری ریل سے کرسٹل پیلس آتے ہیں۔ وہاں سے
جو آخری ریل جانے والی ہے۔ اس کو دو منٹ کے لئے ٹھہرالو۔ ورنہ ان کو بڑی پریشانی
ہوگی۔ ادھر سے جواب ملا کہ اب کوئی ریل جانے والی نہیں ہے۔ اس اثناء میں ریل کا
ایک افسر آ گیا۔ اس سے جب تمام قصہ کہا گیا۔ تو اس نے کہا فکر مت کرو۔ میں خود
کرسٹل پیلس جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ ریل میں بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو مال گاڑی میں سوار
کرا دوں گا۔ دو تین منٹ بعد ریل آئی۔ مجھ کو اپنے ساتھ درجہ اول میں بٹھا لیا۔ میں
نے کہا تمھارے تحت ملازم نے میرے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کیا ہے تم اجازت دو
تو اس کو کچھ معاوضہ دے دوں۔ اس نے کہا ضرورت تو نہیں ہے۔ لیکن تم دینا
چاہتے ہو تو مجھ کو اعتراض نہیں ہے۔ میں نے ایک شلنگ دیدی۔ کرسٹل پیلس
پہنچے پر معلوم ہوا کہ مال گاڑی کے جانے میں تاخیر ہے۔ ریلوے افسر نے کہا اس کا
انتظار نہ کرو ورنہ صبح کو تین بجے تک مکان پہنچو گے۔ بہتر یہ ہے کہ ٹیکسی لے کر چلے جاؤ
میں نے کہا مجھ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس وقت ٹیکسی کہاں ملے گی۔ اس پر افسر مذکور نے

اپنے ایک ماتحت کو بلا کر کہا کہ ان صاحب کو باہر لیجاؤ اور ایک ٹیکسی لیکر ٹیکسی والے کو سمجھا دو کہ یہ اجنبی ہیں ان کو پہنچا دے۔ چنانچہ اس ملازم نے ٹیکسی تلاش کی۔ لندن کے اس حصہ میں رات کے وقت ٹیکسی آسانی کے ساتھ نہیں ملتی اس لئے کچھ وقت صرف ہوا سفارسٹ ہل کی جس گلی میں ہمارا مکان تھا اس کا نام تو مجھے یاد تھا لیکن مکان کا نمبر یاد نہ رہا۔ اس سڑک پر اندھیرا بھی تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اُدھر سے ادھر کئی چکر لگائے مگر مکان نہ ملا۔ موٹر والے نے کہا جب تک نمبر نہ معلوم ہو مکان کا پتہ نہیں چل سکتا۔ مکان والوں کے نام سے کچھ مدد نہ ملیگی۔ بالآخر میں موٹر سے اتر کر بہت تفصیل کے ساتھ مکانات کو دیکھا گیا۔ بڑی جستجو کے بعد مکان ملا۔ موٹر والے نے کہا۔ اچھی طرح سے اطمینان کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ آدھی رات کے وقت کسی غیر مکان میں داخل ہو جاؤ خدا کا شکر ہے کہ اس بے لطفی کی نوبت نہ آئی۔

ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ میں رات کو گیارہ بجے کے قریب لندن سے واپس آیا۔ ٹریم سے اتر کر مکان جا رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک وزنی سوٹ کیس بھی تھا۔ اس لئے جگہ جگہ ٹھہر کر آرام لینے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک شخص موٹر سائیکل پر جس میں ایک سائڈ کار بھی لگی ہوئی تھی پہلو سے گذرا۔ اور کچھ دور جا کر ٹھہر گیا جب قریب پہنچا تو اس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا مکان دور ہے اور سوٹ کیس کی وجہ سے تم کو زحمت ہو رہی ہے۔ کیا میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے کہا مکان قریب آگیا ہے۔ تم کو تکلیف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایک روز یہ ہوا کہ کیمڈن اسکوئر میں ایک دوست کا مکان تلاش کر رہا تھا۔ اس نواح میں متعدد گلیاں ہیں اس لئے کسی قدر زحمت پیش آئی۔ ایک سن رسیدہ عورت گوشت ترکاری کی ٹوکری ہاتھ میں لئے جا رہی تھی۔ اس سے راستہ دریافت کیا اس نے کہا میں خاص اس گلی کی طرف تو نہیں جا رہی ہوں۔ لیکن کچھ دور تک چلکر تم کو راستہ

آرچ دی ٹرائف - پیرس

شہر میلان کے ایک تھیٹر کا اندرونی حصہ

ضرور بتلادوں گی کہتی تھی کہ تم اس ملک میں اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ ہندوستان سے آتا ہوں اور لندن آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں ہوا۔ اس نے کہا تعجب ہے کہ تم انگریزی اچھی طرح بولتے ہو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں لوگ انگریزی پڑھتے ہیں حسن اتفاق دیکھو کہ کچھ دنوں بعد یہی عورت اسی نواح میں دوبارہ ملی۔ اور میں نے پھر راستہ پوچھا لیکن اس کو پہچان نہ سکا۔ اس نے خود ہی سوال کیا کہ تم وہی اجنبی ہو۔ جس کی مدد میں نے چند روز پہلے کی تھی؟ اس وقت مجھ کو بھی خیال آیا۔ میں نے کہا کہ وہی شخص ہوں اور ممکن ہے کہ میں تیسری دفعہ پھر تم ہی سے راستہ دریافت کروں۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ اگرچہ خشک ہیں لیکن وقت ضرورت اس کی امداد دینے میں دریغ نہیں کرتے۔

لندن کی پولیس

اجنبی آدمی کو پولیس کانسٹبل سے بڑی مدد ملتی ہے یہ شخص اگرچہ اپنے فرائض میں ہر وقت مصروف رہتا ہے اور بات کرنے کی فرصت نہیں رہتی لیکن راستہ بتانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا۔ خود اس کو معلوم نہیں ہے تو جیب میں سے گائڈ بک نکال کر دیکھے گا غرض یہ کہ ہر ممکنہ طریقہ سے امداد کریگا۔ یہاں پولیس کے ملازم بڑے بڑے قد کے اور تنومند لوگ ہوتے ہیں۔ لندن کے متعلق ان کے معلومات بہت وسیع ہوا کرتے ہیں کانسٹبل کی تنخواہ تقریباً ڈھائی سو روپیہ مہینہ ہوتی ہے۔

ہندوستان کے حالات سے بے خبری

یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ یہاں کے لوگ ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی حالات سے عام طور پر ناواقف ہیں یوں تو اخبار بینی کا شوق عام ہے۔ مگر ان کی دلچسپی کی باتیں کچھ اور ہوتی ہیں زیادہ تر کھیل کود اور تفریح کی خبروں کی تلاش رہتی ہے۔ ہندوستان کی خبروں کو

سرسری طور پر پڑھتے ہیں۔ اکثر آدمیوں سے ہندوستان کے متعلق گفتگو کا موقع ہوا
چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کو معلوم نہیں۔ ان کو یہ بھی خبر نہیں کہ ہندوستان میں
انگریزی تعلیم عام ہو گئی ہے۔ اور لوگ انگریزی سمجھتے ہیں۔ لندن کے ایک ہوٹل
میں چند انگریز ٹھہرے ہوئے تھے۔ کھانے کے وقت ان سے میری بات
چیت ہوئی۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ میں حال ہی میں ہندوستان سے آیا ہوں
تو تعجب کے ساتھ پوچھتے تھے کیا ہندوستان کے مدارس میں انگریز مدرس اور
پروفیسر پڑھاتے ہیں۔ بعض کہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ کالے ہوا کرتے
ہیں۔ تمہارا رنگ گورا کیسے ہے۔ ان کے تصور میں ہندوستانی سب کالے ہوتے
ہیں اکثر یہ ہوا کہ لوگ سوال کرتے کہ تم کہاں سے آئے ہو میں جواب دیتا کہ تم
خود ہی پہچان لو میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ کوئی کہتا جنوبی فرانس۔ کوئی کہتا
اسپین دو ایک نے مصر کا نام لیا۔ لیکن کسی نے اصل حقیقت کو نہیں پہچانا۔

ایک لطیفہ ایک غلط فہمی یہاں کے لوگوں کو یہ بھی ہے کہ ہندوستان
میں سب لوگ متعدد بیویاں کرتے ہیں۔ ہمارے مکان
میں لٹویا کی طرف کی جو لڑکی ٹھہری ہوئی تھی اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ روایت
مبالغہ کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ میں نے اس کو ہر چند یقین دلانا چاہا کہ بہت
کم آدمی ایسے ہیں جو وقت واحد میں دو نکاح کرتے ہوں۔ وہ کہتی تھی میں نے معتبر
ذرایع سے سنا ہے کہ کوئی ہندوستانی ایک بیوی پر قناعت نہیں کرتا۔ ایک روز
اس معاملہ سے متعلق بڑا لطیفہ رہا۔ پڑوس کے مکان میں ایک اور لڑکی لٹویا کی ٹھہری
ہوئی تھی۔ اس کا بھی یہی خیال تھا اکثر مجھ سے پوچھا کرتی تھی کہ تمہارا حرم کتنا بڑا
ہے۔ اور ہندوستانی اس قدر بیویوں کے ساتھ کیسے خوش رہتے ہیں۔ ایک
دن راستہ میں اس سے ملاقات ہوئی۔ اس لئے حسب عادت یہی تذکرہ چھیڑ دیا

مجھ کو اس وقت مذاق کی سوجھی میں نے کہا ہندوستان میں میری متعدد بیویاں ہیں
لیکن میں چاہتا ہوں کہ لندن سے بھی ایک بیوی ساتھ لیتا جاؤں۔ چنانچہ ایک
انگریزن میرے ساتھ نکاح پر آمادہ ہو گئی ہے اور کل شام کو میرا نکاح ہے۔ میں
تم کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ آکر محفل عقد میں شریک ہو اور چائے وہیں پیو اگرچہ
یہ گفتگو مذاقیہ تھی لیکن وہ اس کو واقعہ سمجھی اور بہت جوش و خروش کے ساتھ مجھ سے
لڑنے لگی۔ کہ ہرگز ایسا نہ ہونا چاہئے اور پوچھتی تھی کہ اس لڑکی کو تم نے اطلاع
دیدی ہے یا نہیں کہ ہندوستان میں تمہاری متعدد بیویاں موجود ہیں۔ میں نے کہا
اطلاع دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ اس لڑکی نے خود مجھ سے دریافت
نہیں کیا۔ بہر حال تم ضرور شریک ہونا اس گفتگو کے بعد میں لندن چلا گیا۔ مگر وہ
لڑکی سیدھی ہمارے مکان پر گئی۔ مالکہ مکان سے تمام واقعہ بیان کیا اور اصرار
کیا کہ اس نکاح کو کسی طرح روکنا چاہئے۔ میں جب مکان واپس آیا تو مالکہ نے
مجھ سے بہت بےچینی کے ساتھ کہا کہ مسٹر بیگ اگر تم برا نہ مانو تو میں تم سے ایک
بات دریافت کروں۔ میں نے کہا بہت شوق سے پوچھو۔ اس نے پوچھا کیا
یہ صحیح ہے کہ تم یہاں کسی لڑکی سے عقد کرنے والے ہو۔ میں نے اصلی واقعہ
بیان کیا تو وہ بہت ہنسی۔ اس کے بعد جب کبھی وہ لڑکی ہمارے یہاں آتی تو
سب ملکر اس کا مذاق اڑاتے۔ اس واقعہ سے اس امر کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ یہاں
کے لوگ پسند نہیں کرتے کہ انگریز لڑکیاں ہندوستانیوں سے شادی کریں۔

بین الاقوامی شادیاں

انگریزوں کی طرح ہندوستان کے لوگ بھی اس بین الاقوامی
شادی کو پسند نہیں کرتے حقیقت میں یہ ایک بے جوڑ
بات ہے اس مصیبت کا شکار زیادہ تر ہمارے ہاں
کے نو عمر طالب علم بنتے ہیں۔ آغاز جوانی میں جذبات پر قابو اور دور اندیشی کو

پیش نظر رکھنا کسی قدر مشکل کام ہے۔ بالخصوص غیر ملک میں جہاں نہ تو والدین نگرانی قائم رکھ سکتے ہیں اور نہ دوسرے بہی خواہ نیک مشورہ دینے والے موجود ہوتے ہیں صورتِ حال اور بھی خطرناک ہو جاتی ہے۔ ہندوستان سے جو طالب علم یورپ جاتے ہیں وہ اکثر خاندان کے اچھے ہوتے ہیں لیکن تعصب قومی کی وجہ سے انگلستان میں شریف الخاندان اور مساوی درجہ کے لوگ ان سے زیادہ میل جول رکھنا پسند نہیں کرتے۔ بھلا اچھے خاندان کی لڑکی شادی کے واسطے کیوں ملنے لگی تھی۔ البتہ معمولی طبقہ کی وہ لڑکیاں جو بے روزگار ہوتی ہیں یا ملازمت کر کے اپنی زندگی کے دن کاٹتی ہیں اور کوئی پرورش کرنے والا ان کو نصیب نہیں ہوتا۔ ہندوستانی طالب علموں کو اپنا شکار بنا لیتی ہیں۔ ابتداء میں محبت کے جذبات فریقین کو اندھا کر دیتے ہیں۔ مگر نکاح کے بعد جب عورتیں ہندوستان آتی ہیں تو ان کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ یہاں کی طرز معاشرت اور آب و ہوا ان کو ناپسند ہوتی ہے۔ ان کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے کسی پرند کو قفس میں بند کر دیا ہو۔ ہندوستانی شوہر کے والدین اور اقرباء الگ ناراض رہتے ہیں۔ الغرض زندگی ایک مصیبت ہو جاتی ہے۔ انگریز بیوی کسی نہ کسی طرح اپنے وطن کو واپس چلی جاتی ہے نان نفقہ کے واسطے نالش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ قومی برتری کی وجہ سے وہ اکثر کامیاب رہتی ہے۔ خاوند بیچارہ ہر چند سابقہ وعدے وعید کو یاد دلا کر یہ کہتا رہتا ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی وعدہ یعنے نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بھلا میم صاحبہ کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ ایسے وعدوں کو یاد رکھیں یاد بھی ہوں تو حامی کیوں بھرنے لگی تھیں۔ دیسی شوہر کی تو اچھی طرح خانہ بربادی

مگر ولایتی بیوی اپنے وطن میں گل چھرّے اڑاتی رہتی ہے ایک تو بیوی ہاتھ سے گئی دوسرے اس کو منصب بھی دینا پڑا شماتت ہمسایہ اس کے سوا ہے گویا سمندناز پر اک اور تازیانہ ہوا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے رہے
گئے دونوں جہان سے خدا کی قسم نہ ادھر کے ہوے نہ ادھر کے رہے

ایسی مثالیں کم پاؤگے کہ یہ گنگا جمنی میل راس آیا ہو۔ راس بھی آتا ہے تو اس طرح کہ خاوند اپنے عزیزواقارب سے بالکل الگ ہوکر بودوباش اختیار کرے کیونکہ ہندوستان آنے کے بعد ولایتی بیوی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یوربین اقوام ہندوستانیوں کے ساتھ برتاؤ کیا رکھتے ہیں۔ اس بیوی کو خوش رکھنے کے لئے اخراجات بھی کیسے کیسے لاحق ہوتے ہیں۔ روزمرہ کے خرچ کو جانے دو لیکن موسم گرما میں میم صاحبہ رنگ لاتی ہیں۔ یا تو پہاڑ پر جاکر رہیں گی یا وطن یاد آئے گا۔ اگر شوہر دولتمند ہے تو خیر ورنہ متوسط درجہ کا آدمی یہ بار کیسے اٹھا سکتا ہے الغرض کامیاب شادی آدھی خانہ بربادی کے قریب ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اولاد کا کیا حشر ہوگا نہ تو خالص یوربین نہ خالص ہندوستانی۔ ایک خاص اصطلاح ان کے لئے وضع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر ان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا وہ ظاہر ہے اینگلو انڈین اور یوریشین حضرات کو دیکھو۔ یوربین لوگ تو ان کو منھ بھی نہیں لگاتے اور ہندوستانیوں میں اپنے کو شمار کرنا یہ خود اپنی ذلت خیال کرتے ہیں۔ سوسائٹی میں ان کی جو وقعت ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ خدا ہمارے نوجوانان وطن کو نیک ہدایت دے۔

کالے گورے کا تعصب

سنا ہے کہ یہاں کے لوگ ہندوستانیوں کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور ان کے ساتھ تعصبانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ میرے ایک دوست جو طالب علم ہیں کہتے تھے کہ ایک دفعہ وہ اپنے قیام کے لئے مناسب جگہ تلاش کرتے پھرتے تھے کہ ایک مکان پر یہ نوٹس لگا دیکھا کہ یہاں کمرے خالی ہیں۔ انہوں نے مالک مکان سے ملاقات کی تو اس نے کہا کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ میرے دوست نے کہا تمہارے نوٹس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جگہ خالی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ نوٹس غلطی سے لگا ہے۔ میں ابھی اس کو اتارے لیتی ہوں یہ کہکر اس نے نوٹس بورڈ اتار لیا۔ یہ وہاں سے چلے آئے۔ لیکن اتفاق سے دوسرے ہی دن جب ادھر سے گذرے تو وہی نوٹس بورڈ لگا ہوا تھا۔ انھوں نے دوبارہ مالکہ مکان سے دریافت کیا۔ آخرکار اس نے صاف صاف یہ کہدیا کہ میرے دوسرے مہمان اس مکان میں ہندوستانیوں کا ٹھہرنا پسند نہیں کرتے اس لئے مجبور ہوں۔ اس قسم کے واقعات کے متعلق حال ہی میں ایک صاحب نے پارلیمنٹ میں بھی سوال کیا تھا۔ جواب صرف اس قدر ملا کہ کاروباری معاملات میں حکومت دخل نہیں دے سکتی۔ یہ کیفیت کچھ انگلستان کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ امریکہ میں یہاں سے زیادہ تعصب ہے۔

ایک روز ہائڈ پارک میں یہ تماشہ میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کا آدمی جو غالباً افریقہ کی طرف کا رہنے والا تھا۔ چند لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ لڑکیاں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ کچھ دیر کی تفریح کے بعد یہ لڑکیاں اس کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ اس کے چہرے سے مایوسی اور ملال کے آثار نمایاں تھے۔ شاید وہ اس غلط فہمی میں تھا کہ کسی لڑکی سے دوستی ہو جائیگی۔

لیکن یہ خبر نہ تھی کہ ع این خیال است و محال است و جنوں

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہئے

بھلا انگلستان کی عورتیں کب کالے رنگ کو پسندیدہ نظر سے دیکھتی ہیں۔ البتہ فرانس اور جرمنی میں اس کا خیال کم ہے۔ میں نے برلن اور پیرس کے ناچ گھروں میں حبشیوں کو یورپین عورتوں کے ساتھ ناچتے ہوئے دیکھا ہے رنگ کا تعصب فرانس میں سب سے کم پایا گیا۔ میرے ایک دوست کہتے تھے کہ ایک دن وہ پیرس کے کسی رسٹوران میں کھانا کھا رہے تھے۔ مقابل کی میز پر کچھ انگریز سیاح بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک سیاہ رنگ کا آدمی آیا اور انگریزوں کی میز پر بیٹھ گیا۔ انگریزوں نے منیجر سے شکایت کی اور چاہا کہ وہ اس کالے آدمی کو وہاں سے اٹھا دے۔ منیجر نے صاف الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ یہ انگلستان نہیں ہے پیرس میں کالے گورے کا فرق نہیں کیا جا سکتا۔ انگریز برانگیختہ ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ راوی معتبر ہیں اس لئے میں نے اس واقعہ کا تذکرہ کر دیا۔

ایک روز ان ہی باتوں کا ذکر ہمارے مکان میں ہو رہا تھا میں نے مالکہ مکان سے دریافت کیا کہ تم لوگ ہندوستانیوں کو تہذیب اور انسانیت سے خارج سمجھتے ہو۔ اس نے کہا میں تم سب کو اچھے کپڑے پہنتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ اور سب کے خیالات اچھے پاتی ہوں۔ اس لئے سمجھتی ہوں کہ ہندوستانی شائستہ ہوتے ہوں گے۔ بلکہ میں چاہتی ہوں کہ میرے مکان میں زیادہ تر ہندوستانی ٹھہرا کریں۔

شادی کے متعلق خیالات

ہماری مالکہ مکان اکثر ہندوستان کی معاشرت کے متعلق حالات دریافت کرتی تھی۔ یہ سُن کر وہ خوش ہوئی کہ ہندوستان میں شادیاں والدین کی مرضی پر ہوا کرتی ہیں۔ اور شاکی تھی کہ ہمارے ملک میں والدین کی اب نہ تو وہ وقعت ہے۔ جو پہلے تھی اور نہ اولاد پر ہم کو کچھ اختیار ہے۔ پچھلے زمانہ کی تعریف کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ اس وقت اتنی خودسری نہ تھی ماں کے اِن خیالات سے لڑکی کو اتفاق نہ تھا۔ وہ موجودہ رواج کی حامی تھی۔ ماں کو یہ شکایت رہتی تھی کہ کئی دفعہ میری لڑکی کی نسبت کا موقع آیا اور میں چاہتی تھی کہ اس کی شادی ہو جائے۔ لیکن اس کو کوئی نسبت پسند ہی نہیں آتی۔ خدا معلوم اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ باپ بچارہ بھی اس غم میں مبتلا تھا میں نے دو ایک دفعہ مس دیب سے دریافت بھی کیا کہ تم کیوں شادی نہیں کرتی ہو تمھارے والدین اس بات پر تم سے ناراض بھی ہیں وہ کہتی تھی کہ یہ کام والدین کے خوش کرنے کے واسطے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا اثر میری زندگی پر ہوگا۔ نہ کہ والدین کی۔ جن آدمیوں کو میرے والدین شادی کے لئے موزوں خیال کرتے ہیں وہ مجھے پسند نہیں۔ آج کل مردوں کو اپنا پیٹ پالنا مشکل ہو رہا ہے۔ بیوی کی پرورش کیا کریں گے۔

انگلستان میں بلکہ یورپ میں یہ مرض عام ہوگیا ہے کہ شادی نہیں کرتے جنگ عظیم کے بعد سے اول تو مردوں کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ دوسرے گرانی اور بے روزگاری نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ جہاں تک ممکن ہے تجرد ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے شادی کرلی ہے۔ وہ اسی فکر میں رہتے ہیں۔ کہ اولاد زیادہ نہ ہونے پائے۔ کیونکہ ان کی تعلیم و تربیت میں اخراجات

لاحق ہوتے ہیں۔ شادی کے مخالفین کی تعداد میں روز بروز ترقی ہوتی جارہی ہے اعداد و شمار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک انگلستان میں انیس آدمی فی ہزار شادی شدہ تھے۔ لیکن سنہ ۱۹۲۶ء میں ان کی تعداد سولہ سے اوپر نہ تھی۔ عورت اس فکر میں رہتی ہے کہ خاوند ایسا ہو جو اس کو آرام کے ساتھ گھر میں بٹھائے نوکری کی ضرورت نہ ہو۔ مرد چاہتا ہے کہ بیوی بھی کما کر لائے۔ غرض اس پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ یہ تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہاں کے لوگوں میں توالد و تناسل کی طرف رغبت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ جذبہ بالکل فطرتی ہے اور فطرت کا عمل ساری دنیا میں یکساں ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر یہ لوگ اقتصادی پہلو سے نظر ڈالتے ہیں بیروزگاری کی موجودہ حالت کیا کم تکلیف دہ ہے افزائش نسل اگر جاری رہے تو اس مصیبت میں اور ترقی ہو جائے گی اسلئے تجرد کو پسند کرتے ہیں لیکن اس کا دوسرا پہلو اخلاقی نقطۂ خیال سے بہت تاریک ہے۔

عورت ہو کہ مرد خواہشات نفسانی کی تکمیل سب کو کرنی پڑتی ہے۔ یہ قدرت کا ایسا تقاضہ ہے کہ اس کی تعمیل نہ کیجائے تو انواع و اقسام کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ یورپ میں فی الحال اس فرض کو ادا کرنے کے لئے تین طریقے رائج ہیں۔ تجرد پسند گروہ کے بعض لوگ فاحشہ عورتوں کے ذریعہ اپنی حاجت روائی کرتے ہیں جس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں مرد اور عورت الرض مخصوص میں مبتلا ہیں۔ حکومت کی طرف سے فاحشہ عورتوں کو تندرست رکھنے کا کوئی انتظام انگلستان میں نہیں ہے۔ اگرچہ عملی طور پر ان عورتوں کی گرم بازاری ہے۔ مگر حکومت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ باضابطہ طریقہ پر اس کو تسلیم کرے بلکہ انجان رہنا مرغوب خاطر ہے۔ یہی کہنے میں فخر سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں

یہ معیوب طریقہ قانوناً ممنوع ہے۔ اس کے خلاف فرانس اور بعض دیگر ممالک میں سرکار کی طرف سے فاحشہ عورتوں پر نگرانی رکھی جاتی ہے اور اس مرض منحوس کے روک تھام کی حتی المقدور کوشش کی جاتی ہے۔ تجرد پسند گروہ میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو زناکاری کے مہذب طریقہ کی طرف مائل ہیں۔ یہ لوگ کسی ایک شریف عورت سے تعلقات پیدا کر لیتے ہیں۔ اگرچہ باقاعدہ نکاح نہیں کرتے لیکن یہ تعلق نکاح کے مساوی ہے۔ ایسی عورت کو اگر داشتہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا۔ فرق صرف یہ ہے کہ داشتہ کو علانیہ طور پر اپنے مکان میں رکھنا معیوب سمجھتے ہیں۔ اگر اس تعلق سے اولاد پیدا ہو جائے تو اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس عورت کی سوسائٹی میں کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ انگریز قوم میں ہم نے یہ بات دیکھی کہ ہر عیب کو رازداری کے ساتھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرانس اور جرمنی میں پردہ داری کا لحاظ کم ہے۔ تیسرا گروہ جس کی تعداد بہت کم ہے شادی کو پسند کرتا ہے لیکن ضبط حمل کا رجحان سب میں عام ہے۔

ایک دلچسپ مقدمہ

حال میں ایک دلچسپ مقدمہ عدالت میں پیش تھا خاوند نے اپنی بیوی کے مقابلہ میں حصول طلاق کے واسطے نالش کر کے حجت برپا کی تھی کہ میری بیوی مختلف ترکیبوں سے استقرار حمل کو روکتی ہے۔ حالانکہ مجھ کو اولاد کی خواہش ہے۔ عورت نے جواب دیا کہ میرے خاوند کی آمدنی اس قدر نہیں ہے کہ اولاد کی پرورش ہو سکے اس لئے میں اپنے عمل میں حق بجانب ہوں۔ عدالت نے عورت کے حق میں فیصلہ صادر کیا۔

حالیہ قانون کی رو سے بلا تخصیص جنس سولہ سال کی عمر شادی کے لئے لازمی قرار دی گئی ہے لیکن بالعموم زیادہ عمر میں شادی کرتے ہیں یہاں ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ دولھا کی عمر اسی سال کے قریب اور دلہن

کی۔ اس کے برعکس بھی دیکھا گیا ہے۔ مثلاً دلہن کی عمر ساٹھ سال کے قریب اور دولھا چوبیس سال کا۔ اخباروں میں اس قسم کی خبریں چھپتی رہتی ہیں معلوم ہوا کہ ایسی باتوں کے لئے کچھ ہندوستان ہی مخصوص نہیں ہے۔

مزدوری

ہندوستان کی نسبت یہاں مزدوری بہت زیادہ ہے چنانچہ گھر میں کام کرنے والی ماما کم سے کم آٹھ روپیہ فی ہفتہ لیتی ہے دکان پر کام کرنے والی عورت پچیس روپیہ فی ہفتہ کما لیتی ہے ہمارے ہاں تیس روپیہ مہینہ پر شوفر آسانی کے ساتھ مل جائے گا۔ لیکن یہاں اس کی بافت ساٹھ روپیہ فی ہفتہ کے قریب ہے اس کے ساتھ یہ بات بھی ضرور ہے کہ اخراجات زندگی یہاں بہت زیادہ ہیں مثلاً ایک درجن انڈوں کی قیمت دو روپیہ پانچ آنے کے قریب ہوتی ہے۔ گوشت بالاوسط دو روپیہ سیر ملتا ہے۔ کپڑوں کی دھلوائی بھی زیادہ پڑتی ہے۔ ایک کالر کے دو آنے اور قمیص کے پانچ آنے ہوتے ہیں۔ یہ معلوم کرکے شاید تعجب ہوگا کہ حکومت کے جلیل القدر عہدہ داروں کی تنخواہ ہندوستان کی نسبت بہت کم ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ تنخواہ دس ہزار پونڈ سالانہ لارڈ چانسلر کی ہے اور وزیر اعظم کی تنخواہ اس کی نصف ہے۔

مکانات

مکانات میں اگرچہ صحن بہت کم ہوتا ہے لیکن حتی المقدور روشنی اور ہوا کا بندوبست رکھتے ہیں۔ آب و ہوا کے لحاظ سے مکان کی تعمیر ہوتی ہے اس لئے ہندوستان کی طرح دالان اور ورانڈے نہیں ہوتے۔ تمام مکان کمروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ عمارت کے اندر ہی بیت الخلا ہوا کرتا ہے۔ لیکن یہ بالکل اس وضع کا ہوتا ہے جیسے ہمارے ہاں ریلوں کے درجۂ اول اور دوم میں ہے۔ بھنگی کی ضرورت نہیں۔ نل کے ذریعہ خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔ اب حیدرآباد میں بھی یہ طریقہ رائج ہونے والا ہے اس انتظام میں

خوبی یہ ہے کہ غلاظت اور بد بو نہیں ہونے پاتی۔ حمام میں حوض بنا ٹب ہوتا ہے
کھڑے ہوکر نہانے کا رواج کم ہے۔ حوض میں حسب ضرورت گرم اور سرد پانی نل کے
ذریعہ آتا رہتا ہے۔ کمرہ کا دروازہ ہمیشہ بند رکھنے کا رواج ہے تاکہ سب کام
تخلیئے میں ہوتے رہیں۔ موسم کی نوعیت کو بھی اس رواج میں بہت کچھ
دخل ہے باہر کی طرف ایک بٹن لگا دیتے ہیں۔ جس کے دبانے سے اندر گھنٹی
بجتی ہے۔ مکان میں رہنے والے دروازہ کی متعدد کنجیاں اپنے پاس رکھتے ہیں۔
تاکہ غیر وقت مکان میں داخل ہونے کے لئے گھنٹی بجاکر دوسروں کو پریشان کرنے
کی نوبت نہ آئے۔ مکان کے اندر بھی کمرے کا دروازہ بند کر کے بیٹھتے ہیں کبھی
کھلا نہیں چھوڑتے۔ کسی کو اندر آنے کی ضرورت ہو تو پہلے دروازے پر کھٹکھٹائیگا
یہ قاعدہ تمام یورپ میں عام ہے ایک کمرہ ملاقات کے لئے مختص ہوتا ہے اور
ایک کھانے کے لئے۔ آرائش حسب ضرورت ہوتی ہے۔

آزادی کا دعوے

اس ملک میں حقوق کی آزادی کا بہت کچھ دعوے
کیا جاتا ہے لیکن غور کرو تو معلوم ہوگا کہ قانون کی
جکڑ بندی نے آزادی کو سلب کرلیا ہے۔ بقول شخصے اگر سانس بھی لو تو قانون
کے مطابق چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے قاعدہ اور قانون موجود ہے۔ کسی کی
مجال نہیں جو خلاف ورزی کر سکے۔ ایک قانون تو حکومت کا بنایا ہوا ہے اور
دوسرا سوسائٹی کا ہے جس کو اٹیکیٹ کہتے ہیں۔ یہاں کی زندگی ان دونوں
قوانین کا ایک مجموعہ ہے۔ ہر قانون اپنی جگہ سخت گیر ہے۔

باندھتے ہیں سرو کو آزاد اور وہ پا بہ گل
کیسی آزادی کہ یاں حال ہے آزاد کا

شام کو چھ بجے قانوناً سب دکانیں بند ہوجاتی ہیں۔ حتیٰ کہ دیاسلائی کی

ڈبہ بھی خرید نہیں سکتے۔ اکثر اوقات اس قانون کی وجہ سے سخت تکلیف کا سامنا ہوتا ہے ایک روز مجھ کو کسی چیز کی فوری ضرورت ہوئی۔ چھ بجنے میں ۵ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ تیز قدمی کے ساتھ اپنے مکان سے بازار گیا۔ ٹھیک ۶ بجے ایک دکان میں داخل ہوا۔ دکاندار سے چیز مانگی اس نے کہا معاف کیجئے چھ بجگئے ہیں۔ میں نے کہا زیادہ دیر نہیں ہوئی اور مجھ کو سخت ضرورت ہے اس نے کہا بالکل ناممکن ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ قانون کی پابندی اس ملک میں سختی کے ساتھ کیجاتی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ایک شخص پر بعد از وقت ڈبل روٹی بیچنے کی علت میں پانچ شلنگ جرمانہ ہوا ہے۔ حالانکہ اس کا عذر یہ تھا کہ ایک بیمار کے لئے روٹی کی سخت ضرورت تھی۔ مجھ کو یہ سنکر بہت تعجب ہوا۔ میں نے دکاندار سے کہا تم لوگ ناحق اپنی آزادی پر فخر کرتے ہو یہ تو ایک طرح کی غلامی ہے لندن کے اخباروں میں اکثر اس نوعیت کے مقدمات چھپتے رہتے ہیں۔ انگریزی مٹھائیوں میں ایک قسم کی مٹھائی ہوتی ہے جو کھانسی کے لئے مفید سمجھی جاتی ہے ایک مٹھائی والے نے چھ بجے کے بعد ایک شخص کو یہ مٹھائی فروخت کی۔ قانون کے مطابق اس پر مقدمہ قائم کیا گیا۔ جواب اس نے یہ پیش کیا کہ خریدنے والا کھانسی کا مریض تھا مٹھائی جو بیچی گئی وہ ایک قسم کی دوا بھی ہے اس لئے جرم عائد نہیں ہوتا۔ اس جواب سے عدالت کی تشفی نہ ہوئی۔ ملزم پر دس شلنگ جرمانہ کیا گیا۔ خالص شراب کی دکانیں رات کو گیارہ بجے بند ہو جاتی ہیں۔ البتہ کھانے کی دکانوں میں کھانے کے ساتھ ساڑھے بارہ بجے تک شراب دی جاسکتی ہے۔ جو ایک بجے تک پی لینی چاہیئے اس کے بعد میز پر کوئی گلاس شراب کا دکھائی دے تو قانون اپنا عمل کرے گا۔ فرانس کے لوگ اس معاملہ میں خوش نصیب ہیں۔ کہ وہاں ایسی پابندیاں نہیں ہوتیں۔ لندن میں ہفتہ کے دن ایک بجے سے تعطیل عام

عام ہوتی ہے اور اتوار کو تمام دن کاروبار بند رہتا ہے گویا ہفتہ میں ڈیڑھ دن تعطیل رہتی ہے۔ اور تمام دکانیں بند ہو جاتی ہیں۔

ایک دفعہ مجھ کو الوفن پلز خریدنے کی ضرورت ہوئی۔ دکاندار نے کہا۔ حضرت اس میں کچلہ شریک ہے۔ ڈاکٹر کی اجازت بغیر یہ دوا فروخت نہیں کر سکتا میں نے کہا تعجب ہے کہ ہندوستان میں ایسی کوئی شرط نہیں ہے۔ میں کئی سال سے برابر اس کو استعمال کرتا ہوں۔ اِس ملک میں ہندوستان سے زیادہ آزادی ہونے کے باوجود یہ قید نامناسب ہے۔ جواب ملا کہ مجبوری ہے۔ اس ملک کا قاعدہ ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ایک پونڈ فیس دے کر ڈاکٹر سے رجوع ہوں۔ اور پھر بھی اس کا اطمینان نہیں کہ وہ میری فرمائش کی دوا لکھے القصہ میں نے بہت اصرار کیا تو اس نے کہا آپ اپنا پتہ نوٹ کروا دیجئے اور جب تک لندن میں قیام ہے تیسرے چوتھے اپنی خیریت کی رپورٹ ہم کو کر دیا کریں اس شرط پر میں دوا دے سکتا ہوں میں نے کہا خیر پتہ نوٹ کر لو۔ اس دوا سے اگر زندہ بچا تو ضرور تم کو اطلاع دوں گا۔ اس نے پتہ نوٹ کر کے دوا دے دی لیکن میں پھر کبھی اس دکان پر تندرستی کی اطلاع دینے نہیں گیا۔

لندن سے روانگی

خدا کا شکر ہے کہ لندن میں دو مہینے خیر و خوبی کے ساتھ گزر گئے خوب سیر کی اور آرام بھی لیا۔ صحت میں روز بروز ترقی رہی۔ کچھ پرانے دوستوں سے ملے اور کچھ نئے دوست پیدا ہو گئے یاد ہوگا کہ سوئز پر جہاز سے اترتے وقت مسٹر اور مسز لشائی اور مسز کروک سے ملاقات ہوئی تھی لندن میں ان سب سے ملنا ہوا۔ بڑے وسیع اخلاق کے لوگ ہیں۔ کئی دفعہ انہوں نے ہماری دعوت کی اور اپنی موٹر میں لندن کی سیر بھی کرائی۔ قومیت کا خیال بھی ان کو کبھی پیدا نہیں ہوا۔ ہندوستان کے حالات بڑے شوق سے

سنتے تھے۔ شریف آدمیوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے اپنے قدیم دوست سراج الحق سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ ہمارے ملک میں ملازم ہیں لیکن تحصیل علم کا شوق ایسا ہے کہ رخصت لے کر بغرض تکمیل تعلیم یہاں آئے ہوئے ہیں۔ محنت اس قدر کرتے ہیں کہ بیان سے باہر۔ ان کی مالکہ مکان کہتی تھی کہ تم اپنے دوست کی خبر لو ایسا نہ ہو کہ اس محنت کا اثر ان کی صحت پر پڑے۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد یہ میرے ساتھ پیرس تک گئے تھے۔ جہاز پر جو ڈاکٹر ہمارے ہم سفر تھے ان سے بھی یہاں ملاقات ہوئی۔ دونوں کسی قدر پریشاں حال تھے۔ کوئی آرام کی جگہ ہمارے سامنے تک ان کو ملی نہیں تھی۔ بار بار اپنا مقام تبدیل کرتے تھے پردیس میں وطن کی ڈاک کا بڑا اشتیاق رہتا ہے۔ لندن میں پیر کے دن ہندوستان کی ڈاک ملتی تھی۔ بال بچوں کی اور دیگر احباب کی خیریت معلوم کرکے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ محب صادق عبدالرشید صاحب (مہتمم تعلیمات ضلع ورنگل) کے خط گلابی اردو میں بڑا مزہ دیتے تھے۔ اکبر سلطان صاحب ورنگل سے ہفتہ وار مقامی اخبارات کا پلندہ بھجوا دیا کرتے تھے جن سے وطن کی خبریں تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جاتی تھیں۔ عبداللطیف صاحب وکیل ہنمکنڈہ اکثر گرمی کی شکایت کرتے۔ لکھا تھا کہ اس سال ورنگل میں اس قدر شدت کی گرمی ہوئی کہ شاید و باید۔ میں ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا۔ اور اپنی غیر موجودگی پر خدا کا شکر کرتا۔ افسوس ہے۔ کہ بعض احباب کو ہمارے مخطوط نہیں پہنچے۔ بعض جگہ ایسا ہوا کہ زبان کی اجنبیت کی وجہ سے خود اسٹامپ نہ خرید سکے۔ ہوٹل کے ملازم کو پیسے دیدیے اور اشارہ سے سمجھایا کہ ٹکٹ خرید کر خط پر لگا کر ڈال دینا۔ خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ وہ خطوط ہندوستان تک نہیں پہنچے۔ مثلاً مولوی ولایت علیخاں صاحب کو شکایت تھی کہ خط نہیں پہنچا اس قسم کے واقعات سفر میں ناگزیر ہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ مسافر اپنے

ہاتھ سے خط ڈالا کرے۔ میرے عزیز دوست شمشاد حسین صاحب (مددگار ناظم کوتوالی) کے ایک بھائی یہاں زیر تعلیم ہیں جذبہ دوستی کو دیکھئے کہ صاحب موصوف نے بذریعہ تار برقی اپنے برادر خورد کو تاکید کی کہ وہ مجھ سے لندن میں ملاقات کریں چنانچہ فدا حسین صاحب ناٹنگھم سے لندن ملنے کے لئے اکثر آتے تھے۔ ایک دفعہ میں بھی ناٹنگھم چلا گیا تھا۔ زمانہ قیام لندن میں مولوی غلام یزدانی صاحب کی ذات سے بڑی تقویت رہی۔ عزیز گرامی نمش کا مشکور ہوں۔ کہ لندن کے متعلق وقتاً فوقتاً میرے معلومات میں اضافہ فرماتے رہتے تھے۔

سپٹمبر کے پہلے ہفتہ میں ہم لندن سے پیرس کو روانہ ہوئے رفیق بیگ میرے ساتھ تھے۔ لیکن سلیم بھائی پندرہ روز قبل ہندوستان روانہ ہوچکے تھے وکٹوریہ اسٹیشن سے پیرس کو ریل جایا کرتی ہے اس کے قبل جولائی کے مہینے میں سراج الحق کے ساتھ میں پیرس جا چکا تھا اس لئے سلسلہ اس وقت سے شروع کرتا ہوں ۲۸ جولائی کو شام کو چار بجے کے قریب وکٹوریہ اسٹیشن سے روانہ ہوئے اور تقریباً ساڑھے گیارہ بجے پیرس کے اسٹیشن گارے نار پر پہنچے۔ خوش قسمتی سے انگلش چینل سکون کی حالت میں تھا ورنہ اکثر اس میں تموج رہتا ہے۔ ڈوورسے کیلے تک اسٹیمر میں وقت اچھا گزرا مسافروں کی کثرت تھی اسباب چاروں طرف منتشر پڑا تھا۔ ہوا کسی قدر تیز اور سرد چل رہی تھی۔ سب سے پہلے پاسپورٹ کی جانچ پڑتال ہوئی۔ اس کے بعد لوگ آرام کرنے کی فکر کرنے لگے۔ اس گڑبڑ میں سراج الحق کی ٹوپی کہیں کھو گئی یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب ہم بندرگاہ پر اتر چکے تھے۔ واپس جاکے ہرچند تلاش کیا۔ مگر نہ ملی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح کھو گئی۔ اسٹیمر سے اُترنے کے بعد کسٹم ہاؤز یعنے محصولخانہ میں سب کو جانا پڑتا ہے یہیں معائنہ اسباب کے بعد ریل کی طرف جا رہا تھا۔ کہ پیچھے سے

سمندر کا کنارہ دوویل فرانس

ایک ملازم محصول خانہ کا تیز رفتاری کے ساتھ آیا اور جیب کی طرف اشارہ کرکے پوچھنے لگا کہ اس میں کیا ہے اس وقت میری جیب میں ہندوستان کے بہت سے خطوط تھے۔ میں نے کہا یہ سب تم لے جاؤ وہ کسی قدر شرمندہ ہوکر واپس ہوگیا۔

اسٹیشن سے ایک ہوٹل گئے جس کا پتہ پہلے سے معلوم تھا۔ یہ ہوٹل محلۂ روسانڈا زار میں واقع ہے۔ اگرچہ نصف کے قریب رات گزر چکی تھی۔ لیکن بازار معمور تھے۔ ٹوپی کھوجانے کا افسوس کرہی رہے تھے کہ ایک دوسرا نقصان اٹھانا پڑا ہوٹل پہنچنے پر موٹر سے اسباب اُتارا۔ مگر میں اپنا ہینڈ بیگ اتارنا بھول گیا وجہ

ایک نقصان اور سرگردانی

یہ ہوئی کہ دو چار آدمی کرایہ کی سواری کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے ہم جیسے ہی اُترے وہ موٹر میں سوار ہو گئے موٹر کچھ دور گئی تھی کہ مجھ کو ہینڈ بیگ کا خیال ہوا۔ ہر چند ہم نے آواز دی اور غل مچایا مگر وہ نہ رُکی ہم کو اس کا نمبر بھی معلوم نہ تھا۔ ہینڈ بیگ میں تین پونڈ کے قریب نقد اور کچھ اشیا، روزانہ ضرورت کی تھیں۔ ہوٹل کی نگراں کار ایک لڑکی تھی۔ جو انگریزی سے واقف نکلی۔ اس نے کہا اب رات زیادہ گزر گئی ہے اور پولیس اسٹیشن بند ہوگیا ہے اس لئے صبح تک کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ کمرے میں اسباب رکھنے کے بعد ہم دونوں خود پولیس اسٹیشن کی تلاش میں نکلے مگر سوائے پریشانی کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ زبان کی مصیبت پھر شروع ہو گئی۔ اول تو کوئی انگریزی داں نہ ملا۔ دوسرے رات بھی زیادہ گزر گئی تھی۔ بالآخر ہوٹل کو واپس ہو گئے رات بھر نیند نہ آئی۔ ایک تو ہینڈ بیگ کا رنج تھا۔ دوسرے یہ کہ کمرہ لب سڑک ہونے کی وجہ سے موٹروں اور ٹریم کا بڑا غل تھا۔ صبح کو ہوٹل والی لڑکی سے مشورہ کیا گیا۔ اس نے کہا کرایہ کی موٹروں کا جو دفتر ہے وہاں جاکر دریافت کرو۔

ممکن ہے کہ کچھ پتہ چلے۔ چنانچہ اس دفتر کا پتہ اس نے کاغذ پر لکھ دیا۔ ہم نے غلطی یہ کی کہ پیدل ہی دفتر کی تلاش میں نکلے بڑی سرگردانی رہی۔ اِدھر اُدھر بہت چکر لگائے مگر وہ مقام نہ ملا۔ بالآخر ایک ٹیکسی میں سوار ہوکر وہاں پہنچے۔ یہ جگہ تو وہی تھی جس کا پتہ ہمارے پاس تھا۔ مگر جس مطلب سے آئے تھے وہ حاصل نہ ہوا کوئی شخص انگریزی سے واقف نہ تھا۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد منیجر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ بھی انگریزی سے کورے نکلے۔ عجیب عجیب ترکیبوں سے اس کو واقعہ سمجھانے کی کوشش کی گئی خدا معلوم وہ کیا سمجھا مگر اس نے ایک کاغذ پر ایک دوسرے دفتر کا پتہ لکھ دیا اور ٹیلیفون پر بھی اس دفتر والوں سے کچھ کہدیا ہم ٹیکسی میں سوار ہوکر اس پتہ پر پہنچے۔ یہ مقام بھی کرایہ کی موٹروں کا دفتر معلوم ہوتا تھا۔ چھٹی دکھانے پر ایک خادم ہم کو ایک صاحب کے پاس لے گیا۔ یہاں بھی اشاروں سے مطلب سمجھانا پڑا اگر جب کام نہ چلا تو ایک صاحب بلائے گئے یہ شدبد انگریزی جانتے تھے۔ لیکن ہمارا مطلب نہ سمجھ سکے اور کہنے لگے تم جو کچھ چاہتے ہو ایک کاغذ پر لکھ دو۔ میں نے تمام واقعہ لکھ کر ان کو دیدیا۔ وہ کاغذ لے کر کسی کے پاس پڑھوانے کے لئے چلے گئے۔ بہت دیر کے بعد واپس آئے۔ اور صرف اتنا کہا کہ ہم پولیس کو اطلاع دیدیں گے اگر چیز مل گئی تو تمھارے ہوٹل کو بھجوادی جائے گی۔ اس جواب سے ہماری کچھ تشفی نہ ہوئی۔ اس لئے ہم خود ہی پولس کے صدر دفتر کو گئے۔ یہ ایک بڑی عالیشان عمارت ہے۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر مارے مارے پھرے مگر ہماری زبان سے واقف کوئی نہ ملا۔ بالآخر کسی نے ایک انگریزی داں عورت کا پتہ بتلایا۔ اس سے ہم نے واقعہ بیان کیا۔ اس نے کہا یہ کام میرے صیغہ سے متعلق نہیں ہے۔ ایک طرف اشارہ کر کے بتلایا کہ عمارت کے اس حصہ میں چلے جاؤ۔ وہاں جانے پر معلوم ہوا کہ گمشدہ مال کی

متعلق یہاں کارروائی ہوتی ہے۔ ایک شخص نے مطبوعہ فارم دیا تاکہ اس کی خانہ پُری کردی جائے۔ یہ فارم فرانسیسی زبان میں تھا۔ اس لئے خانہ پُری میں بڑی دقت معلوم ہوئی۔ جس آدمی نے فارم دیا تھا وہ کچھ الفاظ انگریزی کے جانتا تھا مگر بہت بے رُخی کے ساتھ پیش آیا۔ مطلق ہمدردی کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ ہم مایوس ہوکر واپس ہونے والے تھے کہ ایک غیر متعلق آدمی نے ہماری مدد کی۔ وہ شدبد انگریزی جانتا تھا اس کی ہدایت کے مطابق ہم نے فارم کی تکمیل کردی اور اسی نے اشارہ سے بتلایا کہ فلاں عورت کو یہ فارم دے دو ہم اس عورت کے پاس فارم لے گئے وہاں ایک نوٹس لگا تھا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ انگریزی داں مسافروں کے واسطے یہ صیغہ مخصوص ہے۔ چنانچہ یہ صیغہ جس عورت کی نگرانی میں تھا وہ انگریزی سے واقف تھی اس نے ہمارا پتہ نوٹ کرلیا۔ اور کہا اگر تمہاری چیز مل گئی تو تم کو بھجوادی جائے گی۔ تین چار روز کے انتظار کے بعد جب کوئی اطلاع نہ ملی۔ تو ہم بالکل مایوس ہو گئے۔ چنانچہ ہینڈ بیگ کا کچھ پتہ نہ چلا۔ غنیمت ہوا کہ چیک بک اور پاسپورٹ ہینڈ بیگ میں نہ تھے ورنہ سخت مصیبت کا سامنا ہوتا میری رائے میں یہ دونوں چیزیں ہینڈ بیگ میں نہ رکھنا چاہئے۔ چھوٹی چیز ہونے کی وجہ سے اس کے کھو جانے کا اندیشہ ہر وقت رہتا ہے۔ اگر لندن میں یہ واقعہ ہوتا تو نوے فی صدی ہینڈ بیگ واپس مل جاتا لیکن پیرس انتظام کی خوبی میں لندن کو نہیں پہنچ سکتا۔

پیرس کا ہوٹل

ہوٹل میں اگرچہ انگریزی داں عورت موجود تھی لیکن اس کا موقع ہم کو پسند نہ آیا۔ کثرت ٹرافک کی وجہ سے رات کو نیند نہ آتی تھی۔ اس لئے دوسری ہوٹل میں منتقل ہونے کا ارادہ کرلیا بہت کچھ تلاش کے بعد رومو مارٹ میں ایک ہوٹل پسند آیا۔ اس میں صرف ایک

خرابی تھی۔ کوئی انگریزی جاننے والا نہ تھا۔ لیکن اس کے کمرے شاہ راہ سے فاصلہ پر تھے اور ایک صحن بھی تھا جس میں میز کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بند کمروں سے اگر دم گھبرا جائے تو صحن میں بیٹھ کر تازہ ہوا سے بڑی تفریح ہوتی تھی۔ فی کس تیس فرانک روزانہ قرار پائے جس میں صبح کا ناشتہ بھی شریک تھا۔ چھ فرانک ایک شلنگ کے برابر ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ دو آنے کا ایک فرانک ہوا۔ کمرے میں ساز و سامان نفیس تھا۔ بالخصوص مسہری بہت پُر تکلف تھی فرانس کے ہوٹلوں میں عام طور پر پلنگ بہت اچھا ملتا ہے۔ گرم اور ٹھنڈے پانی کے نل کمرے میں ہی تھے۔ ماسوا اس کے سرہانے ٹیلیفون بھی لگا ہوا تھا۔ تاکہ بوقت ضرورت دفتر سے بات ہو سکے اس ہوٹل کو پسند کر کے اسباب لانے کے واسطے اپنے سابقہ ہوٹل کو گئے اور اپنا بل طلب کیا تو ہوٹل والی کچھ رنجیدہ ہوئی۔ اس نے کہا شاید تم کو کوئی دوسرا ہوٹل اس سے سستا مل گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ رعایت کرنے پر آمادہ ہوں۔ کرایہ کم کر دیتی ہوں۔ مگر ہم دوسرے ہوٹل کو پیشگی رقم دے آئے تھے۔ اور یہ ہوٹل پسند بھی نہ تھا اس لئے رعایت سے مستفید نہ ہوئے اس سلسلہ میں ہم کو یہ پتہ چلا کہ پیرس میں ہوٹلوں کے نرخ حسب موقع کم و زیادہ ہو سکتے ہیں۔ جدید ہوٹل کی مالکہ درمیانی عمر کی عورت تھی اس کا خاوند بھی ہوٹل میں رہتا تھا مگر کاروبار میں دخیل نہ تھا۔ دفتری کام اور ہوٹل کا سب کام میڈم خود کیا کرتی تھی۔ اس کی ایک نوعمر لڑکی مدرسہ میں انگریزی پڑھتی تھی اکثر اس کے ذریعہ سے اپنا مطلب میڈم کو سمجھا دیا کرتے تھے مگر جب یہ نہ ہوتی تو اشاروں پر کام چلتا تھا۔ بعض ہوٹل ایسے بھی دیکھے۔ جہاں انگریزی بولی جاتی تھی۔ مگر کسی نہ کسی وجہ سے پسند نہ آئے۔ البتہ بڑے بڑے ہوٹل جہاں انگریزی سمجھی جاتی ہے آرام کے ہیں۔ مگر ان کا کرایہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ پیرس کے ہوٹل لندن کے

ہوٹلوں کی نسبت سستے اور آرام دہ ہیں۔

لندن کو واپسی پانچ روز قیام کے بعد لندن واپس ہو گیا۔ اگرچہ پیرس میں زیادہ قیام کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن سراج الحق کو کسی ضروری کام کی وجہ سے لندن واپس چلے گئے۔ دوسرے دن تنہائی میں طبیعت گھبرانے لگی اور پیرس جیسا غدار شہر آنکھوں میں سنسان ہو گیا اس لئے بادل ناخواستہ لندن واپس ہو گیا اس دفعہ آبنائے انگلستان تنوج میں تھا راستہ بھی میں نے دوسرا اختیار کیا۔ یعنی بولون سے فوک اسٹون گیا۔ چاروں طرف سے کالی کالی گھٹائیں امنڈ کر آ رہی تھیں۔ خاصا اندھیرا ہو گیا۔ کچھ دیر بارش بھی رہی۔ اس سمندر میں فرانس اور انگلستان کے درمیان جو اسٹیمر چلتے ہیں وہ چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں۔ سمندر کی زبردست لہروں نے ہمارے اسٹیمر کی بری گت بنائی بالکل ایک فٹ بال معلوم ہوتا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے ایک جانب لیٹ گیا یہ معلوم ہوتا رہا کہ اسٹیمر کبھی آسمان پر جاتا ہے اور کبھی نیچے آتا ہے۔ جہاز کے ملازمین مسافروں کو طشت تقسیم کرتے پھرتے تھے۔ چاروں طرف متلی اور قے کا زور تھا اس کیفیت کو دیکھ کر حافظ شیرازی یاد آ گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

شب تاریک بیم موج گرداب چنیں حائل

کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

دوران سر اس قدر سخت ہوا کہ دو روز تک لندن میں طبیعت خراب رہی۔

پیرس پیرس سلطنت فرانس کا دار الخلافہ اور آبادی کے لحاظ سے تمام یورپ میں دوسرے درجہ پر ہے۔ سمندر کے کنارہ سے تقریباً ایک سو اسی میل کے فاصلہ پر دریائے سین کے دونوں طرف آباد ہے شمال و جنوب میں پہاڑوں کا سلسلہ اس کو گھیرے ہوئے ہے۔ دریائے سین کا

قدیم قلعہ کی فصیلوں کو توڑ کر جو بازار قائم کئے گئے ان کو اصطلاح میں بولی وارڈ کہنے لگے مثلاً بولی وارڈ میڈ لین اور بولی وارڈ ایٹلین وغیرہ۔ ان سڑکوں کے بیچ میں ایک روش ہوتی ہے جس کے دونوں طرف سایہ دار درخت ہیں۔ ان بازاروں کے قہوہ خانے بڑے پُر تکلف ہوتے ہیں۔ موسم گرما میں دکانوں کے سامنے سائبان کے نیچے میز کرسیاں بچھا دی جاتی ہیں۔ سینکڑوں آدمی مرد اور عورت ان قہوہ خانوں میں گھنٹوں مصروف بہ تفریح رہتے ہیں۔ لندن کی طرح خاموشی نہیں رہتی۔ لوگ آپس میں خوب باتیں کرتے رہتے ہیں۔ قہوہ خانوں میں بازاری عورتیں خوب بناؤ سنگار کئے ہوئے کثرت سے موجود رہتی ہیں۔ عطر چونکہ سستا ہے اس لئے ہر عورت معطر رہتی ہے بعض دفعہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عطردان کھلا ہوا ہے تقریباً سب عورتیں اپنے ہونٹوں پر سرخی لگاتی ہیں۔ بھوں کے بال اکھیڑ دیتی ہیں اور ایک مہین سیاہ رنگ کی لکیر خوبصورتی کے واسطے کھینچ دی جاتی ہے اس قسم کی اکثر عورتیں جو تنہا قہوہ خانہ میں آتی ہیں مشتبہ روش کی ہوتی ہیں لیکن بناؤ سنگار کا شوق یہاں کی عورتوں میں عام ہے اس لئے اس قسم کی ہر عورت کو بازاری نہ سمجھنا چاہیئے۔

فرانسیسوں کے خصائل و عادات

یہاں کے لوگوں کے عادات، اخلاق، و معاشرت انگلستان سے بہت مختلف ہے۔ حالانکہ ان دونوں ممالک کے درمیان چنداں فاصلہ نہیں ہے چنانچہ ڈوور اور کیلے کے درمیان انگلش چینل صرف اکیس میل چوڑا ہے۔ فرانس کے لوگ بڑے باتونی اور ملنسار ہوتے ہیں۔ مگر نازک مزاجی نے ان کو زود رنج بنا دیا ہے۔ بہت جلد غصہ آجاتا ہے اور اتنی ہی جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ میں میوہ خریدنا چاہتا تھا۔ بازار میں ایک نوجوان عورت میوہ بیچ رہی

تھی۔میں نے دو کیلے خریدے۔ اس کے بعد دو کیلے میں نے اور مانگے۔لیکن غلطی
یہ ہوئی کہ کیلوں کو ہاتھ لگاکر اور ذرا دباکر تبلایا کہ نرم کیلے دینا۔ یہ بات اس کو
بہت ناگوار ہوئی۔اپنی زبان میں وہ بہت کچھ خفا ہوئی۔اور بادل ناخواستہ اس نے
دو کیلے اور دیے۔مگر جب میں نے آرڈر مانگے تو اس نے قطعی انکار کردیا۔ ایک
دفعہ ریلوے اسٹیشن پر ایک ٹکٹ کلکٹر کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا
وہ انگریزی سمجھتا نہ تھا۔ اور میں اس کو اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا
مگر تحمل نہ ہونے کی وجہ سے وہ مشتعل ہوگیا۔یہی کیفیت پولیس کی بھی ہے۔مسافروں
کے ساتھ اکثر لاپروائی کی جاتی ہے۔ان لوگوں میں مصافحہ کرنے کی رسم
بہت عام ہے۔اگر کوئی شخص دن میں کئی دفعہ ملیگا تو ہر دفعہ ہاتھ ملائیگا۔

فرانسیسوں کی غذا

فرانسیسوں کی غذا بھی انگریزوں سے مختلف ہوتی
ہے۔گھونگے۔مینڈک۔گھوڑے اور گدھے کا گوشت
بہت شوق سے کھاتے ہیں لیکن یہ بات ضرور ہے
کہ تخپت و پزکے فن میں ان لوگوں نے کمال حاصل کیا ہے۔ایک ایک چیز کو
مختلف طریقوں پر پکاتے ہیں۔مثلاً صرف انڈے کو دو سو پچاس طریقوں پر
پکا سکتے ہیں۔گھونگے کو کچھ اس طرح تیار کرتے ہیں کہ اندر کا کیڑا زندہ رہتا ہے
اور اسی طرح اس کو کھا لیا جاتا ہے بعض کا خیال ہے کہ گزشتہ زمانہ میں آئے دن
کے افلاس کی وجہ سے ان لوگوں نے سستی چیزیں کھانی شروع کردیں اور اب
تک وہی طریقہ چلا آرہا ہے۔گوشت کو کئی وضع سے پکاتے ہیں۔اقسام اقسام
کے میٹھے تیار کرتے ہیں مگر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے ہم ان کھانوں سے
مستفید نہ ہوسکے۔کھانے کے بعد کافی بغیر دودھ کے اکثر پی لی جاتی ہے چائے
عام طور پر ناقص ہوتی ہے۔سچ تو یہ ہے کہ لندن کے سوائے یورپ میں کہیں

اچھی چائے نہیں ملتی تاوقتیکہ مانگو نہیں کافی کے ساتھ کبھی دودھ نہیں دیتے فرانسیسی میں دودھ والی کافی کو "کیفے دولے" کہتے ہیں۔ اور ایک رواج یہ ہے کہ صبح کو ناشتہ میں انڈے نہیں کھاتے۔ صرف روٹی۔ مکھن اور کافی دیتے ہیں ہم نے خاص طور پر ہوٹل کی میڈم سے کہہ کر ناشتہ میں انڈوں کا انتظام کرایا تھا یہ لوگ کھانا بھی بہت دیر تک کھاتے ہیں۔ چنانچہ دوپہر میں کھانے کے واسطے ملازمین کو عام طور پر دو گھنٹہ کی مہلت ملتی ہے جس کو وہ اسی کام میں صرف کر دیتے ہیں کھانے کے ساتھ انواع واقسام کے میوے کی شرابیں پی جاتی ہیں ہم یا تو چشمے کا پانی پیتے تھے یا تازہ آبشورہ۔

ایک لطیفہ

ایک دفعہ عجیب اتفاق ہوا۔ بازار میں سیر کرتے کرتے پیاس معلوم ہوئی۔ ایک دکان میں لیمونیڈ مانگا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دو پلیٹوں میں ہمارے سامنے آملیٹ رکھ دیا گیا جو انڈے سے تیار کیا جاتا ہے اگرچہ بھوک نہ تھی لیکن مجبوراً کھانا پڑا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ یہاں لیمونیڈ کو سٹروناؤ کہتے ہیں۔ ایک دفعہ کھانے کے بعد کچھ میٹھا کھانے کو دل چاہا۔ فہرست شیرینی کی لمبی چوڑی تھی اس میں ایک نام کسی قدر لمبا اور شاندار تھا۔ رفیق بیگ نے اس پر انگلی رکھ کر لانے کا حکم دیا۔ ہم اس امید میں تھے کہ کوئی اچھی قسم کی پوڈنگ کھانے کو ملیگی۔ لیکن بہت مایوسی ہوئی جب کہ ویٹر دو تشتریوں میں ایک ایک ناشپاتی رکھ کر لے آیا۔

پیرس کی سیر رات کے وقت

پیرس کی اصلی سیر جس کی خاطر دنیا کے ہر حصہ سے ہزاروں سیاح آتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت ہوا کرتی ہے۔

دنیا کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ اکثر بُرے اور معیوب کام رات کے

اندھیرے میں ہوا کرتے ہیں۔ ناچ رنگ۔ تماش بینی۔ عیش پرستی۔ چوری۔ قتل و غارت غرض یہ کہ اس قسم کے سب کام رات ہی کے وقت راس آتے ہیں پیرس کی بھی یہی کیفیت ہے۔ رات کے وقت جس طرف نکل جاؤ گہما گہمی دیکھو گے۔ شہر کیا ہے راجہ اندر کا اکھاڑہ ہے۔ تفریح کے مقامات۔ شراب خانے۔ قہوہ خانے۔ ریسٹوران سب معمور ہیں بازار روشنی سے جگمگ کر رہا ہے۔ خوبصورت۔ بدصورت۔ جوان اور بڈھی ہر قسم کی عورتیں لباس فاخرہ سے آراستہ بناؤ سنگار کئے ہوئے۔ ہر مقام پر اس قدر کثرت سے موجود ہیں۔ کہ ان کو ٹھیس لگائے بغیر راستہ چلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ عورتیں بھی جس جس طریقے سے مردوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں وہ ایک تماشہ ہے قابل دید۔ ان عام مقامات کو چھوڑ کر اگر خاص خاص مکانات کے اندر جاؤ تو گویا طلسم ہوشربا میں آ گئے۔ اجنبی آدمی کی زبان پر بلا تکلف یہ شعر آ جاتا ہے۔

این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

اگر فی الحقیقت شیطان بھی کوئی ہستی موجود فی الخارج ہے تو میرے خیال میں اس نے اپنی حکومت کا مرکز اسی شہر میں قائم کر لیا ہے۔ عیش پرستی کے سب سامان اس کی مرضی کے مطابق یہاں موجود ہیں۔ بڑی چیز جس کے ذریعہ شیطان دنیا میں فساد پھیلاتا ہے عورت ہے۔ پیرس میں بھلا عورت کی کمی کہاں صرف جیب میں روپیہ کی ضرورت ہے اگر تمھاری جیب بھری ہوئی ہے تو وقت واحد میں پچاسوں عورتیں پروانہ وار تمھارے گرد چکر لگائیں گی۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ

ہے عالم میں خوبی ساری پیسے کی

بعض مقامات ایسے ہیں کہ وہاں نصف شب کے بعد پروگرام شروع ہوتا ہے۔ اکثر مسافر پچھلی رات کو ہوٹل واپس آتے ہیں۔ ان کی سہولت کے لئے پیرس کے ہوٹلوں میں ایک خاص انتظام کیا گیا ہے۔ داخلہ کے دروازے پر ایک بٹن لگا رہتا ہے۔ اس کو دبا دینا کافی ہے دروازہ خود بخود کھل جائے گا ترکیب یہ رکھی ہے کہ دروازہ کے قریب ہی ایک حجرے میں ملازم سوتا رہتا ہے جس وقت باہر کا بٹن دباؤ اس حجرے میں گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ ملازم وہیں سے لیٹے لیٹے ایک کھٹکا دبا دیتا ہے جس کی وجہ سے داخلہ کا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ رات کے وقت بڑی بڑی سڑکوں پر بجلی کی روشنی کثرت سے ہوتی ہے۔ شراب خانے۔ قہوہ خانے۔ اور رستوران پچھلی رات تک معمور رہتے ہیں۔ پٹڑیوں پر چلنے والوں کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔

ایک رات کسی بازار میں ایک دلچسپ طریقہ اشتہار کا دیکھنے میں آیا۔ ایک سہ منزلہ دکان تھی۔ تیسری منزل پر بجلی کی روشنی کا ایک گھوڑا الٹے پاؤں تیز رفتاری کے ساتھ ایک جانب سے آتا تھا۔ ایک خاص مقام پہ پہنچنے کے بعد لات مارتا تھا جس سے بجلی کی روشنی میں حرف (سی) بن جاتا۔ لات مار کر گھوڑا واپس ہو جاتا اور کچھ وقفہ سے دوبارہ آتا۔ اس کی دوسری لات پر حرف (ایچ) نمایاں ہو جاتا تھا۔ اسی طریقہ پر گھوڑا متعدد دفعہ آتا جاتا رہا۔ اس کی ہر لات پر ایک حرف نمایاں ہو جاتا۔ یہاں تک کہ لفظ چاکلیٹ روشنی کے حروف میں نمایاں ہو گیا۔ کچھ دیر بعد یہ لفظ غائب ہو جاتا تھا۔ اور پھر وہی کارروائی شروع ہو جاتی تھی۔ دکان کے سامنے ہر وقت ایک جم گھٹ اس تماشہ کو دیکھنے کے لئے لگا رہتا ہے۔

رات کی تفریح کے واسطے بکثرت سامان موجود ہیں اس لحاظ سے یورپ کا

کوئی دوسرا شہر پیرس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ متعدد بڑے اور چھوٹے مہنگے اور سستے انواع واقسام کے تھیٹر، سینما، ناچ گھر اور کیبرے ہیں۔ اگر ان کی فہرست مرتب کی جائے تو سینکڑوں کی تعداد میں ہوگی۔ سنتے ہیں کہ ہر مہینے میں کم سے کم ایک ناچ گھر کا ضرور اضافہ ہو جاتا ہے۔ سیر کرنے کے دو طریقے ہیں یا تو خانگی رہبر یا موٹر کوچ کے ذریعہ۔ میرے خیال میں موٹر کوچ زیادہ محفوظ ہے۔ بڑی بڑی موٹر لاریاں ہوتی ہیں۔ خاص خاص بازاروں میں خاص مقامات پر کھڑی ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ اس کام پر ملازم ہوتے ہیں کہ مسافروں کو جمع کریں۔ ایک دفعہ ہم بازار میں چلے جا رہے تھے۔ کوئی آٹھ بجے کا وقت ہوگا کہ ایک شخص نے راستہ روک کر پوچھا کیا تم پیرس کی رات کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہو۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ اس مقام سے رات کو ساڑھے نو بجے موٹر کوچ روانہ ہوتی ہے اور ڈیڑھ بجے تک مختلف ناچ گھروں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک پروگرام نصف شب کے بعد کا ہے۔ موٹر میں ایک انگریزی داں رہبر بھی رہتا ہے فی شخص نوے فرانک لیتے ہیں جس میں ناچ گھروں کی فیس داخلہ شریک ہے ہم نے پہلی شب کا پروگرام پسند کیا اور دو ٹکٹ خرید لئے۔ قریب کے ایک ریستوران میں کھانا کھا کر ساڑھے نو بجے موٹر میں سوار ہو گئے۔ متعدد موٹریں تھیں کوئی دو سو آدمی کی جماعت ہوگی جس میں زیادہ تر مستورات تھیں۔ ہوا کسی قدر سرد چل رہی تھی۔ اور موٹر کی آدھی چھت کھلی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا اور کوٹ پہن لیا۔ لیکن میرے قریب ایک مسافر سردی سے سکڑنے لگا۔ میں نے پوچھا تم اپنا کوٹ کیوں نہیں لائے۔ اس نے کہا ہوٹل میں بھول آیا ہوں۔ سردی سے تکلیف ہو رہی ہے اس لئے واپس جانا چاہتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ میرے ساتھ میری بیوی اور ایک دوسری لیڈی ہے۔ میں چلا جاؤں تو ان کی سیر خراب ہو جاتی ہے

رفیق بیگ کا کوٹ خالی تھا۔ انھوں نے اس کو دیدیا۔ یہ مسافر برازیل کا رہنے والا تھا۔ اور محض سیر کی خاطر پیرس آیا تھا۔ موٹر سے اُترنے کے بعد اپنی بیوی اور دوسری لیڈی سے ہمارا تعارف کرایا۔ سب سے پہلے جہاں گئے۔ ایک مسجد تھی پہلے تو اس پر تعجب ہوا کہ آخر اسوقت میں یہاں کیا کام ہے۔ لیکن جب اندر گئے تو اور بھی تعجب ہوا مسجد کیا ہے۔ ایک ناچ گھر ہے۔ ع مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے معلوم ہوا کہ مسجد کے متعلق چند مکانات ہیں جن میں حمام قہوہ خانے اور دکانات ہیں۔ اندر کی آرائش مشرقی تہذیب کے مطابق تھی۔ ملازمین بھی مسلمان تھے۔ غالباً مراکش کے باشندے ہوں گے۔ ترکی ٹوپیاں اور لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے تھے بعض کی رنگت سانولی تھی اور بعض کالے تھے۔ قہوہ خانے میں عربی رقص و سرود ہو رہا تھا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے۔ چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں قہوہ پیش ہوا۔ یہاں سے اٹھ کر دوسرے کمروں میں گئے۔ جہاں مشرقی ساخت کی بہت سی چیزیں فروخت کے لئے رکھی ہوئی تھیں۔ دکاندار سب مسلمان تھے میں نے ایک شخص کو السلام علیکم کہہ کر مخاطب کیا۔ اس نے کسی قدر متعجب ہو کر پوچھا "مسلم؟" میں نے کہا "الحمدللہ" اس نے عربی میں گفتگو شروع کی۔ میں نے کہا "لا اتکلم"۔ پھر اس نے پوچھا "ترک" میں نے جواب دیا۔ ہندی" اس کے بعد اس نے دکانداری شروع کر دی اور میری عربی معلومات کا ذخیرہ بھی ختم ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ چیزیں اونے پونے داموں پر ہمارے سر تھوپے لیکن ہم لوگ گول ہو گئے۔ بعض امریکن عورتوں نے کچھ خریدا۔

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ پیرس میں جو سیاح آتا ہے۔ اس کو مالدار سمجھ کر یہاں کے لوگ اسے آسامی بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اکثر چیزوں کی قیمت زیادہ بتاتے ہیں۔ خصوصاً امریکن سیاح سے بہت زیادہ وصول کرتے ہیں۔ ہمارے

ساتھ اسی موٹر میں ایک امریکن لیڈی تھی جس نے مجھ سے یہ پیل تذکرہ کہا کہ ایک دکان میں بال ترشانے کی قیمت اس سے بہت زیادہ لی گئی۔ لیکن ایک فرانسیسی عورت سے اسی کام کے لئے نصف قیمت لی گئی۔

مسجد سے روانہ ہونے کے بعد ایک ناچ گھر میں گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا آدمی گنجایش سے زیادہ تھے کسی قدر تنگی کے ساتھ بنچوں پر بیٹھنا پڑا۔ زیادہ تر گانا ہوتا رہا۔ دو تین مرد تھے اور دو تین عورتیں تھیں۔ یہاں کوئی عورت نیم برہنہ دیکھنے میں نہیں آئی۔ ایک شخص بار بار مذاقیہ گفتگو کرتا تھا۔ جو لوگ فرانسیسی سمجھتے تھے وہ اس کی گفتگو کا لطف اٹھا کر ہنستے رہے۔ مگر ہم کو کچھ بھی لطف نہ آیا۔ ہر مہمان کے سامنے ایک ایک گلاس شمپین کا پیش ہوا۔ پینا یا نہ پینا بالکل اختیاری ہے۔ لیکن خریدنا ضرور پڑتا ہے کیونکہ یہی فیس داخلہ کی سمجھی جاتی ہے۔ ہم نے جو موٹر کا کرایہ دیا تھا اس میں اس کی قیمت شامل تھی۔ یہاں سے فارغ ہوکر ایک بڑے ناچ گھر میں گئے۔ یہ مکان عالیشان اور میز کرسیوں سے خوب آراستہ تھا۔ درمیان میں کچھ جگہ ناچ کے لئے محفوظ تھی۔ یہاں بیسیوں لڑکیاں ناچنے والی کمال دکھا رہی تھیں۔ خصوصیت یہ تھی کہ کمر سے اوپر جسم بالکل برہنہ۔ اور کمر کے نیچے ستر پوشی کا انتظام برائے نام تھا۔ ہزار ہا آدمی مرد اور عورت تماشہ دیکھنے میں مصروف تھے۔ یہاں ہم لوگوں کی ضیافت شمپین کے ایک ایک گلاس سے کی گئی۔ ناچنے والی لڑکیوں کے علاوہ متعدد نوجوان عورتیں موجود تھیں۔ یہ سب اسی فکر میں رہتی ہیں کہ مسافروں کو ہموار کرکے ان سے شراب کے آرڈر لیں اور ان کے ساتھ بیٹھکر مے نوشی کریں۔ بہت سے آدمی ان عورتوں کے ساتھ ناچتے اور تفریح کرتے نظر آئے۔ ناچنے والی لڑکیوں کا لباس اس قدر ہلکا اور مختصر ہوتا ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم نے اپنا شمپین کا گلاس ایک ایک لڑکی کو دیدیا۔ کچھ دیر تماشہ

دیکھنے کے بعد ہماری جماعت یہاں سے روانہ ہوگئی۔ ایک اور ناچ گھر میں گئے وہاں بھی تقریباً یہی کیفیت تھی۔ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے غبارے اور کاغذی تیلیں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔ ایک طرف بینڈ بھی بج رہا تھا۔ رقص و سرود اور مے نوشی کی وجہ سے عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص کی زبان پر یہ شعر موجود ہے۔

دور میں ساغر رہے گردش میں پیمانہ رہے
مے کشوں کے سر پہ یارب پیر میخانہ رہے

اسی قسم کا ایک اور تماشہ دیکھنے کے بعد ہماری سیر ختم ہوگئی اور جس مقام سے چلے تھے وہاں پہنچا دیا گیا۔ یہ طریقہ سیر کا سب سے اچھا ہے اس میں دھوکے اور فریب کا اندیشہ نہیں ہے۔

آخری ناچ گھر کی سیر کرانے کے بعد رہبر نے سیر کرنے والوں کو دو جگہ تقسیم کر دیا۔ بڑا گروہ تو ایسے آدمیوں کا تھا جن کے ساتھ عورتیں تھیں۔ اس گروہ کو موٹر میں سوار کرا کے واپس کر دیا اس کے بعد جو دس بارہ مرد رہ گئے تھے ان سے رہبر نے کہا اب میں تم کو ایسے مقام پر لے جانا چاہتا ہوں۔ جہاں عورتوں کی موجودگی مناسب نہیں۔ چنانچہ ہم اس کے ساتھ ایک ناچ گھر میں گئے۔ یہ مکان مختصر تھا فرش فروش بھی معمولی۔ لیکن جو ہنگامہ یہاں دیکھنے میں آیا اس کی کیفیت دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا فوٹو کھینچنا میرے بس میں نہیں ہے۔

زہے نشاط کہ گر کیجئے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے سریر
مئے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

یہ چھوٹا سا مکان نوجوان اور حسین لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مئے ناب اور

شہر لوزین کا ایک منظر

یورپ کا ایک چڑیا خانہ
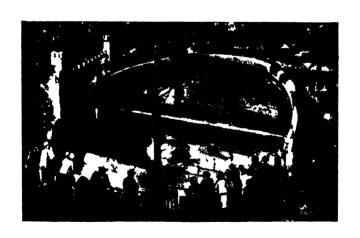
اور گلفام ساقیوں کی کمی نہ تھی۔ کچھ لوگ ناچ رہے تھے کچھ مئے نوشی میں مصروف تھے اور زیادہ تر لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا لطف اٹھا رہے تھے عشق و محبت کے عجیب عجیب اسرار دیکھنے میں آئے بوس و کنار۔ تو خیر ایک معمولی چیز ہے مگر اس سے بھی زیادہ بدتمیزی ہو رہی تھی ہماری جماعت ایک طرف بیٹھ گئی۔ یہاں رہبر صاحب کی بڑی خاطر مدارات ہوئی۔ جام پر جام کمیشن میں اس کو ملتا تھا۔ ظالم کئی گلاس شمپین کے اڑا گیا۔ ایک ستر سال کا بڈھا بھی عیش پرستی میں مصروف تھا۔ باوجود اس سن و سال کے ایسی ایسی طفلانہ حرکت کرتا تھا کہ دیکھ کر ہنسی بھی آتی تھی اور عبرت بھی ہوتی تھی۔ ناچتے وقت اپنے ساتھ والی لڑکی کے ساتھ ایک حرکت ایسی نازیبا کرتا تھا کہ دیکھنے والے بلا تکلف ہنس پڑتے تھے بلکہ بعض لوگ تو اشارہ کرتے تھے کہ پھر وہی حرکت کرو۔ بالآخر وہ لڑکی ناراض ہو کر الگ ہو گئی۔ شاید کوئی نوجوان ساتھی یہ سلوک کرتا تو اس کو ناگوار نہ گذرتا۔ بڈھے کے غمزے اس کو پسند نہ آئے۔ تھوڑی دیر آرام لینے کے بعد بڈھا کسی دوسری لڑکی کو پکڑ لایا اور دیر تک حاضرین کو خوش کرتا رہا۔ عبرت کا مقام ہے کہ جو آدمی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہو اس کو عافیت کا خیال تک نہیں آتا۔ بعض خدا کے بندے ایسے ہیں جو نوجوانی میں سب کچھ کرتے ہیں لیکن آخر عمر میں تائب ہو کر نیک روش اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ بہت غنیمت ہیں مگر بعض عقل کے اندھے ایسے ہیں جن کو مرتے دم تک نیک ہدایت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو ہم نے یہی کہتے سنا کہ

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

اس حد تک تو ہم کو بھی اتفاق ہے کہ "اب تو آرام سے گذرتی ہے" لیکن

عاقبت سے لاعلمی محض جہالت ہے۔ کیونکہ اپنے اعمال خود عاقبت کا پتہ دیرہے ہیں۔ صرف غور کرنے کی ضرورت ہے۔

خانگی رہبر کے ذریعہ سیر

خانگی رہبر کے ساتھ سیر کرنے میں بہت کچھ احتمالات ہیں۔ یہ شخص محض اپنے فائدے کے واسطے بعض دفعہ مخدوش اور ناپسندیدہ مقامات پر لیجاتا ہے اکثر سبز باغ دکھاکر توقع سے زیادہ خرچ کرادیتا ہے

لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ بغیر ایسے آدمی کی مدد کے اجنبی مسافران مقامات پر نہیں جاسکتا۔ ہم کو روزانہ کوئی نہ کوئی رہبر راستہ میں مل جاتا تھا۔ یہ لوگ بڑے لسان ہوتے ہیں اور طرح طرح سے مسافر کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں کسی قدر بے حیا بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ باوجود انکار کے کچھ دور تک برابر لپٹے رہتے ہیں۔ یہ سب لوگ کم حیثیت ہوتے ہیں۔ اکثروں کے پاس ننگی تصاویر کا ذخیرہ ہوتا ہے جن کو وہ بہت رازداری کے ساتھ بتلاکر فروخت کرتے رہتے ہیں دو ایک روز تک ہم ان کو ٹالتے رہے۔ لیکن ایک روز سرشام ایک شخص ملا جو بہت ہی بجیا تھا اس کے میلے کچیلے کپڑے تھے اور یورپ کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اول تو اسنے ہمارے ہاتھ تصویریں بیچنے کی فکر کی۔ مگر جب ہم نے قطعی طور پر انکار کردیا۔ تو اس نے دبی آواز میں کہا۔ میں تم کو پیرس کی ایسی سیر کراؤں گا جو تم نے کبھی نہ دیکھی ہو پہلے تو ہم انکار کرتے رہے مگر کچھ دور تک وہ ساتھ ہولیا اور کچھ ایسی باتیں بنائیں کہ ہم اس کے ساتھ جانے پر راضی ہوگئے ہم نے اس سے کہا پہلے یہ بتاؤ کہ خرچ کیا ہوگا۔ اس نے کہا کہ کچھ بھی نہیں صرف شراب کی قیمت میں سیر کرادوں گا۔ ہم نے تاکید کے ساتھ کئی دفعہ پوچھا کہ اس سے زیادہ خرچ تو نہ ہوگا۔ اس نے کہا "ہرگز نہیں میں ذمہ دار ہوں"

پچیس فرانک سے زیادہ خرچ نہ ہوں گے"۔ ہم دونوں اس کے ساتھ ہو لئے ایسی ایسی گلیوں میں لے گیا۔ جہاں روشنی بھی کافی نہ تھی۔ ہم کو خوف بھی دلواتا تھا کہ ان مقامات پر اگر رہبر ساتھ نہ ہو تو اجنبی آدمی مصیبت میں پڑ جائے۔ بات بات پر یہاں روالور چل جاتے ہیں۔ اور چھریاں بھونک دی جاتی ہیں۔ خدا معلوم سچ کہتا تھا یا غلط مگر اس کی باتوں سے ایک قسم کی تشویش ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی اہمیت کو بڑھانے کے لئے واقعات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتا تھا دو تین مقامات پر لے گیا۔ جو فرش، فرنیچر اور دوسری آرائش سے خوب آراستہ وپیراستہ تھے۔ مکان کی چھت میں اور فرش پر چھوٹے چھوٹے کانچ کے ٹکڑے خوبصورتی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ بجلی کی روشنی کا عکس عجیب شان پیدا کر رہا تھا۔ تمام مکان جگ مگ کر رہا تھا۔ ان مکانوں میں نوجوان عورتیں جو بالکل برہنہ ہوتی ہیں عجیب عجیب کرتب دکھاتی ہیں۔ ان حرکتوں کا ذکر خلاف تہذیب ہے۔ رہبر نے جو اندازہ خرچ کا بتلایا تھا وہ بالکل غلط نکلا۔ دو گنے سے زیادہ خرچ ہو گیا۔ ہر جگہ تکرار کی ضرورت ہوئی۔ ایسے ایسے مقامات پر لے گیا۔ جہاں کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھنا خلاف تہذیب ہو گا۔ انتہا درجہ کی بے حیائی دیکھی گئی۔ اس سیر سے کچھ ایسی نفرت ہوئی کہ رہبر کی مرضی کے خلاف شاہ راہ پر آ گئے۔ اس کے بعد پھر کبھی خانگی رہبر کے ساتھ نہیں گئے البتہ ہوٹل کی میڈم بعض مقامات کی نشاندہی کر دیتی تھی اس کے علاوہ لک کمپنی یا امریکن اکسپرس کے ذریعہ بہت کچھ معلومات حاصل ہو جاتے تھے۔

لیڈو

چند ناچ گھر بہت اچھے ہیں دو ایک مقامات کو دیکھ لینا کافی ہے۔ مثلاً شانزالیزی کی سڑک پر ایک ناچ گھر بہت مشہور ہے اس کو لیڈو کہتے ہیں۔ لب سڑک ایک آدمی یونیفارم پہنے کھڑا رہتا ہے۔

یہ بہت تپاک کے ساتھ مسافروں کا استقبال کرکے دروازے تک پہنچا دیتا ہے۔
اس تاج گھر میں اچھی اچھی دکانیں اور ایک حوض نہانے کا بہت اچھا ہے مگر
یہ مقام کسی قدر مہنگا ہے۔ ایک روز شام کو ہم کسی بازار میں کھڑے سوچتے تھے
کہ کہاں جانا چاہیے۔ ایک مہذب آدمی قریب میں کھڑا تھا۔ یہ انگریزی سے
واقف نکلا۔ اس سے مشورہ لیا۔ تو اس نے لیڈو کا پتہ دیا۔ ہم ٹیکسی میں سوار ہوکر
جانے لگے تو اس نے روک کر کہا۔ تم جاتے تو ہو مگر وہاں کی لڑکیوں سے
ذرا ہوشیار رہنا ایسا نہ ہو کہ کسی کے پھندے میں آجاؤ اور جو کچھ تمھاری جیب
میں وہ ان کی نذر کردو۔ ہم نے کہا تم اطمینان رکھو ہمیں یورپ کا تجربہ کافی ہوچکا
ہے اس میں شبہ نہیں کہ اگر مسافر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھے تو ایسے مقامات
پر سے وہ مفلس ہوکر نکلیگا۔

تھیٹر

بہت سے اچھے تھیٹر ہیں مگر جس کو فرانسیسی زبان نہ آئے
وہ ان کا پورا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ پھر بھی بعض تھیٹر
ایسے ہیں جن کو دیکھنے کے لئے زبان دانی کی چنداں ضرورت نہیں اس
قسم کے تھیٹروں میں سب سے اچھا فوجی برجے ہے جو محلہ رورشیر میں واقع
ہے اس تھیٹر میں لوگ کثرت سے آتے ہیں۔ اس لئے پہلے ہی سے ٹکٹ
خرید رکھنا چاہیے۔ آٹھ دس شلنگ میں معقول جگہ مل جاتی ہے۔ ایک مقام
ایسا ہے جہاں سے لوگ کھڑے ہوکر تماشہ دیکھتے ہیں۔ اس کا ٹکٹ بہت کم
قیمت پر ملتا ہے۔ مگر تکلیف کی جگہ ہے۔ اس مقام کو پرامینار کہتے ہیں۔ انٹرول
کے وقت یہاں بڑی رونق رہتی ہے۔ یہ ایک بڑا ہال ہے۔ جس کے بیچ میں
میز، کرسیاں پڑی رہتی ہیں۔ انٹرول کے وقت رفرشمنٹ کی خاطر یہاں بڑا ہجوم
رہتا ہے ایک جانب شراب کی دکان ہے۔ کچھ دکانیں سگرٹ اور چاکلیٹ

وغیرہ کی ہیں۔ بینڈ نوازی بھی ہو رہی ہے۔ اس پُر رونق مجمع میں چند عورتیں ایسی
بھی ملیں گی جو اپنے زاتی فائدہ کی فکر میں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ جہاں کسی مرد کو
انہوں نے تنہا پایا بلا تکلف اس کے پاس پہنچ گئیں یا تو شراب کی فرمائش
ہوگی۔ یا چاکلیٹ کی۔ کچھ نہیں تو سگریٹ ہی سہی۔ اگر کسی کو اپنی طرف متوجہ
پایا تو فرمائشوں کا سلسلہ ہی قائم ہو جاتا ہے۔ ان سے پیچھا چھڑانے کی ایک
بہت اچھی ترکیب ہم نے نکالی۔ جہاں اس قسم کی عورت ہمارے پاس آئی۔
ہم نے کہدیا کہ ہم عربی یا ترکی زبان جانتے ہیں۔ فرانسیسی یا انگریزی نہیں آتی
یہ جواب سن کر وہ مایوس ہو جاتی تھی دلچسپی کی اور چیزیں بھی یہاں مہیا ہیں
چند قیمتی چیزوں کی دکانیں ہیں اور ہوائی بندوق سے نشانہ بازی بھی ہوتی
رہتی ہے۔ اصل تماشہ کے علاوہ انٹرول میں ایک چھوٹا سا تماشہ کم قیمت پر
ہوتا رہتا ہے۔ اس کا اشتہار بھی دلچسپ چیز ہے۔ ایک جانب بڑے قد کا
مصنوعی حبشی کھڑا ہے۔ جو پہلی نظر میں اصلی انسان معلوم ہوتا ہے اس کے
ہاتھ میں ایک عصا ہے اور بجلی کی قوت سے یہ آگے پیچھے اس طرح ہلتا ہے
جیسے مکتب میں سپارہ پڑھتے وقت بچے ہلتے ہیں۔ لکڑی میں ایک کاغذ
کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ جو تماشہ کا اشتہار ہے۔ یہ تماشہ دیکھنے کے لائق ضرور
ہے کوئی پندرہ منٹ میں ختم ہو جاتا ہے۔ افریقہ کی طرف کی گندمی رنگ
کی عورتیں نیم برہنہ حالت میں عجیب و غریب طریقہ پر باجہ کی آواز کے
ساتھ اپنے پیٹ کو پھڑکاتی ہیں۔ سازندے بھی افریقہ کی طرف کے ہوتے
ہیں۔ اصلی تماشہ جس کی خاطر اس تھیٹر میں آئے ہو دیکھنے کے لائق ہے۔
جہاں تک میرا علم ہے پروگرام ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے میں نے تین دفعہ
یہ تماشہ دیکھا۔ وہی ایک پروگرام تھا۔ تماشہ کی تفصیل لکھنا ایک امر بے سود ہے

کیونکہ زیادہ تر لطف دیکھنے میں ہے۔ تحریر میں وہ بات نہیں پیدا کیجا سکتی۔
عجیب وغریب مناظر پانی کے اندر دکھائے جاتے ہیں۔ سمندر کے نیچے کی
خیالی دنیا کا سین بڑی کاریگری سے تیار کیا گیا ہے۔ برہنہ عورتیں نہایت
خوبی کے ساتھ تیرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک حبشی کے ساتھ پانی کے اندر کشتی
ہوتی رہتی ہے۔ اس تھیٹر میں متعدد عورتیں برہنہ کام کرتی ہیں۔ پیرس میں اس
قسم کے کئی ایک تھیٹر ہیں۔ لیکن فولی برجے سب سے ممتاز تھیٹر ہے ایک
عورت کو دیکھا کہ از سر تا پا برہنہ تھی۔ اس میں ہنر یہ تھا کہ اپنے ایک کولھے
کو باجہ کی آواز کے ساتھ پھڑکاتی تھی۔ ایک چھوٹی سی نقل بھی پروگرام میں
داخل ہے۔ انگریزی داں سیاح اس کا خوب لطف اٹھاتے ہیں۔ اس نقل
میں وہ دشواریاں بتائی جاتی ہیں۔ جو محض انگریزی داں آدمی کو اجنبیت
زبان کی وجہ سے پیرس میں لاحق ہوتی ہیں پہلے تو اسٹیشن پر اترتے ہی قلی سے
مٹ بھیڑ ہوتی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کتنے پیسے دیدیے اسی طرح ٹیکسی
والے ساتھ جھک جھک رہتی ہے پھر رسٹوراں میں عجیب لطف رہتا
ہے اس نقل کے ختم پر دوسرا پہلو بھی دکھایا جاتا ہے یعنی ایک فرانسیسی
صاحب جن کو انگریزی نہیں آتی سیر کے لئے لندن تشریف لے جاتے ہیں
وہاں ان کو اور بھی زیادہ مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ کیونکہ لندن میں لوگ
فرانسیسی زبان سے اتنے بھی واقف نہیں۔ جتنے پیرس کے لوگ انگریزی
سے واقف ہیں۔ الغرض تماشا بحیثیت مجموعی اچھا ہوتا ہے۔ اور بڑی
بات یہ ہے کہ زبان کی اجنبیت لطف کو کرکرا نہیں کرتی۔

زبان کی مشکلات

پیرس جانے سے قبل سنا تھا کہ وہاں انگریزی
عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات کسی قدر

مبالغہ آمیز ثابت ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی داں لوگ مل جاتے ہیں
مگر ہر موقع پر ایسا آدمی ملنا ممکن نہیں۔ عام طور پر دکانوں میں۔ ہوٹلوں میں یا
رسٹوران میں انگریزی نہیں سمجھی جاتی۔ میں دو ایک بڑی دکانوں میں بھی
گیا ہوں۔ کوئی انگریزی داں نہیں ملا۔ کسی کسی رسٹوران میں ایک آدھ شخص
معمولی انگریزی جانتا ہے یہی کیفیت ریلوے اسٹیشنوں کی ہے۔ میرا تجربہ تو
یہ ہے کہ اگر فرانسیسی زبان نہ آئے تو یورپ کا سفر زحمت سے خالی نہیں
پیرس میں کئی دفعہ مجھ کو پریشانی اٹھانی پڑی۔ ایک خاص دشواری فرانسیسی
زبان کی یہ ہے کہ لکھتے کچھ ہیں اور بولتے کچھ ہیں۔ یعنی تلفظ جداگانہ ہوتا ہے
اور اگر صحیح تلفظ ادا نہ کرو تو کوئی بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ مثلاً ایک بڑا اور مشہور اسٹیشن
سانلازار ہے لیکن اس کو سینٹ لیزرس لکھتے ہیں۔ مجھے اس اسٹیشن پر جانے
کی ضرورت تھی۔ ہر چند ٹیکسی والے سے سینٹ لیزرس کہا گیا مگر اس کی سمجھ
میں نہیں آیا۔ بالآخر کاغذ پر لکھ کر بتایا۔ تب اس نے استعجاب کے ساتھ کہا
"سانلازار" اور سیدھا مقام مقصود پر لے گیا۔ جس محلہ میں ہمارا ہوٹل تھا اسکو روموماٹ کہتے ہیں لیکن لکھتے
"روماننٹ مارٹرے" ہیں۔ ایک دفعہ میں راستہ بھول گیا۔ بہت کچھ "روماننٹ
مارٹرے" کہتا لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ آخر کو کاغذ پر لکھ کر بتلایا۔
تو معلوم ہوا کہ رومومارٹ کہنا چاہئے۔ اسی طرح بہت سی باتیں ہیں۔ ایک
لطیفہ لائق تذکرہ یہ ہے کہ مجھ کو منجن کی ضرورت تھی۔ ہوٹل کے قریب ایک
دکان میں گیا۔ ایک عورت کام کر رہی تھی میں نے انگریزی میں منجن کی شیشی
مانگی مگر وہ مطلب نہ سمجھی بالآخر اشارہ سے سمجھایا۔ اس نے ایک ٹیوب
دیدیا۔ میں نے جب اس کو استعمال کیا۔ تو میری انگلی اور ہونٹ سرخ ہوگئے
ہر چند میں نے ان کو رگڑا لیکن سرخی باقی رہی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ

یہ چیز عورتوں کے بناؤ سنگار میں کام آتی ہے۔ دکان ہوٹل کے پہلو میں تھی۔ دکان والی عورت کو میں نے اپنی کیفیت بتلائی۔ وہ بہت محفوظ ہوئی۔ لیکن شیشی واپس لینے سے انکار کیا۔ بالآخر دوسری شیشی خریدنی پڑی۔ اس واقعہ کے بعد جب کبھی میں اس دکان کی طرف سے گزرتا تھا۔ وہ عورت مجھ کو دیکھ کر مسکراتی تھی۔ زبان کی مشکلات کے متعلق ایک پُرلطف واقعہ میرے ایک دوست بیان کرتے تھے۔ سنا ہے کہ جب ہندوستانی فوج جنگ کے سلسلہ میں فرانس میں مقیم تھی تو ایک شخص انڈوں کی تلاش میں نکلا۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ فرانسیسی زبان میں انڈے کو کیا کہتے ہیں۔ باوجود کوشش کے جب وہ اپنے مطلب کو سمجھا نہ سکا تو ایک نئی ترکیب سوجھی یعنی مرغ کی طرح "ککڑوں کوں" بولنے لگا اور ہاتھ سے انڈے کا اشارا بھی کرتا جاتا تھا اگرچہ اپنی اس حرکت سے تھوڑی دیر کے لئے تماشا بن گیا۔ لیکن اپنا مطلب اس نے پورا کر لیا۔ اس کے بعد سنا ہے کہ جب کبھی وہ اس محلہ میں سے نکلتا عورتیں انڈے لیکر اس کے پیچھے پیچھے دوڑتیں اور فرمائش کرتیں کہ پھر اسی طرح مرغ کی بولی بولے۔ میرے ایک دوست نے جو واپسی میں وہیں سے ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ ایک بہت ہی پُرلطف قصہ سنایا۔ کہتے تھے کہ میں پیرس کے ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ رات کو سوتے وقت مجھے دودھ پینے کی عادت ہے۔ میں نے ہوٹل کے ملازم کو سینکڑوں طریقوں سے اپنا منشاء سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ ایک نہ سمجھا۔ آخر مجبور ہو کر اپنے سینے کو دبا کر ایک پیالی میں دودھ نچوڑنے کا اشارہ کیا۔ اس پر وہ بہت ہنسا مگر میرا کام نکل گیا ایک دفعہ یہ دل چاہا کہ موٹر میں بیٹھ کر پیرس کا چکر لگائیں۔ چنانچہ ایک ٹیکسی کو ٹھہرایا۔ اور شوفر کے ہاتھ میں تیس فرنیک رکھ دیے۔ پھر اشارہ سے سمجھایا کہ

پیرس کی سیر کرنا چاہتے ہیں اس لئے چاروں طرف خوب سیر کرائی۔ آدمی ایماندار تھا کیونکہ جب ہم موٹر سے اترنے لگے تو اس نے میٹر دیکھ کر کچھ پیسے واپس کرنا چاہے ہم نے وہی پیسے انعام میں دیدیے ایک دن بڑی دلگی رہی۔ پیرس کے قریب ایک مقام ارمان نامی ہے۔ مجھ کو وہاں جانا تھا۔ اسٹیشن پر کچھ دیر دریافت کرنے کے بعد اس کھڑکی کا پتہ چلا جہاں سے ارمان کو ٹکٹ ملتا ہے۔ مسافروں کی کثرت تھی۔ دستور کے مطابق میں بھی قطار میں کھڑا ہوگیا۔ جب میرا نمبر آیا تو میں نے تیسرے درجہ کا ایک ٹکٹ مانگا۔ ٹکٹ بیچنے والا انگریزی سے ناواقف تھا آخر کار اس کو اشارے سے سمجھایا کہ تیسرے درجہ کا ایک ٹکٹ چاہئے اس نے تین ٹکٹ درجہ اول کے دیدیے۔ میں نے لینے سے انکار کیا۔ وہ بہت جھنجھلایا اس تکرار میں تاخیر ہونے لگی اور پیچھے مسافر بے چین ہونے لگے۔ آخر کو ایک شخص جو کسی قدر انگریزی جانتا تھا آگے بڑھا۔ اس کی امداد سے مطلب سمجھایا گیا۔ درجہ اول کے ٹکٹ بڑے جھگڑے کے بعد واپس ہوئے۔ ریل کے ڈبوں پر "فیومرس" اور "نان پر فیومرس" لکھا ہوا ہوتا ہے۔ پہلے تو میں یہ سمجھتا رہا کہ اس کا منشار زنانہ اور مردانہ ڈبہ ہے۔ مگر کچھ ڈبے ایسے بھی دکھائی دئے۔ جس میں مرد عورت دونوں بیٹھے ہوئے تھے مجھے خیال ہوا کہ شاید انھوں نے ڈبہ کو محفوظ کرلیا ہو میں ایک ایسے ڈبے میں بیٹھ گیا جس پر "نان فیومرس" لکھا ہوا تھا خیال تھا کہ یہ ڈبہ مردانے کے لئے مخصوص ہے مگر جب سگریٹ پینے لگا تو معلوم ہوا کہ "نان فیومرس" کا مطلب یہ ہے اس ڈبہ میں سگریٹ نہیں پی سکتے کیونکہ ایک شخص نے منع کیا اور سمجھایا کہ ممانعت لکھی ہوئی ہے۔ میں دوسرے ڈبہ میں چلا گیا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ سکہ تبدیل کروانے کے لئے گیا۔ متعدد کھڑکیاں تھیں ایک کھڑکی پر اشاروں سے مطلب سمجھایا۔ کارکن لڑکی نے انگریزی سکہ لیکر

ایک برنجی نمبر دیدیا۔ اور اشارہ سے بتادیا کہ آگے چلے جاؤ۔ دو ایک کھڑکیوں پر اس نمبر کو لے کر گیا۔ لیکن ہر جگہ سے واپس ہونا پڑا۔ ایک کھڑکی کے سامنے دیکھا کہ کچھ لوگ روپیہ وصول کر رہے ہیں۔ خیال ہوا کہ یہاں کام نکل آئیگا لیکن کارندہ نے خدا معلوم کیا کہا کہ شاندار پسپائی ہوئی۔ سامنے ایک بینچ پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بحالت پریشانی میں بھی وہیں بیٹھ گیا اور افسوس کر رہا تھا۔ کہ ناحق اس بینک میں آیا۔ روپیہ جو نکہ داخل کر چکا تھا واپس بھی نہیں جاسکتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ بینک کا ملازم اپنی زبان میں کچھ کہتا ہے اور اس کی آواز پر ایک آدمی بینچ پر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور نمبر دے کر رقم لیتا ہے اس وقت سمجھ میں آیا کہ سلسلہ سے نمبر پکارا جاتا ہے اور اس لحاظ سے تقسیم ہوتی ہے یہ معلوم کرکے کچھ اطمینان ضرور ہوا لیکن دوسری فکر یہ لاحق ہوئی کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اب میرا نمبر آیا کیونکہ نمبر بھی فرانسیسی زبان میں پکارا جاتا تھا۔ قریب کے دو ایک آدمیوں سے مدد لینے کی کوشش کی۔ مگر وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے آخر کو میں نے سوچا کہ جب بینک والا نمبر پکارے اور حاضرین میں سے کوئی نہ جائے تو سمجھو کہ اپنی باری آئی۔ یہ خیال صحیح نکلا۔ بینک والے کی دو تین آوازوں پر جب کوئی نہ اٹھا تو میں اپنا نمبر لے کر گیا۔ اس نے فوراً رقم دے دی۔

پیرس میں کئی ایک بڑے اسٹیشن ہیں لیکن ایک اسٹیشن گارے سانلازار خاص طور پر لائق تذکرہ ہے۔ اعداد شماری کے ذریعہ اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا میں کوئی ریلوے اسٹیشن مسافروں کی کثرت کے لحاظ سے اس کی برابری نہیں کرتا۔ معلوم ہوا ہے کہ روزانہ اوسط مسافروں کا اس اسٹیشن پر ڈھائی لاکھ کے

قریب ہے اور چوبیس گھنٹہ کے اندر بارہ سو ٹرینیں آتی جاتی ہیں۔ پہلی دفعہ ہم اسٹیشن پر گئے تو مسافروں کا ہجوم دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ حدود اسٹیشن میں بڑی بڑی اور نفیس دکانیں بھی ہیں۔ محض سیر کی خاطر اسٹیشن پر چلے جاؤ تو ہرگز وقت ضایع نہ ہوگا۔

پیرس کی سواریاں

پیرس کی سیر کے لئے ٹیکسی بہت اچھی چیز ہے۔ کرایہ لندن کی نسبت بہت کم ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نصف شب کے بعد کرایہ دوگنا ہوجاتا ہے۔ زمین کے نیچے ریل بھی کارآمد ہے۔ مگر اجنبی آدمی کو اس سواری میں چند در چند مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ٹکٹ خریدنا اور یہ معلوم کرنا کہ کس پلیٹ فارم سے اور کون سی ریل جائے گی خالی از دقت نہیں ہے۔ چنانچہ مجھ کو کئی دفعہ غلط فہمی ہوئی اور غلط ریل میں سوار ہوگیا۔ اس میں وقت ضایع ہوجاتا ہے اور پریشانی الگ رہتی ہے۔ لیکن سستی سواری ہے۔ مقامی لوگ اس سواری سے بہت مستفید ہوتے ہیں لندن اور برلن کے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن صاف ستھرے اور ریلیں آرام دہ ہیں۔ پیرس میں نہ تو اتنی صفائی ہے اور نہ کمپارٹمنٹ اچھے ہیں گنجایش بھی کم ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے زیادہ تر مسافر کھڑے ہی رہتے ہیں۔

ایک اور ذریعہ سواری کا موٹر بس ہے مگر اس میں بھی وہ سہولت نہیں ہے جو لندن میں پائی جاتی ہے۔ صرف ایک منزل کی گاڑی ہوتی ہے۔ اور مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جگہ کا ملنا دشوار ہوجاتا ہے۔ جابجا موٹر بس ٹھہرنے کے واسطے اسٹیشن بنے ہوئے ہیں ایک خاص انتظام جو دوسرے شہروں میں دیکھا نہیں گیا۔ یہ ہے کہ ہر اسٹیشن پر ایک مشین لگی ہوئی ہے۔ کھٹکا دبانے سے ایک

ٹکٹ نکل آتا ہے۔ اس ٹکٹ پر سوائے نمبر کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جو لوگ موٹر بس کے انتظار میں جمع ہوتے ہیں۔ وہ اس مشین میں سے ایک ایک ٹکٹ نکال لیتے ہیں موٹر والا ان ٹکٹوں کو دیکھ کر سلسلہ وار مسافروں کو اندر آنے کی اجازت دیتا ہے نمبروں کی ترتیب کے خلاف کوئی مسافر سوار نہیں ہوسکتا۔ موٹر بسوں کی تعداد بھی لندن اور برلن کی نسبت کم معلوم ہوتی ہے۔

ٹرافک کا انتظام مختلف طریقوں پر ہے۔ کسی چوراستے پر برلن کی طرح لیکن کسی قدر مختلف شکل کی قندیلیں لگی ہوئی ہیں۔ کہیں صرف پولیس کا جوان کھڑا رہتا ہے۔ بعض سڑکوں پر یہ دیکھا گیا کہ گھنٹی بجتی ہے۔ گھنٹی کا انتظام کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا۔ اجنبی آدمی کو اکثر غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس گھنٹی کے پھیر میں ایک دفعہ پر لطف واقعہ پیش آیا۔ ایک روز رات کے وقت میں ایک چوراہے پر تھا۔ راستہ چلنے والوں کی کثرت تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے گھنٹی بجتی جاتی تھی۔ میں مقابل کی روش پر جانے کی فکر میں بہت دیر سے کھڑا تھا۔ گھنٹی کا حساب کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ایک گھنٹی کی آواز پر میں اللہ کا نام لیکر چل کھڑا ہوا۔ بیچ سڑک پر پہنچا تو پولیس کانسٹبل نے آواز دے کر روکا ایک طرف سے ایک موٹر تیز رفتاری کے ساتھ چلی آرہی تھی ایسے موقع پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی پس و پیش میں پڑ جاتا ہے کبھی تو آگے جاتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹتا ہے یہی کیفیت میری بھی ہوئی۔ سامنے سے تین عورتیں آرہی تھیں دو تو آگے نکل گئیں۔ لیکن ایک عورت بالکل میرے سامنے آگئی۔ موٹر کے خوف سے یہ بھی کچھ پریشان تھی۔ نہ معلوم کیوں اور کس طرح مگر ہم دونوں چشم زدن میں بغلگیر ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مدت دراز کے بعد دو بچھڑے ہوئے دوست بغل گیر ہو رہے ہیں

یا بے تکلف احباب عیدمل رہے ہیں۔ایک دوسرے کو زمین پر سے اٹھا لینے کی کوشش کر رہے تھے جس موٹر کا خوف تھا وہ تو میلوں آگے نکل گئی ہوگی۔لیکن ہم دونوں بیچ سڑک پر کھڑے ہوئے یہ عجیب و غریب تماشہ کر رہے تھے بعض راستہ چلنے والوں کو شبہ ہوا کہ شاید ہم دونوں میں کچھ جھگڑا ہو رہا ہے۔وہ بیچ بچاؤ کرنے کے لئے آگئے۔اس وقت ہم کو ہوش آیا۔اور جس طرح خود بخود بغلگیر ہوگئے تھے اسی طرح بلا کسی قوت ارادی کے الگ بھی ہوگئے۔دونوں پر ندامت ایسی غالب تھی کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھے بغیر بلا کسی گفت و شنید کے اپنے اپنے راستہ پر ہو لئے۔اور بات چیت اگر ہوتی بھی تو کیا خاک ہوتی۔نہ وہ بچاری میری کچھ سمجھتی اور نہ میں اس کی کچھ سمجھتا۔یہاں کی عورتیں ہر وقت معطر رہتی ہیں اس لئے دو روز تک میرے کپڑوں میں سے عطر کی خوشبو آتی رہی

پیرس کی چند باتیں جو ہم کو ناپسند آئیں ان کے منجملہ یہ بھی ہے کہ سگریٹ خریدنے کے واسطے اکثر شراب خانوں میں جانا پڑتا ہے۔ڈاک کے ٹکٹ بھی ان ہی دکانوں میں ملتے ہیں۔اور اکثر لیٹر بکس بھی ان ہی دکانوں میں ہوتا ہے بازاروں میں نمایاں طور پر لیٹر بکس دیکھنے میں نہیں آئے۔سگریٹ عام طور پر اچھے نہیں ہوتے۔امریکن اور انگلش سگریٹ بکثرت ملتے ہیں لیکن بہت مہنگے۔یعنی تقریباً سوا روپے کے بیس گولڈ فلیک سگریٹ۔شہر کے اندر عجلت کے ساتھ ڈاک تقسیم کرنے کا ایک انتظام بہت اچھا ہے۔یعنی برلن کی طرح یہاں بھی زمین کے نیچے نل لگے ہوئے ہیں۔اس میں ڈاک ڈالکر ہوا کے ذریعہ ڈھکیل دی جاتی ہے اور دو گھنٹے کے اندر شہر میں تقسیم ہو جاتی ہے لیکن ٹکٹ فی خط ڈھائی آنہ کا لگانا پڑتا ہے۔

پیرس سے دوویل کا سفر

پیرس میں تین چار روز قیام کے بعد ایک خاص ضرورت سے رفیق بیگ کو برلن جانا پڑا۔ میں چونکہ تنہا پیرس میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے دوویل چلا گیا۔ یہ مقام سمندر کے کنارے آج کل بہت مقبول ہے۔ کثرت سے مسافر تفریح کے لئے جایا کرتے ہیں۔ ہوٹل کی میڈم کو ہر چند یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم دونوں آدمی تین روز کے لئے باہر جا رہے ہیں۔ ہمارا اسباب ہوٹل ہی میں رہیگا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ ہم کمروں میں اسباب مقفل کر کے چلے گئے پیرس سے دوویل تقریباً سات گھنٹے کا سفر ہے۔ کمپارٹمنٹ میں چھ مسافر اور تھے عین میرے مقابل ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے ہوئے تھے دونوں نوجوان تھے۔ مرد کی کیفیت عجیب تھی جب تک بیٹھا رہا عورت کو لپٹائے رہا۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بوس وکنار بھی کرتا تھا۔ دو کنواری لڑکیاں بھی اس کمپارٹمنٹ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ کبھی کبھی اس منظر کو دیکھ کر شرمندگی کے ساتھ نگاہ نیچی کر لیتی تھیں عورت اگرچہ نوجوان تھی لیکن صورت شکل معمولی۔ باوجود اس کے عاشق کی قدردانی تعریف کے لائق ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید۔ دوویل کے قریب کسی اسٹیشن پر یہ دونوں عاشق و معشوق اتر گئے اس ملک میں بوس و کنار ایک معمولی چیز ہے کچھ عرصہ قبل فرانس کے کسی شہر میں ایک شخص نے ایک نوجوان لڑکی کا پیار اس کی مرضی کے خلاف لے لیا تھا۔ لڑکی نے عدالت میں استغاثہ دائر کیا۔ عاشق مزاج ملزم نے جواب دیا کہ محض حسن کی قدردانی سے بوسہ لیا گیا نیت بری نہ تھی۔ عدالت نے تصفیہ کیا۔ کہ اس نیت سے اگر پیار لیا جائے تو کوئی جرم نہیں ہے۔ شاید حاکم عدالت کا یہ اعتقاد ہو کہ حسن پرستی بھی مقتضائے بشریت ہے۔ لہذا کوئی شخص اس جذبے سے متاثر ہو کر کسی عورت کا بوسہ

لے لے تو اس کا یہ فعل عین قانون فطرت کے مطابق ہوگا۔ ایسی صورت میں مواخذہ کرنا گویا انصاف کا خون کرنا ہے۔ ہندوستان کے مشہور شاعر اکبر نے اس مضمون کو بہت خوبی کے ساتھ یوں ادا کیا ہے۔

تہذیب مغربی میں ہے بوسہ تلک روا
اس سے اگر بڑھے تو شرارت کی بات ہے

شکر کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں قانون کی کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ حسن پرستی تقاضائے فطرت انسانی نہیں ہے بلکہ یہ ایک کیفیت انفرادی ہے جو زیادہ تر بری صحبت میں رہنے سے ترقی کر جاتی ہے لیکن صحبت صالح اس میں کمی کر دیتی ہے۔ فرانس کی عدالت کا یہ تصفیہ تعجب کی نظر سے دیکھنے کے لائق ضرور ہے مانا کہ انصاف کا معیار بھی ہر ملک میں جداگانہ ہوتا ہے۔ اور قانون سازی کے وقت اس ملک کے رواج اور معاشرت پر نظر رکھنا ازبس ضروری ہے تاہم کوئی قانون ایسا نہ ہونا چاہئے جو بالکل مضحکہ خیز ہو اور جس کی وجہ سے امن عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ فیصلہ مذکورالصدر عدالت ابتدائی نے صادر کیا تھا۔ غلب ہے کہ عدالت اپیل نے اس کو منسوخ کیا ہوگا۔ ورنہ شریف اور باعصمت عورتوں کو راستہ چلنا دشوار ہو جاتا۔

راستہ میں تین مسافر دوسرے آئے۔ دو عورتیں اور ایک مرد۔ مرد کی عمر کوئی ستر سال کے قریب ہوگی۔ ایک عورت جو اس کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ عمر رسیدہ اور بہت موٹی تھی۔ دوسری عورت نوجوان تھی۔ اس کے طریقہ سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی خادمہ ہے۔ کیونکہ ضرورت سے زائد ادب اور لحاظ کرتی تھی۔ بڈھا میرے عین مقابل بیٹھا۔ جب دو ویل قریب آیا تو اس نے

سلسلہ گفتگو شروع کیا۔ مگر انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اشاروں میں ہی گفتگو ہوتی رہی
دریافت کرتا تھا کہ تم وہ وہیں جا کر ہوٹل میں ٹھہرو گے یا کسی اور جگہ۔ جب اس کو معلوم
ہوا کہ میں اجنبی ہوں اور کسی ہوٹل میں قیام کروں گا تو اس نے کہا اسٹیشن سے تم
میرے ساتھ چلو۔ میرا خیال ہوا کہ یہ شخص بھی مسافر ہے اور خود بھی کسی ہوٹل میں ٹھہرے گا
مجھ کو بھی اپنے ساتھ ٹھہرانا چاہتا ہے۔ ریل سے اتر کر اس نے کہا میرے پیچھے
پیچھے چلے آؤ۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک رسٹوران میں لے گیا۔ اور کہا کہ یہاں
کھانا کھالو۔ اس کے بعد ہوٹل والے کو کچھ سمجھا کر چلا گیا۔ کھانے کے بعد میں نے
ہوٹل والے سے پوچھا کہ تمہارے پاس ٹھہرنے کا کوئی بندوبست ہے یا نہیں اس
نے کہا کہ بڈھا ہدایت دے گیا ہے کہ کھانے کے بعد تم کو اس کے پاس پہنچا دیا
جائے۔ چنانچہ وہ مجھ کو ہوٹل کے پیچھے ایک گلی میں لے گیا۔ گلی تنگ اور رات
اندھیری تھی۔ مقام بھی غلیظ تھا۔ دل نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ جاؤں
لیکن دوسری جگہ بھی معلوم نہ تھی اس لئے با دل ناخواستہ اس کے ساتھ ہو گیا
ایک مکان میں گئے جو کسی قدر غلیظ تھا۔ دالان میں بڈھا اپنی بیوی کے ساتھ
کھانا کھا رہا تھا۔ اور وہیں خادمہ کام کر رہی تھی۔ بڈھے کی ہدایت پر خادمہ مجھ کو
ایک کمرے میں لے گئی جس میں ایک مسہری تھی اور منہ ہاتھ دھونے کا سامان
تھا معلوم ہوا کہ میرے قیام کے واسطے یہ کمرہ تجویز کیا گیا ہے۔ اگرچہ جگہ اچھی
نہیں تھی اور ہوٹل بھی غیر معتبر معلوم ہوتا تھا مگر شب زیادہ ہو جانے کی وجہ سے
میں نے قیام کا ارادہ کر لیا۔ دروازہ کو اندر سے مقفل کر کے سونے کے واسطے
لیٹ گیا لیکن نیند نہ آئی۔ مختلف خیالات دل میں آتے رہے علی الصباح
زینہ سے اترتے وقت پہلو سے آواز آئی۔ "یان ژور مان سیور" یعنی صبح کا سلام
مڑ کر دیکھا تو صاحب خانہ بڈھا اپنے کمرے میں پلنگ پر پڑا ہوا ہے اور کھڑکی

سوئٹزرلینڈ کا پہاڑی جھولا

کھلی ہوئی ہے مجھ سے پوچھا کہاں جاتے ہو۔ میں نے کہا پیچھے جا رہا ہوں نیچے
خادمہ ملی۔ اس سے میں نے پوچھا کہ بیت الخلا کہاں ہے۔ اس نے اشارہ سے
پھاٹک کی طرف ایک جگہ بتائی یہ ایک چھوٹا سا حجرہ تھا اس میں ایک آدمی
بمشکل کھڑا ہو سکتا تھا۔ کموڈ بھی خراب و خستہ حالت میں نظر آیا۔ اندر ٹھہرنا مشکل
ہو گیا۔ دو منٹ کے بعد ہی میں باہر نکل آیا۔ اور کسی دوسرے ہوٹل کی تلاش
میں نکلا۔ معلوم ہوا کہ اچھے اچھے اور سستے ہوٹل متعدد ہیں ایک ہوٹل پسند کر کے
اپنی جگہ واپس آ گیا۔ اور بڈھے کو اطلاع دیدی کہ دوسری ہوٹل میں جا رہا ہوں
شب باشی کے متعلق اس نے میں فرانک لئے جو تین شلنگ سے کچھ اوپر
ہوئے اپنی حماقت پر کئی روز تک افسوس ہوتا رہا۔ غیر ملک میں اجنبی آدمی
کے ساتھ اس طرح رات کے وقت چلا جانا بڑی غلطی تھی۔ ایسے موقع پر احتیاط
رکھنا ضرور ہے۔ دوسرا ہوٹل اچھا اور آرام دہ تھا۔ اسی میں کھانے پینے کا
بھی بندوبست تھا۔ کھانا اچھا اور سستا تھا۔ اس روز بارش کی وجہ سے بڑی
بے لطفی رہی۔ سارے دن ساری رات بارش ہوتی رہی۔ زیادہ سیر نہ ہو سکی۔
دوسرے دن صبح کو ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر میں ہوٹل کے سامنے ایک
مقام پر کھڑا ہوا تھا۔ ایک شخص آیا اور اپنی زبان میں کچھ کہنے لگا مطلب سمجھ
میں نہ آیا۔ اس نے اشارہ کھانے کا کیا۔ خیال ہوا کہ یہ کوئی بھوکا آدمی ہے
اور کھانے کو کچھ مانگتا ہے میں نے اس کو کچھ پیسے دینا چاہے مگر وہ زیادہ
مانگنے لگا۔ میں نے انکار کیا۔ اس نے اصرار کیا۔ بالآخر اس نے ہاتھ سے ایک
طرف اشارہ کیا کہ وہاں تک میرے ساتھ چلو۔ چنانچہ وہ مجھ کو اس رسٹوران
میں لے گیا۔ جہاں پہلی رات کھانا کھایا تھا۔ وہاں جانے کے بعد یہ پتہ چلا کہ کہا
رات کھانے کی قیمت میں نے ادا نہیں کی تھی۔ اور یہ شخص رسٹوران کا ملازم ہے

کھانے کی قیمت مانگ رہا ہے بڑی شرمندگی ہوئی۔ جتنے پیسے وہ مانگتا تھا دیدیے
مجھ کو اس ملک کی زبان آتی تو یہ بدنما واقعہ پیش نہ آتا۔ خدا معلوم مالک ریسٹوران
نے اپنے دل میں کیا خیال کیا ہوگا۔ وہ اس واقعہ کو نیک نیتی کی طرف بھی محمول کرسکتا
ہے اور بدنیتی کی طرف بھی۔ ان ممالک میں ہماری حالت جانوروں سے کچھ کم نہ تھی۔
شیخ سعدی کو سنو اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ ؎

زباں در دہانِ خردمند چیست
کلیدِ درِ گنجِ صاحب ہنر
چو در بستہ باشد چہ داند کسے
کہ جوہر فروش است یا پیلہ ور

دوویل میں تین روز قیام رہا موسم اچھا نہیں تھا یا تو ابر رہتا تھا یا بارش
رہتی تھی۔ اس لئے جیسی چاہئے ویسی سیر نہ ہوسکی۔ مقام بہت خوبصورت اور سمندر
کا کنارہ نہایت دلچسپ ہے۔ کچھ آبادی پہاڑ پر بھی ہے۔ قدرتی منظر بہت دلاویز
ہے دوپہر کا کھانا کھاکر میں پیرس روانہ ہوگیا۔

سرمغرب سانلازار اسٹیشن پر ریل پہنچی۔ ہمارے کمپارٹمنٹ میں ایک عورت
تھی جس کے ساتھ ایک شیرخوار بچہ بھی تھا اور ایک کمسن لڑکا تھا جو اس کا بھائی
معلوم ہوتا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں اوپر کی طرف ایک تختہ سامان رکھنے کا تھا۔ اس پر
اس عورت کا ایک پورٹ منٹو تھا اترتے وقت گود میں بچے کو لیکر دوسرے ہاتھ سے
پورٹ منٹو اتارنے کی کوشش کرنے لگی مگر چیز تھی وزنی۔ اس لئے وہ اپنی کوشش میں
کامیاب نہ ہوئی۔ امداد کی غرض سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے پورٹ مینوٹو
اتار کر نیچے رکھ دیا۔ اس نے اشارہ کیا کہ اس کو پلیٹ فارم پر اتار دو۔ میں نے اس
تھیلے کو ریل سے اتار کر پلیٹ فارم پر رکھ دیا۔ عورت نے چاہا کہ اسے اٹھا کر لیجائے

لیکن بچہ گود میں ہونے کی وجہ سے یہ کام اس کو مشکل معلوم ہوا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ آخر کار یہ فرض میں نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اور پورٹ نیٹو ایک دروازے تک لے گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ہم کو دوسرے دروازے پر جانا چاہیئے جو کسی قدر فاصلہ پر تھا۔ میں نے ایک قلی کو بلایا۔ اور اس کو کچھ پیسے دیکر کہا کہ یہ تھیلا اس عورت کے ساتھ باہر لے جاؤ۔ کمسن لڑکے کے ہاتھ میں جو اس عورت کے ساتھ تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے بکس تھے۔ میرا ہاتھ جب خالی ہوا تو اس لڑکے نے ایک بکس مجھ کو دیدیا۔ گیٹ کے باہر پہنچے تو عورت نے جلدی سے بکس میرے ہاتھ سے لے لیا۔ قریب ہی میں اس کا خاوند انتظار میں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ چلی گئی۔ تعجب ہے کہ یہ شخص اپنی بیوی کو لینے کے واسطے پلیٹ فارم پر نہ آیا۔ اسٹیشن سے سیدھا اپنے ہوٹل کو گیا۔ رفیق بیگ بھی اس وقت برلن سے واپس آچکے تھے معلوم ہوا کہ ہوٹل کی میڈم ہمارے غائب ہوجانے پر بہت پریشان رہی۔ بعد کو ایک انگریز عورت کے ذریعہ جو فرانسیسی زبان جانتی تھی۔ میڈم کو واقعات سمجھا دیئے۔ میڈم نے کہا کہ اگر تم دونوں آج نہ آتے تو میں ضرور پولیس میں اطلاع دیتی کہ دو مسافر کمرہ بند کر کے غائب ہوگئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سیر و تفریح کے لئے پیرس ایک عجیب و غریب مقام ہے لیکن اجنبی مسافر کو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ قدم قدم پر موجبات ترغیب موجود ہیں سینکڑوں دولت مند سیاح یہاں آکر مفلس ہوجاتے ہیں۔ جذبات پر قابو رکھنا بھی کیرکٹر کی ایک اعلیٰ صفت ہے۔ کچھ عرصہ قبل اسی پیرس میں ایک دکان کا ملازم جس کی راست بازی پر مالکوں کو اعتماد تھا ایک بڑی رقم بینک میں داخل کرنے کے واسطے لے جا رہا تھا۔ دفعتاً معلوم

نہیں کیا خیال آیا کہ رقم لے کر تین روز تک غائب ہو گیا۔ پولیس نے اس بدبخت کو کسی ناچ گھر میں گرفتار کیا۔ رقم کا بہت بڑا حصہ اس وقت تک برباد ہو چکا تھا جب مقدمہ پیش ہوا تو عدالت میں ملزم نے یہ بیان دیا کہ ایک عرصہ سے میں عیش و عشرت کے سامان چاروں طرف دیکھتا چلا آرہا ہوں۔ کئی دفعہ جذبات نے مجھ کو اُبھارا لیکن میں ہمیشہ ان کو دباتا رہا۔ بالآخر کمزوری غالب آئی۔ جیب میں ضرورت سے زاید رقم موجود تھی۔ دل نے کہا اگر دیکھنا چاہتے ہو کہ عیش و عشرت کیا چیز ہے اور اس قسم کی زندگی میں کیا مزہ ہے تو ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ جو کچھ مزے لوٹنے ہوں ایک ہی دفعہ لوٹ لو۔ آئندہ ہرچہ باداباد۔ ایک ولولہ شیطانی تھا جو میرے ضمیر پر غالب آگیا۔ اب دل میں کوئی ہوس باقی نہیں رہی۔ اس مضمون کو نظیر اکبر آبادی نے خوب باندھا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

دیکھ ٹک غافل چمن کی گلفشانی پھر کہاں — یہ بہار عیش یہ شورِ جوانی پھر کہاں
ساقی و مطرب شراب ارغوانی پھر کہاں — عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں
شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

اب جو آغاز جوانی کی بہاریں ہیں میاں — عیش و عشرت میں اڑا لے زندگی کی خوبیاں
نشہ پیکر کوئی دم کرلے تو سیر بوستاں — واعظ و ناصح بکیں تم ان کے کہنے کو نہ مان
دم غنیمت ہے میاں یہ نوجوانی پھر کہاں

پیرس کی عمارتیں

پیرس میں متعدد عمارتیں اور مقامات دیکھنے کے لائق ہیں جن میں سے چند خاص عمارتوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آرچ ڈی ٹرمنیف۔ یہ عالیشان کمان ایک وسیع چبوترے پر شہر کے ممتاز حصہ میں واقع ہے

سنہ ۱۸۰۶ء میں نپولین نے اپنی فتوحات کی یادگار میں اس کی بنیاد رکھی۔ کہا جاتا ہے کہ تین لاکھ باسٹھ ہزار پونڈ اس پہ صرف ہوئے۔ عمارت متعدد خوبصورت مورتوں سے آراستہ ہے اوپر سے پیرس کے اطراف واکناف کا منظر بہت عالیشان ہے اسی کمان کے نیچے جنگ عظیم کی یادگار میں غیر معلوم سپاہی کی قبر بھی بنی ہوئی ہے۔

نوتردام۔ یہ ایک فرانسیسی لفظ ہے جس کے معنی (ہماری مریم) ہے اس نام کا ایک گرجا جزیرہ شہر میں واقع ہے دنیا کے خوبصورت ترین گرجاؤں میں شمار کیا جاتا ہے اس کی تعمیر سنہ ۱۱۶۳ء میں شروع ہوئی اور سنہ ۱۲۵۰ء میں یہ مکمل ہوا۔ اس گرجا کے دو مینار ہیں۔ ہر مینار کی بلندی دو سو چھبیس فٹ ہے۔ سنگ تراشی کی صنعت اور نقش و نگار کی خوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

لودر۔ یہ عالیشان عمارت دریائے سین پر واقع ہے۔ دنیا میں اس سے بہتر اور وسیع کوئی شاہی محل نہیں ہے۔ شاہان فرانس اس میں رہتے تھے۔ جمہوریت کے زمانہ میں اس محل کو عجائب خانہ کر دیا گیا اب اس کا شمار دنیا کے بہترین عجائب خانوں میں ہوتا ہے اس محل کے وسیع احاطہ میں اچھے اچھے چمن اور فوارے بنے ہوئے ہیں۔ بڑا دلکش مقام ہے۔

ہوٹل دی انولید۔ یہ عمارت بھی بہت دلچسپ ہے سنہ ۱۶۷۰ء میں فرانس کے ایک بادشاہ نے اس کو بنایا۔ دراصل یہ ایک شفاخانہ تھا اس میں زخمی سپاہی رکھے جاتے تھے۔ ایک حصہ میں عجائب خانہ ہے جس میں قدیم ہتھیار زرہ بکتر فوجی جھنڈیاں اور توپیں وغیرہ رکھی ہوئی ہیں۔ دوسرے حصہ میں نپولین اعظم کی قبر ہے۔ قبر پر سرخ سنگ مرمر کا خوبصورت تعویذ بنا ہوا ہے۔ قریب ہی نپولین کے ذاتی استعمال کی متعدد چیزیں بطور نمائش جمع کی گئی ہیں۔ مثلاً اس کی

مسہری کرسیاں اور تلوار وغیرہ۔ ان چیزوں کو دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ تقریباً سات برس یہ بادشاہ افریقہ کے قریب ایک جزیرے سینٹ ہلینا میں قید رہا اور وہیں دفن بھی ہوا۔ انتقال کے کوئی بیس برس بعد ۱۸۴۰ء میں اس کی لاش پیرس میں منتقل کی گئی۔ کس قدر باہمت اور دبدبہ کا آدمی تھا۔ لیکن اب دیکھو تو مٹی کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔

کہاں سلیماں کہاں سکندر کہاں ہے جم اور کہاں ہے دارا
یہ سب کے سب خاک کے تھے پتلے بگاڑ ڈالے بنا بنا کر

ہوٹل دی ول۔ اس عمارت میں پیرس کے محکمہ صفائی کا دفتر ہے اس کا شمار یورپ کے زمانہ حال کی خوبصورت ترین عمارتوں میں کیا جاتا ہے۔

میڈ لین۔ یہ خوبصورت گرجا گھر ایک بڑے چوراستہ پر واقع ہے۔ اس کے بالمقابل پیرس کی ایک ممتاز سڑک اسی کے نام پر موسوم ہے۔

سار بان دریائے سین کے کنارے پر یہ فرانس کی قدیم یونیورسٹی ہے جو اپنی قدامت میں اکسفورڈ اور کیمبرج سے بازی لے گئی ہے۔ غیر ممالک کے اکثر طالب علم اس یونیورسٹی میں آتے ہیں۔

ایفل ٹاور۔ یہ ایک زبردست لوہے کا بنا ہوا سہ منزلہ مینار ہے ۱۸۸۹ء میں جو نمائش پیرس میں ہوئی تھی۔ اس وقت یہ مینار بنا تھا۔ اس کی بلندی نو سو پچاس فٹ ہے اور اپنی نوعیت کا دنیا میں سب سے اونچا مینار ہے۔ پیرس میں جس طرف جاؤ یہ مینار ضرور نظر آتا ہے۔ برقی جھولوں کے ذریعہ مسافروں کو اوپر لیجاتے ہیں۔ اوپر سے پیرس کا منظر دیکھنے کے لائق ہے اس مینار کی تعمیر میں ساٹھ ہزار پونڈ گورنمنٹ نے صرف کئے۔ اور ایک لاکھ چالیس ہزار پونڈ اس انجینیر نے اپنے پاس سے لگائے جس نے کو اس کو بنایا تھا۔ اس کو

توقع تھی کہ داخلہ کے ٹکٹوں کی قیمت کے ذریعہ وہ اس رقم کی بازیابی کر لیگا خدا معلوم وہ کہاں تک کامیاب ہوا۔

میوزی گروین ۔ یہ نمایش بھی قابل دید ہے۔ لندن میں میڈم ٹوساڈ کی جو نمایش ہے اس کے یہ مماثل ہے۔ بلکہ مجھ کو اس سے بہتر معلوم ہوئی۔ پیرس کے تاریخی واقعات کا فوٹو ان تیلوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ایک خاص چیز اس نمایش میں یہ ہے کہ ایک مقام پر گاندھی جی کی مورت بھی بنی ہوئی ہے۔ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی بیٹھے ہوئے ہیں۔

آپیرا ۔ تقریباً وسط شہر میں یہ ناچ گھر دنیا کا بہترین اور سب سے بڑا تھیٹر ہے۔ یہ عمارت تین ایکر سے زیادہ زمین پر نہایت شاندار بنی ہوئی ہے۔ اس کی اندرونی آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں یہ واقع ہے وہ محلہ بھی اسی کے نام سے موسوم ہے اسی کے قریب چوراستہ پر ایک مینار ہے جس کو ونڈوم کہتے ہیں۔ نپولین اعظم نے اپنی فتوحات میں جن توپوں کو بطور مال غنیمت حاصل کیا تھا۔ ان کو پگھلا کر یہ مینار بطور یادگار بنایا گیا۔ نپولین کا ایک مجسمہ اس مینار پر اس کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔

ورسائی ۔ یہ چھوٹا سا قصبہ بذریعہ ریل پیرس سے نصف گھنٹہ کی مسافت پر ہے۔ یہاں ایک عالیشان شاہی محل ہے جس کو فرانس کے ایک مشہور بادشاہ نے بنایا تھا۔ اطراف کے باغ اور فوارے قابل دید ہیں۔ اب یہ محل عجائب گھر بنا دیا گیا ہے۔

بوادی بولون ۔ پیرس کے جنوب و مغرب میں یہ عجب و غریب سیرگاہ دیکھنے کے لائق ہے۔ ایک روز یہ ہوا کہ ہم ایفل ٹاور جانا چاہتے تھے۔ ایک ٹیکسی والے سے کہا کہ ایفل ٹاور لے چلو وہ سمجھا نہیں۔ شاید یہ لوگ اس کو کچھ اور

کہتے ہیں۔ ہم نے ہاتھ اونچا کر کے اشارہ سے بتلایا کہ وہ ایک اونچی چیز ہے وہاں
چلو۔ اس نے کہا "وی" یعنی اچھا۔ ہم دونوں ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ یہ معلوم تھا
کہ اس مقام سے ایفل ٹاور دو میل سے زیادہ نہیں۔ مگر ٹیکسی میں سوار ہوئے تو معلوم
ہوا کہ موٹر والا ہمارا مطلب سمجھا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ شہر سے باہر ایک جنگل کی طرف
پچیس تیس میل لے گیا۔ وہاں ایک پہاڑ پر آبادی تھی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ
یہ یہاں کی مشہور سیر گاہ بوادی بولون ہے۔ سرسبز درخت۔ نفیس سڑکیں۔ خوبصورت
چمن اور تالاب وغیرہ نے عجب دلکش اثر پیدا کیا۔ یہاں عاشق مزاجوں کا جمگھٹ
رہتا ہے نوجوان اور حسین عورتیں بناؤ سنگار کر کے اپنا جوبن دکھانے کے لئے
اس نواح میں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ اس وسیع سیر گاہ کا رقبہ دو ہزار ایکڑ سے کم
نہ ہوگا۔ ایک روز شام کے وقت ہم بیٹھے تفریح کر رہے تھے کہ ایک نازنین
مہ جبین کو دیکھا کہ آہستہ خرامی کے ساتھ گلگشت کر رہی ہے۔ کچھ عاشقان
جانباز دور دور سے اس کے حسن کا لطف اٹھا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ حسن
کی دیوی آج کل پیرس میں یکتائے زمانہ ہے کبھی کبھی تفریح کے واسطے اس طرف
بھی نکل آتی ہے۔ میں نے خیال کیا اس کو تو چاہیے تھا کہ ایک ہی جگہ بیٹھی رہا کرے
حسن کے پجاری خود ہی پروانہ وار جمع ہو کر اس کی پرستش میں مصروف رہینگے۔

تو کجا بہر تماشہ میروی   اے تماشا گاہ عالم روئے تو

افسوس ہے کہ نہ تو قلم میں قوت ہے اور نہ تخیل میں اتنی وسعت ہے کہ اس پری پیکر
کا سراپا کھینچ سکوں۔ البتہ ہمارے ملک کے کوئی شاعر نازک خیال یہاں موجود
ہوتے تو طبع آزمائی کے لئے اچھا موقع تھا مگر مشکل تو یہ ہے کہ وہ شب دیجور اور
مار سیاہ کی تلاش میں رہتے۔ اور یہاں لوگ سنہری بال پر سر دھنتے ہیں معلوم ہوا کہ
حسن کا بھی کوئی مقررہ معیار نہیں ہے۔ ہر ملک کا مذاق جداگانہ ہے۔

پیرس کی سیر سے فارغ ہوکر سوئٹزر لینڈ روانہ ہوئے۔ لیکن اتفاق کچھ ایسا

پیرس تا برن

ہوا کہ رفیق بیگ کو مجھ سے الگ ہوجانا پڑا۔ بات یہ ہوئی کہ لندن سے روانہ ہونے وقت ہم دونوں نے راست وینس کا ٹکٹ خرید لیا تھا۔ رفیق بیگ نے اپنا ٹکٹ کاکس اینڈ کنگ کمپنی کی معرفت خریدا۔ میں نے امریکن اکسپریس سے لیا۔ اتفاق سے الگ الگ راستہ کے ٹکٹ ملے۔ مجبوراً الگ الگ سفر کرنا پڑا مگر لطف یہ ہے کہ پیرس سے روانہ ہوتے وقت دونوں کی ریلیں بالمقابل ایک ہی پلیٹ فارم پر کھڑی تھیں اور تقریباً ایک ہی وقت روانہ بھی ہوئے۔ رفیق بیگ جنیوا چلے گئے۔ مجھ کو لوزان جانا پڑا۔ غلطی سے قلی نے میرا اسباب ایسے درجہ میں رکھ دیا جو راست برن کو جاتا تھا۔ یہ بات بہت دیر میں معلوم ہوئی۔ اسباب کو فوراً منتقل کرنا خالی از زحمت نہ تھا۔ ماسوا اس کے ایک مسافر نے کہا کہ برن اچھا مقام ہے چلے جاؤ تو کچھ ہرج نہیں۔ وہاں سے لوزان چلے جانا۔ مجھ کو بھی سہولت اسی میں معلوم ہوئی۔ کچھ فاضل کرایہ دے کر برن کا ٹکٹ لے لیا۔ اب تک تو ہم انسانی کارگزاریاں دیکھتے چلے آئے۔ مگر اب سوئٹزر لینڈ میں کارکنان قدرت کی کارسازیاں دیکھنے میں آئیں گی۔ ظاہر ہے کہ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" انسان بیچارے کی کیا حقیقت ہے جو قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں کا مقابلہ کر سکے مگر پھر بھی اس کی کوششیں تعریف کے لائق ضرور ہیں۔ برلن۔ لندن اور پیرس کے عجائبات دیکھنے کے بعد اس بات کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ عقل انسانی روز بروز ترقی پر ہے بالخصوص ایجاد کی دنیا میں تو اس ناقص العقل ہستی نے وہ کارنمایاں کئے ہیں کہ خود عقل اپنی جگہ حیران رہ جاتی ہے۔ البتہ افسوس ہے تو یہ کہ آدمی اس قوت لاثانی کا شکریہ کما حقہ ادا نہیں کرتا۔ جس نے اس کو ذرہ سے اس مرتبہ

کمال کو پہنچایا۔ بلکہ غرور نے اس کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ اپنی اصلیت کو بھولتا جاتا ہے پیغمبر اسلام پر سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی اس میں خداوند کریم نے اشارہ فرمایا ہے کہ پہلے انسان کس حالت میں تھا۔ چنانچہ سورۂ علق میں یہ ارشاد ہوا ہے "خلق الانسان من علق"۔ (انسان کو خون کے لوتھڑے سے بنایا) اسی سورہ میں اس بات کو بھی صاف کر دیا گیا کہ علم جیسی بیش بہا چیز بھی خالق دو جہاں کی عطا کردہ ہے۔ الذی علم بالقلم (جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا) اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ (علم الانسان مالم یعلم۔ (انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اس کو معلوم نہ تھیں) اب اس کلام ربانی کو دنیا کے موجودہ حالات سے مطابق کر کے دیکھو۔ کون عقل کا اندھا شبہ کر سکتا ہے کہ سائنس کی یہ ساری برکتیں منجانب اللہ نہیں ہیں۔ بیشک یہ سب کچھ اسی کا دیا ہوا ہے۔ اور اس امانت کو وہی واپس لے گا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تقریباً ۹ بجے صبح پیرس کے ایک اسٹیشن گارے دی لیان سے روانہ ہو کر سر مغرب ریل برن پہنچی۔ دوپہر کا کھانا ڈائننگ کار میں کھایا جیسے جیسے سوئٹزرلینڈ کی سرحد قریب آتی گئی۔ مناظر قدرت کی دلفریبیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ درجہ میں دو تین مسافر کچھ دور تک ساتھ رہے مگر ایک میم صاحبہ پیرس سے برن تک ساتھ رہیں۔ برن کے قریب کسی قصبہ میں ان کا مکان ہے۔ انگریزی پڑھنے کی غرض سے ایک عرصہ تک لندن میں قیام رہا اس لئے ان سے گفتگو کرنے میں مجھ کو زحمت نہیں ہوئی۔ اس خاتون کی عمر کوئی تیس سال کے قریب ہو گی۔ ابھی تک کنواری ہیں۔ سنگار کا خیال ہر وقت غالب رہتا ہے۔ اکثر بٹوے میں سے آئینہ نکال کر اپنے حسن کا مشاہدہ بار بار کر لیتی ہیں

کچھ نقص پائیں تو پوڈر وغیرہ کے ذریعہ اس کو رفع کرلیتیں۔ سنگار کا یہ شوق یورپ میں وہم کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ ؎

لے آئینہ کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ | صورت میں اپنی قدرتِ پروردگار دیکھ
خال سیاہ اور خط مشک بار دیکھ | زلف دراز طرۂ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ | اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

عورت اگر جوان بننے کی فکر کرے تو خیر مضائقہ نہیں۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے پچپن سالہ مرد بھی اس وہم میں گرفتار ہیں۔ سفید بال کیا نکلا کہ خضاب لگانا فرض ہو گیا۔ اور فرض بھی ایسا کہ بے خضاب باہر نکلتے شرم آتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ

بڑی تلاش کے بعد اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں جگہ ملی۔ متوسط درجہ کا اور آرام دہ ہوٹل ہے۔ اسے ہوٹل ہیون برگ کہتے ہیں۔ کھانے کا انتظام بھی معقول ہے۔ مسافر ہوٹل ہی میں کھانا کھائیں تو ان کے ساتھ کرایہ میں رعایت کی جاتی ہے۔ کھانا اور کمرہ دونوں تشفی بخش ثابت ہوئے کرایہ دس شلنگ کے اندر تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہوٹلوں کا انتظام سوئٹزرلینڈ میں سب سے اچھا ہے۔ یہاں کے لوگوں کو اس کام میں خاص ملکہ ہو گیا ہے اصل یہ ہے کہ ان کی آمدنی اور زندگی کا دارومدار ان مسافروں پر ہے جو دنیا کے ہر حصہ سے یہاں کے قدرتی مناظر اور صحت بخش آب و ہوا کی خاطر کثرت سے آتے رہتے ہیں۔ اپنے ملک کو مقبول بنانے کے لئے ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسافر کو ہر طرح کی آسائش پہنچائی جائے۔ ہوٹل میں دو ایک ملازم انگریزی جاننے والے تھے اس لئے بات چیت میں دقت نہیں ہوئی۔

اس ملک میں جرمن۔ فرانسیسی اور اطالوی زبانیں بولی جاتی ہیں کیونکہ ان ممالک کی سرحد ملحق ہے۔ جو حصہ جس ملک سے ملا ہوا ہے وہاں اس ملک کی زبان رائج ہے۔ یہی حال مذہب کا ہے کچھ لوگ پروٹسٹنٹ اور کچھ رومن کیتھلک، سارا ملک پچیس صوبوں پر منقسم ہے۔ ہر صوبہ اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی سب ایک قوت کے ماتحت ہیں کسی زمانہ میں یہ ملک آسٹریا کے زیر اثر تھا۔ لیکن چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں وہ تعلق باقی نہیں رہا۔ اور ۱۶۴۸ء میں سوئیٹزرلینڈ ایک خود مختار سلطنت تسلیم کر لی گئی۔ موجودہ طرز حکومت کی بنیاد ۱۸۷۴ء میں پڑی۔ اس ملک کے باشندے مضبوط اور جفاکش ہوتے ہیں۔ علاقہ زیادہ تر پہاڑی ہے اس لئے زراعت زیادہ نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ تمول ہے وہ محض غیر ملک کے سیاحوں کی وجہ سے ہے۔ تھوڑی بہت دستکاری بھی ہے کوئلہ اور دھات اس ملک میں کمیاب ہے۔ اس لئے صنعت و حرفت میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ لکڑی پر نقش و نگار یہ لوگ خوب کرتے ہیں گھڑیاں بھی یہاں کی مشہور ہیں۔ چنانچہ دکانوں میں انواع و اقسام کی گھڑیاں بکثرت دیکھنے میں آتی ہیں۔ پنیر اور مکھن یہاں اچھا بنتا ہے یہ دونوں چیزیں بیرونی ممالک کو کثرت سے بھیجی جاتی ہیں اور بہت مقبول ہیں کچھ عرصہ سے سوئیٹزرلینڈ بین الاقوامی کارروائیوں کا مرکز ہو گیا ہے۔ چنانچہ جنگ عظیم کے سلسلہ میں صلح کی بڑی بڑی مجالس اسی ملک میں منعقد ہوئیں۔ جنیوا میں تو مستقل دفتر لیگ آف نیشنس کا قائم ہو گیا ہے آب و ہوا بڑی صحت بخش اور مناظر قدرت بے نظیر ہیں خواہ گرمی ہو یا سردی ہر موسم میں ہزاروں سیاح اس ملک میں آتے رہتے ہیں۔ سرما میں جھیلوں کا پانی سردی کی شدت سے منجمد ہو جاتا ہے اس یخ بستہ سطح پر لوگ اسکیٹنگ

کرتے ہیں جو تفریح کا ایک نہایت مقبول طریقہ ہے۔ قدرت نے اس ملک کو جو خوبصورتی عطا کی ہے اس میں انسانی کارگزاری نے چار چاند لگا دیے ہیں حقیقت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کارکنان قدرت نے سوئیٹزر لینڈ کو خاص اپنے ہاتھوں سے بہشت کے نمونہ پر بنایا ہے۔ اونچے اونچے سرسبز پہاڑوں کے دامن میں جھیلیں اور ان کے کناروں پر خوبصورت آبادیاں بحیثیت مجموعی عجیب دلکش نظارہ ہے کوئی تعجب نہیں جو انسان اپنے کو عالم خواب میں خیال کرے۔

برن برن اگرچہ اس ملک کا دارالسلطنت ہے لیکن وسعت و آبادی کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر ہے۔ یہ شہر ایک بے ہنگم پہاڑی پر آباد ہے تین جانب دریائے آر بہتا ہے کہتے ہیں کہ برن کا نام لفظ بیر سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "ریچھ" کے ہوتے ہیں۔ یہ روایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ شہر میں ایک محصور مقام پر قدیم زمانہ سے ریچھ پالے جاتے ہیں بڑے بڑے حوض بنے ہوئے ہیں۔ جن میں ریچھ چھوڑ دیے گئے ہیں یہ ایک عجیب و غریب عملدرآمد ہے۔ قدیم عمارتوں میں ٹاؤن ہال اور گھنٹہ گھر دیکھنے کے لائق ہیں۔ گھنٹہ گھر بیچ شہر میں ہے۔ عمارت تو معمولی ہے لیکن گھنٹے میں ایک خاص صنعت رکھی گئی ہے۔ جس وقت بجتا ہے تو لوگ تماشا دیکھنے کے لئے جوق جوق جمع ہو جاتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ گھنٹے کی ہر باج پر مرغ کی بانگ نکلتی ہے اور ایک جانب ریچھوں کی قطار نمایاں ہو جاتی ہے۔ گھنٹہ گھر کی عمارت قدیم وضع کی ہے۔ زمانہ حال کی عمارتوں میں ایوان پارلیمنٹ عجائب خانہ اور لائبریری تعریف کے لائق ہیں۔ بازاروں کی وضع بھی خاص ہے۔ دکانوں کے سامنے برانڈے ہیں۔ اگرچہ موسم کی سختی سے حفاظت کے لئے یہ تدبیر اچھی ہے۔ مگر چھت نیچی ہونے کی وجہ سے دکانوں میں اندھیرا

رہتا ہے۔ سڑکیں اچھی اور جدید وضع کی ہیں۔ ٹریم بھی چلتی ہے۔ بازاروں میں بڑی رونق رہتی ہے اسٹیشن پر بھی دن رات مسافروں کا ہجوم ہوتا ہے۔ مختلف ہوٹلوں کے ملازم اپنا اپنا نشان لگائے ہوئے اسٹیشن پر ایک مقررہ جگہ قطار باندھے کھڑے ہوتے ہیں لیکن کیا مجال ہے کہ کوئی مسافر سے کچھ کہے یا پریشان کرے۔ ان ملازمین کا فریضہ صرف اس قدر ہے کہ اپنے ہوٹل کے مسافروں کا اسباب ہوٹل پہنچادیں۔ برن جس پہاڑی پر آباد ہے اس کے کنارے ایک طرف باغ ہے۔ وہاں سے اطراف کا منظر بڑا دلکش ہے۔ اس ملک میں ایک بات اچھی یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ غیر ملک کی چیزیں اصلی داموں پر ملتی ہیں۔ کیونکہ ان پر محصول زیادہ نہیں لیا جاتا۔ مثلاً فرانس اور اٹلی وغیرہ میں انگریزی سگریٹ بہت گراں بکتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں یہ کیفیت نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اس ملک میں چونکہ صنعت وحرفت زیادہ نہیں ہے اس لئے مسافروں کی خاطر باہر سے ہر چیز منگوانی پڑتی ہے اشیاء پر محصول اگر بڑھا دیا جائے تو لازماً ہر چیز مہنگی ہو جائے گی اور مسافر اس کو محسوس کریں گے۔ چھوٹا ملک اور چھوٹے چھوٹے شہر لیکن بازاروں کی رونق بڑے بڑے شہروں کو مات کرتی ہے۔

لوزان تین روز یہاں قیام کرنے کے بعد اپنے ٹکٹ کے لحاظ سے لوزان گیا۔ یہ وہی شہر ہے جہاں جنگ عظیم کے خاتمہ پر صلح کی مجلس منعقد ہوئی تھی۔ جھیل جنیوا کے شمالی کنارے سے ایک پہاڑ کے ڈھلاؤ پر یہ شہر آباد ہے سارے ملک کی اعلیٰ عدالت اور یونیورسٹی اسی شہر میں ہے یہاں کا گرجا سوئٹزرلینڈ میں سب سے خوبصورت ہے۔ اسٹیشن کے قریب یورا سمپلان ہوٹل میں قیام ہوا۔ دو ایک ملازم انگریزی جانتے ہیں جھیل کا کنارہ بڑی تفریح کا مقام ہے۔ اطراف کے منظر کی دلربائی کو تحریر میں لانا میرے امکان سے

خارج ہے۔ سوئیٹزرلینڈ میں فرانس کی طرح فرنیک اور سانتین کا رواج ہے
لیکن یہاں کے فرنیک کی قیمت نو دس آنہ کے برابر ہوتی ہے۔ موسم گرما میں
مقیاس الحرارت پچاس اور ساٹھ ڈگری کے درمیان رہتا ہے۔

میلان

لوازن دیکھنے کے بعد میرا قیام میلان میں ہوا جو اٹلی کے
علاقہ میں ایک بڑا شہر ہے راستہ میں ایک مشہور درہ
کے اندر سے ریل گزرتی ہے۔ یہ سمپلان ٹنل کے نام سے مشہور ہے۔ یورپ میں
اس سے لمبا کوئی ٹنل نہیں ہے۔ بارہ میل سے زاید اس کا طول ہے۔ یہ
۱۹۰۶ء میں تیار ہوا۔ راستہ میں کوہ الپس کے دل آویز مناظر دیکھنے میں
آئے۔ ہمارے درجہ میں ایک مسافر بیٹھا ہوا تھا اس کی ڈاڑھی اس قدر گھنی
اور بڑی تھی کہ میں نے اب تک کبھی نہیں دیکھی۔ تعجب ہے کہ اتنی زبردست
داڑھی سے اس شخص کا دم نہیں گھبراتا اور تکلیف نہیں ہوتی۔ آجکل یورپ میں
ڈاڑھی مونچھ رکھنے کا رواج تقریباً مفقود ہے۔

رات کو آٹھ بجے کے قریب ریل میلان پہنچی۔ سنٹرل اسٹیشن کے قریب
اشمز نامی ہوٹل میں ٹھہرنا ہوا۔ آبادی کے حساب سے یہ شہر اٹلی میں درجہ دوم پر
ہے۔ لیکن کاروبار اور تمول کے لحاظ سے سب سے اول ہے۔ مردم شماری
چھ لاکھ کے قریب بتلائی جاتی ہے۔ ریشمی اونی اور سوتی کپڑا یہاں اچھا بنتا
ہے۔ دو عمارتیں خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہیں ایک گرجا دوسرا تھیٹر۔
گرجا شان و شوکت اور فن تعمیر کے لحاظ سے دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اگرچہ
چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ لیکن سینکڑوں
برس تک مکمل نہ ہو سکا۔ جرمن اور فرانس کے مشہور ماہرین فن مشورے کے
لئے بلائے گئے۔ کمیٹیاں ہوتی رہیں۔ غیر ملکیوں سے ملکی ماہرین فن کا

جھگڑا ہو گیا جس کی وجہ سے کچھ عرصہ تک تعمیر ملتوی رہی بالآخر نپولین بوناپارٹ نے اس کو مکمل کیا۔ تمام عمارت سفید سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ لیکن امتداد زمانہ کی وجہ سے پتھر میلا ہو گیا۔ باہر سے عمارت کی دلفریبی انسان کو محو حیرت کرتی ہے۔ دو ہزار کے قریب سنگ مرمر کی خوبصورت مورتیں اور متعدد خوشنما برجیاں عمارت کی شان کو دوبالا کر رہی ہیں۔ سنا ہے کہ چاندنی رات میں اس کا منظر خاص کیفیت رکھتا ہے۔ یہ گرجا ایک سو باسٹھ گز طویل اور تہتر گز چوڑا ہے۔ سیر کرانے کے لئے ایک رہبر مقرر ہے۔ بالائی حصہ پر سے شہر کا منظر خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہے۔ گرجا کے اندر ایک قدیم پیتلی شمعدان درخت کی وضع کا دیکھنے میں آیا جس میں سات شاخیں ہیں۔ گرجا کی چھت باون ستونوں پر قائم ہے اور ہر ستون کی گولائی سولہ قدم کے قریب ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ عمارت دل پر گہرا اثر کرتی ہے۔ یہاں کے لوگوں میں مذہب کی کچھ عظمت باقی ہے عورتوں کو دیکھا کہ گرجا سے واپس ہوتے وقت داخلہ کے دروازے کے قریب ٹھہر کر تعظیماً جھک جاتی ہیں۔

دوسری عمارت ایک تھیٹر اسکالا نامی ہے۔ یہ بھی اپنی نوعیت میں یکتائے زمانہ ہے یہ ۱۷۷۸ء میں تیار ہوا۔ اس میں تین ہزار چھ سو آدمیوں کی نشست کا بندوبست ہے اس شہر میں چھوٹے چھوٹے اور کچھ بڑے گرجا بکثرت ہیں ایک قبرستان بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں ملک کے مشہور افراد اور قومی خدمت کرنے والوں کی قبریں ہیں۔ قبروں کو بہت آراستہ رکھا گیا ہے شہر اگرچہ بڑا ہے۔ لیکن عمارتیں عام طور پر اتنی شاندار نہیں ہیں جو یورپ کے دیگر ممالک میں دیکھی گئیں۔ قدیم مکانوں کی چھت سفال پوش ہے گویا اسی وضع کا استعمال کرتے ہیں۔ جیسے ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ صفائی اور ستھرائی میں یہاں کے

بڑی نہر - وینس

لوگ شمالی یورپ سے بہت پیچھے ہیں۔ ایمانداری بھی ویسی نہیں ہے۔ لیکن خوش مزاج اور حسین ہوتے ہیں۔ یورپ میں ایسی خوبصورتی دیکھنے میں نہیں آئی۔ فرانسیسیوں کی طرح یہاں کے لوگ بھی بڑے باتونی ہوتے ہیں۔ کاش کہ ہم کو ان کی زبان آتی اور ہم ان سے باتیں کرتے۔ اطالوی زبان فرانسیسی کی طرح بہت میٹھی معلوم ہوتی ہے۔ کھانا پکانے میں یہ لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ نپولین بوناپارٹ نے اس شہر کو اپنی حکومت کے زمانہ میں اٹلی کا دارالسلطنت قرار دیا تھا۔

بلونیا میلان کی سیر کرنے کے بعد میرا قیام بلونیا میں ہوا۔ جو میلان سے (۱۳۵) میل کے فاصلہ پر جنوب و مشرق میں واقع ہے۔ یہاں صرف چند گھنٹے ٹھہرنا ہوا کیونکہ وینس کے واسطے ریل تبدیل کرنی ضروری تھی۔ اس شہر کی سڑکیں وسیع اور لمبی ہیں۔ متعدد گرجاگھر اور قدیم عالیشان عمارتیں یہاں دیکھنے میں آئیں۔ دو مینار خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہیں۔ ان کی صفت یہ ہے کہ درمیان میں خمیدہ ہیں۔ ایک مینار جو بارہویں صدی عیسوی میں بنا تھا۔ (۳۱۸) فٹ بلند ہے اور اس کا خم خط مستقیم سے چار فٹ تک ہٹا ہوا ہے دوسرا مینار بھی اسی زمانہ میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کی بلندی (۱۴۵) فٹ ہے لیکن سات فٹ کے قریب خمیدہ ہے۔ یہ دونوں مینار اینٹ کے بنے ہوئے ہیں کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانہ میں دشمن کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے اور مدافعانہ اغراض کے پیش نظر یہ بنائے گئے تھے۔ شہر کے بیچ میں دو چوراہے بڑے خوبصورت ہیں۔ بلونیا ایک قدیم شہر ہے جس کی موجودہ آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہوگی۔ سب سے بڑا گرجا سان پٹرونیو کے نام سے مشہور ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ لیکن غیر مکمل رہ گیا۔ بنانیوالوں کے

خیالات بہت اونچے تھے وہ چاہتے تھے کہ یہ گرجا اس قدر عالیشان ہو کہ دنیا میں اس کی نظیر نہ ملے۔ مگر "کار دنیا کسے تمام نہ کرد" کی مثل صادق آئی اور ۱۶۵۹ء میں اس کو نا مکمل چھوڑنا پڑا۔

وینس

بلونیا سے وینس زیادہ دور نہیں ہے۔ اب تک تو ہر جگہ موٹر میں سوار ہوتے رہے۔ لیکن یہاں سواری مفقود ہے اسٹیشن پر امریکن اکسپریس کا ملازم موجود تھا اس نے ایک کشتی میں مجھ کو سوار کرا کے کہا لیجئے آپ وینس کی موٹر میں سوار ہو گئے۔ گرینڈ کینال یعنی نہر کلاں کے کنارے ایک ہوٹل میں قیام رہا۔ باہر سے عمارت بہت معمولی لیکن اندر خوب آراستہ ہے۔

یہ شہر اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیا میں عجیب و غریب ہے۔ بحر ادریاٹک میں ایک جھیل تھی جس کا پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ یہ جھیل تقریباً پچیس میل لمبی اور نو میل چوڑی تھی اور اس میں ایک سو سترہ چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے۔ قدیم زمانہ کے لوگوں نے ان ہی جزیروں میں اس شہر کی بنیاد رکھی۔ صفت یہ ہے کہ سڑک کا نام نشان نہیں۔ ڈیڑھ سو سے کچھ اوپر نہریں ہیں یہی سڑک کا کام دیتی ہیں۔ نہروں کے دونوں طرف مکانات بنے ہوئے ہیں۔ کشتیوں کے ذریعہ آمد و رفت رہتی ہے۔ ان کشتیوں کو یہاں کے لوگ گنڈولہ کہتے ہیں۔ سہولت کے مدنظر جا بجا پل بھی بنے ہوئے ہیں جن کی تعداد چار سو کے قریب بتلائی جاتی ہے۔ ایک نہر کتنی قدر چوڑی اور دو میل لمبی ہے اس کو گرینڈ کینال یعنے نہر کلاں کہتے ہیں۔ اوسط چوڑائی ستر گز اور گہرائی سولہ فیٹ ہے۔ گویا یہاں کی سب سے بڑی شاہراہ ہے۔ دوسری نہریں بہت تنگ ہیں۔ کشتیاں ہر وقت کرایہ پر چلتی رہتی ہیں۔ نہر کلاں میں چھوٹے چھوٹے اسٹیمر بھی چلنے لگے ہیں گاڑی گھوڑا۔ اور موٹر بالکل مفقود ہے۔ لوگ یا تو پیدل چلتے ہیں یا کشتیوں میں پھرتے ہیں

وینس بہت قدیم ہے۔ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یورپ میں ایک بادشاہ اٹیلا نامی تھا۔ خونریزی اور جنگ وجدل میں اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ یورپ کے جنوبی حصہ میں اس کے مظالم نے اس قدر بدامنی پیدا کردی کہ کچھ لوگ اپنی جان بچا کر سمندر کے کنارے آگئے۔ اس زمانہ میں وہاں دل دل کے سوا کچھ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ ان ہی لوگوں نے وینس کو آباد کیا۔ اور ایسی ترقی کی کہ ایک عرصہ تک یہاں آزاد حکومت قائم رہی۔ اسی بندرگاہ سے بلاد شرقیہ کو جہاز جایا کرتے تھے۔ یہی مقام تجارت کا مرکز تھا۔ عرصہ تک قسطنطنیہ اس حکومت کے زیر اثر رہا۔ لیکن قدرت کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ عروج کے بعد زوال ہوتا ہے چنانچہ وینس کی حکومت بھی کمزور ہوتی گئی قسطنطنیہ کو ترکوں نے فتح کرلیا۔ اور سلطنت روما کی بنیادیں ڈھیلی پڑگئیں اس اثناء میں ممالک شرقیہ کو جانے کے لئے سمندر کے دوسرے راستے بھی دریافت ہوگئے۔ وینس کی تجارت گھٹتی چلی گئی۔ آئے دن کی جنگ اور خونریزیوں نے اور بھی تباہ کردیا۔ بالآخر ۱۷۹۷ء میں نپولین بوناپارٹ نے اس شہر کو فتح کرلیا۔ اس کے بعد آسٹریا کا قبضہ رہا۔ اب ۱۸۶۶ء سے مستقل طور پر یہ شہر اٹلی کے علاقہ میں شامل ہے۔ قدیم وینس کے حاکم کا لقب ڈوجے ہوا کرتا تھا۔ ہر حاکم اسی لقب سے مخاطب کیا جاتا۔ چنانچہ ایک عالیشان محل ابھی تک موجود ہے جسے ڈوجے کا محل کہتے ہیں۔

یہاں کی تمام عمارتیں قدیم ہیں۔ کیونکہ جدید عمارت کے واسطے جگہ نہیں ملتی۔ یہی کیفیت ہوٹلوں کی ہے۔ باہر سے دیکھو تو بوسیدہ اور معمولی مکان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اندر سے آراستہ و پیراستہ ہوتے ہیں۔ یورپ کے دیگر ممالک کی نسبت اٹلی میں ہوٹل گراں ہیں اور چوری چکاری کا اندیشہ بھی لگا رہتا ہے

چنانچہ رفیق بیگ نے چمبر میڈ پر اعتماد کر کے کوٹ کھونٹی پر ٹنگا چھوڑ دیا۔ اس کوٹ کی جیب میں کچھ نوٹ تھے جو سرقہ گئے۔ ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد سب سے پہلے فکر رفیق بیگ کو تلاش کرنے کی ہوئی۔ یاد ہوگا کہ یہ مجھ سے پیرس میں الگ ہوگئے تھے ان کے ہوٹل کا پتہ بھی معلوم نہ تھا۔ حسنِ اتفاق دیکھو کہ میں امریکن اکسپرس کے دفتر جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک مقام پر پیچھے سے آواز آئی۔ السلام علیکم۔ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب بیک بینی و دو گوش موجود ہیں معلوم ہوا کہ کسی دوسرے ہوٹل میں مقیم ہیں۔ میں نے مزاج پرسی کی بہت ناراض تھے۔ فرمانے لگے میں تین روز سے تمھارے انتظار میں یہاں پڑا ہوا ہوں خدا معلوم کہاں غائب ہوگئے تھے۔ اس تنہائی اور پریشانی میں کئی دفعہ میری ناف ٹل گئی ہے۔ اور اب پھر ٹلنے کو ہو رہی ہے۔ میں نے کہا گھبراؤ نہیں۔ یہ فال نیک ہے یاد ہوگا کہ سفر کے شروع ہونے پر بھی تمھاری ناف ٹلی تھی اسے سفر کا خاتمہ سمجھو۔ خدا کا شکر ہے کہ سفر بہت کامیاب رہا اب ہم ساحل یورپ کو خیرباد کہنے والے ہیں۔ تمھاری ناف بہت موقع سے ٹلی ہے اس کے ٹلنے کو تم نہ ٹالو۔

وینس کی گلیاں عام طور پر تنگ اور غلیظ ہیں بعض گلیاں تو بالکل بھول بھلیاں ہیں۔ اجنبی آدمی ان گلیوں میں گھبرا جاتا ہے دو ایک دفعہ میں راستہ بھول کر ایک بھول بھلیاں میں پڑ گیا وہ پریشانی بھی ہمیشہ یاد رہے گی گھنٹوں گلیوں میں چکر لگاتا رہا ان کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا اور ختم بھی ہوتا تو اس طرح کہ آگے راستہ بند۔ بنارس کی تنگ و تاریک کی گلیاں یاد آئیں۔ صرف ایک مقام اس شہر میں کسی قدر کشادہ ہے۔ وہیں رونق بھی رہتی ہے۔ اگر انسان تمام دن یہاں بیٹھا رہے تو شاید دم نہ گھبرائے گا۔

اس جگہ قدیم شاہی عمارتیں بھی ہیں۔ اس مقام کا نام سینٹ مارک اسکوئر ہے۔ وینس
کے کسی دوسرے حصہ میں اس قدر خوبصورت اور عالیشان عمارتیں جیسی اس
محدود حصہ میں ہیں پائی نہیں جاتیں جانب مشرق سینٹ مارک کا گرجا ہے شمال
وجنوب میں قدیم عمارتیں ہیں۔ جن میں عمائد سلطنت رہا کرتے تھے اب ان میں
دکانیں ہیں۔ مغرب میں بھی قدیم عمارتیں ہیں۔ ان تمام عمارتوں کے سامنے سائبان
اور وسط میں صحن ہے۔ ہزار ہا کبوتر اس صحن میں دانہ چگتے رہتے ہیں۔ شاہی
زمانہ میں منجانب سرکار دانہ ملا کرتا تھا۔ اب عوام ان کی خبر گیری کرتے رہتے ہیں
ہفتہ میں چار روز شام کے وقت بینڈ نوازی ہوتی ہے۔ پہلوؤں میں رسٹوران
ہیں۔ گرمی کے موسم میں میز کرسیاں صحن میں ڈال دی جاتی ہیں۔ لوگ یہاں
بیٹھ کر تفریح میں مصروف ہوتے ہیں۔ البتہ اس وقت رسٹوران والے قیمت
دوگنی وصول کرتے ہیں۔ صحن کے ایک جانب چبوترے سے سمندر کی لہریں
ٹکراتی رہتی ہیں۔ چاندنی رات میں یہ منظر عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شمالی گوشہ
میں ایک پھاٹک ہے اور اس پر ایک عالیشان عجیب و غریب گھنٹہ گھر
بنا ہوا ہے۔ اس کے بالائی حصہ پر دو پیتل کی مورتیں ہیں۔ ان کے درمیان
ایک گھنٹہ ہے پیتل کی مورتیں اس پر دونوں طرف سے موگری کی زد لگاتی
ہیں۔ یہ آواز چاروں طرف دور تک پھیلتی ہے۔ سینٹ مارک کا گرجا مشرقی
وضع کی قدیم اور خوبصورت عمارت ہے جس کی لمبائی (۸۳) گز اور چوڑان
(۵۶) گز ہے۔ اس پر پانچ خوشنما گنبد ہیں۔ اور پانچسو کے قریب سنگ مرمر کے
ستون عمارت کی زیبائش میں ترقی دیتے ہیں۔ جابجا سنہری رنگ آمیزی
عجیب لطف پیدا کرتی ہے۔ الغرض بڑی شان وشوکت کی عمارت ہے
گرجا کے اندر کی سیر بھی ضرور کرنی چاہیئے۔ اس عمارت کے سامنے پیتل کے

تین ستون ہیں۔ جن پر قدیم صنعت کے نقش و نگار ہیں۔ ستونوں پر جھنڈے اڑتے رہتے ہیں۔ داخلہ کے دروازے پر چار پیتلی گھوڑے ہیں۔ یہ تحقیق نہیں ہے کہ کہاں سے لائے گئے صرف اتنا معلوم ہے کہ ۱۲۰۴ء میں ایک بادشاہ ان کو لایا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ قسطنطنیہ سے بطور مال غنیمت حاصل ہوئے۔ ہر گھوڑے کی اونچائی ۵ فٹ ہے یہ گھوڑے نپولین بونا پارٹ کو اس قدر پسند آئے کہ ان کو اپنے ساتھ پیرس لے گیا۔ بعد میں جب نپولین کا ستارہ زوال میں آیا تو حق بحقدار رسید یعنے گھوڑے وینس کو واپس مل گئے جنگ عظیم میں یہ ڈر پیدا ہوا کہ مبادا نپولین کی طرح قیصر جرمنی کو بھی یہ بیش بہا چیز پسند آجائے اور دوبارہ ہاتھ سے جاتی رہے۔ اس لئے اس زمانے میں گھوڑے اپنی جگہ سے ہٹائے گئے۔ اور کسی غیر معلوم مقام پر ان کو محفوظ کر دیا۔ لڑائی جب ختم ہوئی تو جان میں جان آئی اور گھوڑے اپنی اصلی جگہ واپس آگئے۔ اس سے اندازہ کرلو کہ اس قدیم یادگار کی کیسی قدر و منزلت یہ لوگ کرتے ہیں۔ سینٹ مارک کے جنوب مشرقی گوشہ میں جو حصہ ہے اس کو پیازیٹا یعنے چوک کہتے ہیں۔ اس کے مشرق میں ڈوجے کا محل اور مغرب میں کتب خانہ کی عمارت ہے۔ بالمقابل سمندر کا حصہ ہے۔ پیازیٹا میں پتھر کے دو مینار ہیں ایک پر شیر ببر کی صورت ہے۔ جس کے دو پر بھی ہیں۔ پروں والا شیر ببر حکومت وینس کا قومی نشان تھا۔ دوسرے مینار پر ایک مذہبی پیشوا سینٹ تھیوڈر کی صورت ہے۔

ڈوجے کا محل قدیم فن تعمیر اور تہذیب کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے یہ عمارت نہ صرف محل کے طور پر استعمال ہوتی تھی بلکہ اس میں انتظام مملکت سے متعلق امور بھی انجام پایا کرتے تھے ایک شاندار حجرہ کا سمندر کی جانب ہے اسکے

بالمقابل صحن میں مجرمین کھڑے کئے جاتے تھے اور ان کی قسمت کا فیصلہ جھروکے سے سنایا جاتا تھا۔ آرائشی کام محل کے اندر قابل دید ہے۔ اگرچہ گوتھک وضع کی عمارت ہے۔ لیکن مشرقی مذاق کی جھلک جابجا پائی جاتی ہے سنگ مرمر کی کثرت۔ پچی کاری کی نزاکت اور نقش و نگار وغیرہ دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ سنگ مرمر کے ستون بالکل مشرقی وضع کے بنے ہوئے ہیں۔

وینس کے اطراف و اکناف میں قدیم زمانہ کے گرجا متعدد ہیں۔ دو ایک عجائب خانے بھی دیکھنے کے لائق ہیں۔ کانچ کا سامان کثرت سے اور اچھا بنتا ہے۔ شہر کے اندر متعدد کارخانے ہیں۔ بازار میں ان کے ملازمین مسافروں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ اور بہت اصرار کے ساتھ کارخانے کی سیر کرانے لیجاتے ہیں۔ سیر کا تو نام ہوتا ہے لیکن مسافر وہاں جانے کے بعد کچھ نہ کچھ ضرور خرید لیتا ہے۔ وینس کے قریب جنوب مشرق میں ایک جزیرہ لیڈو ہے یہ بڑی رونق کی جگہ ہے۔ اٹلی میں غالباً اس سے بہتر اور معقول کوئی مقام نہانے کا نہیں ہے۔

یہاں بھی وہی تماشہ دیکھنے میں آیا۔ جو اب تک تمام یورپ میں دیکھتے آئے تھے۔ عورت مرد ایک ہی جگہ نہانے کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ایک انگریزی دال سیاح بھی یہاں موجود تھا۔ اس سے کچھ دیر تبادلہ خیالات کا موقعہ ملا۔ کہتا تھا میں ہندوستان کی سیر بھی کرچکا ہوں تم کیوں اس طریقہ پر اظہار تعجب کرتے ہو۔ میں نے بنارس کے گھاٹ پر یہی تماشہ دیکھا ہے تمہارے ہاں عورتیں مہین کپڑے کی ساڑھی پہنکر نہاتی ہیں۔ اندر سے جسم دکھائی دیتا ہے مرد بھی اسی مقام پر نہاتے ہیں۔ یورپ والے اگر ایسا کریں تو کون سا گناہ ہو۔ میں نے کہا تم نے جو کیفیت بنارس کے گھاٹ پر دیکھی ہے اس کو اس طریقے

کوئی تعلق نہیں۔ اہل ہنود مذہبی احکام کے تحت علی الصبح دریا پر نہاتے ہیں۔ تفریح کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ ان کا قدیم رواج ہے۔ یورپ میں یہ طریقہ پہلے معدوم تھا۔ اب یہ جدّت محض تفریح کے خیال سے ہوئی ہے اس میں تصور عیش پرستی کا پیدا ہوجاتا ہے اخلاق پر اس کا اثر ہونا لازمی ہے آخرکار برہنہ کلب قائم ہونے لگے ہیں۔ اس نے کہا برہنہ ہونا بھی عورت کی پاکدامنی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ تمہارے ملک میں بعض اقوام ایسی ہیں جن کی عورتیں اپنا سینہ کھلا رکھتی ہیں۔ سماٹرا کی طرف ایک قوم ایسی ہے کہ سب برہنہ رہتے ہیں۔ باوجود اس کے عورتیں پاکدامن ہوتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ عصمت کا دارومدار لباس پر نہیں ہے۔ بلکہ شخصی جذبات اور خیالات پر ہے میں نے کہا کہ یہ سب کچھ صحیح لیکن خیالات میں کایا پلٹ سوسائٹی کے لحاظ سے ہوتی رہتی ہے۔ یورپ کا موجودہ طرز معاشرت عیش پرستی کی طرف زیادہ لے جا رہا ہے۔

وطن کو واپسی

۲۴ ستمبر کو وینس سے ہمارا جہاز دیس پس گینجے بمبئی کو روانہ ہوا۔ راستہ میں برنڈزی پر کچھ گھنٹے ٹھہرنا ہوا ایک گاڑی میں سیر کے لئے روانہ ہوئے۔ چھوٹا مقام ہے کسی زمانہ میں بہت اہم بندرگاہ تھا۔ ہندوستان کو جہاز یہیں سے جایا کرتے تھے۔ لیکن چالیس سال سے کچھ اوپر ہوئے کہ پی اینڈ او کمپنی نے مارسیلز کو صدر مقام بنالیا۔ کوئی خاص چیز دیکھنے کے لائق یہاں نہیں ہے۔ میوہ بہت سستا ہے بالخصوص انجیر یہاں کا بہت لذیذ ہوتا ہے۔ انگور اور آڑو وغیرہ بھی سستے تھے۔

گینجے جہاز بہت معقول ہوتا ہے۔ یہ سولہ ہزار ٹن کا ہے۔ اول دوم۔ سوم تین درجے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور درجہ ہے جس کو

ڈک یا درجہ چہارم کہتے ہیں۔ تیسرا درجہ متوسط طبقہ کے لوگوں کے لئے اچھا ہے ہر قسم کی کافی آسایش ہے۔ کیبن میں دو دو برقی پنکھے اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے ضروری بندوبست ہے۔ ایک خادمہ اطالوی قوم کی خدمت کے واسطے مقرر ہے۔ اس کے علاوہ دو آدمی اور ہیں۔ ہمارا کیبن چار آدمیوں کا تھا تیسرے درجہ کا کرایہ بمبئی تک چوبیس پونڈ ہوتا ہے۔ درجۂ دوم کا کرایہ دو گنے سے زائد ہے۔ تیسرے درجے کے واسطے کھانے کا کمرہ بھی اچھا ہے۔ اطالوی جہازوں میں کھانا ہندوستانی مذاق سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ ترکاری کھانے والوں کے لئے میز الگ ہوتی ہے۔ ہم کو اس جہاز پر خاطر خواہ کھانا ملا۔ ہر مسافر کی جگہ مقرر تھی۔ کھانے کے کمرے میں متعدد برقی پنکھے لگے ہوئے ہیں۔ ملازمین سب اطالوی قوم کے لوگ ہیں۔ ڈائننگ ہال میں ایک جانب اٹھنے بیٹھنے کے لئے میز کرسیاں لگی ہیں۔ خط لکھنے کے لئے جہاز کے مونوگرام کا کاغذ مفت تقسیم ہوتا ہے۔ ایک طرف پیانو رکھا ہوا ہے۔ جس کسی کو ضرورت ہو اپنے شوق کو پورا کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک شوقین مزاج خاتون اکثر اپنے کمال سے سامعین کو محظوظ کرتی رہتی تھیں۔

ہندوستانی مسافروں کی اس جہاز پر اچھی تعداد تھی ان میں اکثر طالب علم تھے اور فارغ التحصیل ہو کر واپس جا رہے تھے۔ کوئی ڈاکٹر تھا کوئی انجنیر اور کوئی بیرسٹر۔ بقیہ مسافر یوروپین تھے۔ دو جرمن عورتیں بھی تھیں۔ جنھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ نکاح کر لیا ہے۔ یہ دونوں ہندوستانیوں کے ساتھ اچھی طرح ملتی جلتی تھیں اس جہاز پر اطالوی سکہ چلتا ہے لیکن انگریزی سکہ بھی لے لیتے ہیں اطالوی لیرا ڈھائی آنہ کے قریب ہوتا ہے۔ ایک لیرا کے سو پیسے ہوتے ہیں جن کو سنیٹ کہتے ہیں۔

کالے گورے کا فرق

تعجب ہے کہ انگریزی جہازوں کی تقلید میں یہ لوگ بھی کالے گورے کا امتیاز کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے کہ کھانے کے کمرے میں ہندوستانیوں کی میز یوربین حضرات سے الگ ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرز عمل کا اصلی سبب کیا ہے اگر فی الحقیقت رنگ کا امتیاز مقصود ہے تو بہت سے ہندوستانی بھی گورے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کو کس لئے راندۂ درگاہ کیاجاتا ہے۔ غور کرو تو معلوم ہوجائے گا کہ اصلی راز کچھ اور ہے خدا کسی قوم کو محکوم نہ بنائے۔ آجکل سیاسی قوت کے بغیر کوئی قوم اپنا وقار قائم نہیں رکھ سکتی۔ ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ اگر مشرقی اقوام کی حکومت یورپ میں قائم ہوجائے تو کالے اپنے محکوم گوروں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کریں گے۔ اس کا جواب بظاہر آسان معلوم نہیں ہوتا۔ قانون فطرت کا عمل سب پر یکساں ہوتا ہے۔ اگر یہ تعصب تقاضائے فطرت بشری کا نتیجہ ہے تو جواب بھی کھلا ہوا ہے۔ سردست تو گوروں کی بہار ہے۔ اور وہ اپنے عمل کو فطرت کے مطابق خیال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ حکومت قدرتی طور پر خود داری کا احساس پیدا کرتی ہے جس کسی قوم نے اس کے خلاف عمل کیا۔ نقصان اٹھایا سلاطین مغلیہ کے ہاتھ سے ہندوستان اور عربوں کے ہاتھ سے اسپین اسی پھیر میں گیا خیر یہ مسائل تو بحث طلب ہیں۔ لیکن کالوں کی بہار بھی دیکھنے کے لائق ہوگی۔ بطور اکبر آبادی جاڑوں کا سماں تفصیل کے ساتھ کرکے لکھتے ہیں۔ کہ یہ سب حالات جب موجود ہوں تو ع

پھر دیکھ بہاریں جاڑوں کی

اسی طرح یورپ میں کالوں کی حکومت ہو اور ان ہی کا بول بالا ہو تو ع

پھر دیکھ بہاریں کالوں کی

یورومین مسافر حسب عادت ہندوستانیوں سے الگ الگ رہتے تھے
ڈک توسب کے لئے ایک تھا لیکن ایک علیحدہ گوشہ میں اس برگزیدہ قوم نے
اپنا اڈا جمالیا تھا۔ ہم لوگوں سے بات چیت کرنا بھی شان کے خلاف سمجھتے تھے
مانا کہ سیاسی پہلو سے ان کو ہم پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن حکمراں قوم کے واسطے
پسندیدہ طریقہ تو یہ ہوگا کہ محکوم قوم کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کر کے اپنی
ہردلعزیزی کو بڑھائیں۔ بالخصوص آج کل کے سیاسی حالات کے پیش نظر
اس قسم کے میل جول کی ضرورت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ افسوس کہ بعض مغرور
اور تنگ خیال یورپین نشہ حکومت میں ایسے چور ہو رہے ہیں۔ کہ مصلحت
وقت کو بالکل نہیں دیکھتے جو انگریز شریف الخیال ہیں وہ کالے گورے کا
فرق نہیں کرتے بہت اخلاق کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی
تعداد کم ہے۔ تاریخ عالم پر ایک سرسری نظر بھی ڈالو تو معلوم ہو جائے گا کہ تہذیب
تمدن اور علمی معلومات کا ظہور سب سے پہلے ایشیاء میں ہوا اور یورپ ہمارے
خزائن کا خوشہ چین ہے۔ فنون لطیفہ اور علم ہندسہ میں مشرق نے کیسا عروج
حاصل کیا۔ البتہ یورپین اقوام نے سائنس کو خوب ترقی دی ہے اور یہی چیز
آن کے لئے آج مایۂ ناز ہے۔ مگر جاپان کی ترقی اس امر کا ثبوت دیتی ہے کہ
ایشیائی اقوام بھی برابری کے ساتھ اس ترقی کی شاہ راہ میں گامزن ہو سکتی ہیں
بلکہ اکثر باتوں میں یورپین اقوام پر فوقیت رکھتی ہیں کچھ عرصہ ہوا کہ جنگ
روس و جاپان نے یہ بتلا دیا کہ میدان جنگ میں کالے لوگ گوروں سے
بھاگنے والے نہیں ہیں اور حال ہی میں جنگ عظیم کے سلسلہ میں ہندوستانی
فوج نے بہادری کا کیسا ثبوت دیا ہے۔ اس کے بعد ہی یونانیوں نے جو
شکست فاش ترکوں کی ٹوٹی پھوٹی فوج کے مقابلہ میں اٹھائی اس سے

بہت کچھ نتائج برآمد کئے جا سکتے ہیں۔

جہاز کے سفر میں ہم کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ بین الاقوامی ترازو میں ہمارا وزن کتنا ہے۔ پہلے ہم کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ کوئی زمانہ تھا کہ ہم بھی صاحب حکومت تھے۔ مال و دولت کی کمی نہ تھی حاکم تھے محکوم نہ تھے حکومت اور ثروت کے ساتھ علم کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ہم کو ترچھی نظروں سے دیکھے ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے سب کچھ کھو دیا۔ مولانا نذیر احمد نے (خدا ان کو مغفرت نصیب کرے) قوم کا مرثیہ خوب لکھا ہے اس موقع پر مرثیہ کے چند اشعار ملاحظہ طلب ہیں۔

کیا خوب کہہ گیا کوئی شخص خوش خصال لفظ عرب میں نحن رجالٌ و ہم رجال
اب اے عزیزو تم سے ہمارا ہے یہ سوال کیوں آ گیا ہے قوم کی حالت میں اختلال

اقوام روزگار میں بیٹھے ہو کس لئے
بے وقعتی کی خاک پہ لیٹے ہو کس لئے

کثرت سے تم میں صاحب مقدور کیوں نہیں لوہا تمھارا مانتے جمہور کیوں نہیں
منہ پر تمھارے حسن نہ ہو نور کیوں نہیں دل قوم کے شگفتہ و مسرور کیوں نہیں

آخر تمھاری قوم پہ یہ کیا وبال ہے؟
جس شخص پر خیال کرو خستہ حال ہے

جب تک ہماری قوم میں تاج و نگیں رہا ہم میں کسی کو فکر معیشت نہیں رہا
کس کس کا نام لیں کہ خیال اور چنیں رہا ہر فرد عافیت سے قضا سے قریب رہا

ہم مالک خزائن روئے زمین سے تھے
اہل زمانہ قاطبتاً خوشہ چین تھے

جہاز پر روزانہ کھانے کے بعد سینما ہوتا ہے۔ ایک رات فینسی ڈریس کا ناچ

ہوا۔ لوگ عجیب عجیب لباس پہنکر آئے۔ بعض کو انعام بھی ملا۔ ہمارے درجہ میں ایک انگریز ہے جو لندن سے بمبئی جارہا ہے۔ یہ اپنے کو متعدد اخباروں کا نامہ نگار کہتا ہے۔ ہندوستان کے ہنگاموں کی خبر سن کر بہت پریشان ہے بار بار مجھ سے پوچھتا تھا کہ وہاں کوئی مار گیا تو نہیں۔ حفاظت جان کے لئے عجیب عجیب ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ چنانچہ کہتا تھا کہ میں اپنے کو امریکن ظاہر کروں گا۔ یا جرمنی کہوں گا۔ اس کے سفر کا مقصد یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کے عام حالات پر مشاہدہ کرنے کے بعد اخباروں میں مضامین بھجوائے۔ حضرت کے معلومات کا یہ حال ہے کہ حیدرآباد کو پشاور کے قریب بتلاتے ہیں۔ اس کو شطرنج کا شوق تھا کبھی کبھی اس کے ساتھ دو ایک بازیاں کھیلنے کا اتفاق ہوا۔

ایک روز اس نے مجھ سے پوچھا ہندوستان میں انگریزوں کے متعلق خیالات کیسے ہیں۔ میں نے کہا انگریزی حکومت کی وجہ سے ہندوستان کے سینکڑوں فوائد حاصل ہیں۔ جان و مال کی حفاظت ذرائع آمد و رفت میں سہولت۔ تجارت کی ترقی تعلیم کی زیادتی۔ غرض بہتیری باتیں انگریزوں کی بدولت ہم کو مل گئی ہیں۔ اور مل رہی ہیں۔ البتہ یہ شکایت ضرور سنی جاتی ہے کہ یہ ہندوستانیوں سے الگ الگ رہتے ہیں۔ اس لئے عام خیال ہے کہ انگریز قوم مغرور بہت ہے۔ جہاز پر تم جو کچھ دیکھتے ہو اسی سے اندازہ کرلو۔ کیا خوب ہو جو حاکم اور محکوم میں میل جول زیادہ ہو جائے۔ اس نے کہا افسوس ہے کہ مجھ کو تمہاری رائے سے اتفاق نہیں ہوسکتا۔ یہ مسئلہ بہت نازک ہے۔ حاکم اور محکوم میں حفظ مراتب کا خیال ضرور رہنا چاہئے۔ زیادہ میل جول سے بے تکلفی ہو جاتی ہے اور بے تکلفی سے وقار کم ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے بڑی غلطی کی کہ ہندوستان فتح کرنے کے بعد اپنے آبائی وطن سے تعلقات ترک کر دیے۔ اور اہل ہنود کے

ساتھ ایسے شیر و شکر ہو گئے کہ قومی وقار کو ہاتھ سے کھو یا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کا ایک باعث یہی میل جول ہے ایک تاریخی مثال ہمارے پیش نظر ہوتے ہم کیسے اپنے پاؤں پر آپ ہی کلہاڑی ماریں۔ اب رہی موجودہ بے چینی اسکو خانگی میل جول سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خالص سیاسی شورش ہے۔ انگریزوں نے جان و مال کا ایثار کر کے برسوں کی کوشش کے بعد اپنی حکمت عملی سے ہندوستان کو فتح کیا ہے۔ باغ لگانے والے کو اس کے ثمرے سے بھی مستفید ہونے کا حق حاصل ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے لیکن تعجب ہے کہ ہندوستانیوں کے سمجھ میں نہیں آتی کہتے ہیں کہ تم ہندوستان چھوڑ کر اپنے بوریے بدھنے کے ساتھ انگلستان واپس چلے جاؤ۔ یہ فرمائش بالکل قانون فطرت کے خلاف ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ اگر آج انگلستان پر مسلمانوں کی حکومت ہوتی اور انگریز ان سے یہی خواہش کرتے تو کیا مسلمان اپنی حکومت سے دست بردار ہو کر خاموشی کے ساتھ چلے جاتے؟ ہرگز نہیں۔ پھر کیوں انگریزوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہندوستان جیسی دودھ دینے والی گائے کو چھوڑ کر اپنی قوم کو تباہی میں ڈالیں۔

جہاز پر حیدرآباد کے دو مسافروں سے ملاقات ہوئی ایک طالب علم ہیں، دوسرے صاحب سید محمود رضوی ہیں جو سررشتہ جنگلات میں مددگار ر ہیں۔ صاحب موصوف بھی سیر و تفریح کی خاطر رخصت لیکر نکلے تھے افسوس ہے کہ وطن سے چلتے وقت ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ ورنہ پورے سفر میں سنگت رہتی۔ بڑے یار باش۔ خوش مزاج اور سیدھی سادھی طبیعت کے آدمی ہیں۔ بیچارے برنڈسی میں بہت پریشان رہے۔ سیر کرنے کے لئے ہماری پارٹی میں شریک تھے۔ گاڑی میں سوار ہونے سے قبل ہجوم کی وجہ سے

ان کا ساتھ چھوٹ گیا۔ ہم نے ہر چند تلاش کی مگر پتہ نہ چلا۔ جہاز کے روانہ ہونے
سے کوئی دس منٹ قبل تھکے ماندے اور پریشاں حال آپ واپس آئے۔ بڑی
لمبی چوڑی داستان سناتے تھے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ہم سے الگ ہونے کے
بعد انھوں نے ہم کو بہت تلاش کیا۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو تنہا سیر کو نکلے۔ رات کا
وقت اور زبان کی اجنبیت راستہ بھول کر کہیں سے کہیں نکل گئے۔ بالآخر ایک
مقامی رہبر سے سابقہ پڑا یہ جہاز پر واپس آنا چاہتے تھے اور وہ ان کو مغالطہ
دیکر ایسے مقامات پر لیجاتا تھا۔ جہاں اس کی ذاتی منفعت مقصود ہوتی۔ الغرض
مردہ بدست زندہ بنے رہے۔ اس نے بہت کچھ رقم ان سے کھسوٹ لی۔ خدا اجنبی
مسافر کو ان رہبروں کے ہتکنڈوں سے محفوظ رکھے۔ ایک روز جہاز کا کوئی پرزہ
خراب ہوگیا۔ اور وہ جوں کی طرح چلنے لگا۔ دو روز تک تشویش رہی۔ خدا کا
شکر ہے کہ بعد کو درست ہوگیا۔ غور کرنے کی جگہ ہے کہ اس جہاز کی تیاری میں
کس قدر روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ کیسے ماہرین فن کی نگرانی رہی ہوگی۔ اور اس
کے انجن میں چھوٹے بڑے کئی ہزار پرزے ہوں گے۔ ان پرزوں کی صفائی
اور جانچ پڑتال کے لئے کتنے آدمی ملازم ہیں باوجود ان سب باتوں کے کوئی
نہ کوئی خرابی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف کارخانہ قدرت کی
کاریگری کا نمونہ دیکھو کیسے زبردست اجرام فلکی بنائے ہیں ان کی تنظیم پر
خیال کرو۔ ابتدائے آفرینش سے چاند۔ سورج اور زمین وغیرہ اپنی اپنی جگہ مقررہ
رفتار کے ساتھ برابر گردش میں ہیں کبھی نہ سنا ہوگا کہ ایک سکنڈ کے لئے بھی
ان کی رفتار میں فرق پڑا ہو۔ وہی چوبیس گھنٹوں کے دن رات صحت اور
تیقن کا یہ حال ہے کہ برسوں پہلے سے حساب ڈال کر جنتری بنالو ان باتوں
کو دیکھ کر انسان کی عقل دنگ ہو جاتی ہے اور اس کو اپنی بے بضاعتی کا

اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ سائنس کے ماہرین فن ہزار بلند پروازی سے کام لیں مگر بعض اسرار الٰہی ایسے ہیں کہ ان کی اصلیت کو معلوم کرنا عقل انسانی سے بالاتر ہے۔ اب تک کوئی شخص اس معمہ کو حل نہ کر سکا۔ کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی تھی یا انڈا بلکہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس قسم کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ جن کو چشم بصیرت حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ یہیں سے مذہب کی سرحد شروع ہوتی ہے اور انسان کو سکوت اختیار کرنا پڑتا ہے۔ حافظ شیرازی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

سخن از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمہ را

پورٹ سعید پر جہاز کئی گھنٹے ٹھہرا۔ جہاز سے بندرگاہ تک لکڑی کا پل لگا دیتے ہیں کشتی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اکثر مسافر سیر کے واسطے یہاں اترے قاہرہ میں جو سوٹ کیس امریکن اکسپریس کے حوالہ کر دیا تھا۔ وہ ہم کو یہاں مل گیا بندرگاہ کے دروازے پر چنگی والوں نے ہماری جیب میں ہاتھ ڈال کر اطمینان کر لیا کہ کوئی محصول طلب چیز تو نہیں ہے۔ یہ طریقہ نہایت درجہ مذموم ہے۔ شہر میں جانے کے بعد وہی مصیبت شروع ہو گئی جس کا ذکر سوئز اور قاہرہ کے حالات میں ہو چکا ہے۔ بازاری لوگوں نے ستانا شروع کر دیا۔ کوئی کہتا تھا ہم تم کو سیر کرا دیتے ہیں۔ کوئی گاڑی۔ لئے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ کوئی ٹیکسی کو بلاتا تھا۔ غرض یہ کہ دو قدم چلنا مشکل ہو گیا۔ اس شہر میں کوئی خاص چیز دیکھنے کے لائق نہیں ہے۔ آبادی اس کی پچاس ہزار کے قریب ہوگی۔ اپنے موقع کے لحاظ سے یہ ایک اہم بندرگاہ ہو گیا ہے۔ نہر سوئز کے ایک سرے پر واقع ہے۔ جہازوں کی آمد و رفت یہاں کثرت سے ہے۔ شہر کے ایک حصہ میں

شہر کے ایک حصہ میں گدھوں کی ایک ٹریم چلتی ہے۔ ہم اس ٹریم کی ایک تصویر لے کر جانے لگے تو ٹریم والا اور کچھ مسافر پیچھے پڑ گئے کہ معاوضہ دیتے جاؤ۔ بڑی مشکل سے یہ قصہ طے ہوا۔

پورٹ سعید سے روانہ ہونے کے بعد جہاز عدن پر ٹھہرا۔ یہ بھی ایک ایک چھوٹا مقام ہے نہ سبزہ ہے نہ درخت۔ عجیب وحشت برستی ہے ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کیا۔ اس سے قبل ترکوں کا قبضہ تھا۔ جہاز ساحل سے فاصلہ پر کھڑا ہوتا ہے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں عرب سوداگر متفرق اشیاء فروخت کرنے کو لاتے ہیں۔

دنیوی اور روحانی سفر کا فرق

عدن ہمارے سفر کی آخری منزل تھی اس کے بعد جہاز بمبئی پر ٹھہرتا ہے۔ عدن سے روانہ ہوتے ہی سرزمین وطن آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ بال بچے۔ عزیز اقارب اور دوست احباب یاد آنے لگے دل میں ان خیالات کا پیدا ہونا تھا کہ اب تک جو کچھ دیکھتے چلے آئے وہ ایک خواب معلوم ہونے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں ہماری زندگی خود ایک خواب سے زیادہ نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ سیر و سیاحت کرتے ہیں اسے خواب در خواب سمجھو۔ اصلی سفر تو آخرت کا ہے جو بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے نہ تو اسٹیشن پر جانا پڑے گا۔ نہ ٹکٹ خریدنے کی زحمت ہوگی۔ نہ کک کمپنی کی امداد کی ضرورت جب وقت آئیگا آنکھیں بند کرتے ہی ادہر سے اُدہر پہنچ جائیں گے بقول ایک شاعر کے۔

اینکہ از دشواری راہ فنا ترسی مترس ۔۔۔ بس کہ آسان است رہ می تواں خم ابیدہ رفت

مگر یہ ایک شاعرانہ خیال ہے اس پر اعتقاد رکھنا یا کاربند ہونا اصل

حاقت ہے غور سے کام لو تو معلوم ہو جائے گا کہ اس سفر کے لئے بڑی لمبی
چوڑی تیاری کی ضرورت ہے۔ دنیوی سفر میں تو یہ دیکھا کہ جس قدر روپیہ
خرچ کرو اسی قدر آرام ملتا ہے عزت بڑھتی ہے اور ہر قسم کی آؤ بھگت بھی
ہوتی ہے۔ یہاں سارا کھیل روپیہ کا ہے کسی شاعر نے روپیہ کی چیستان
خوب لکھی ہے

چیست آں مہ رخی و محبوبے ہمہ عالم فدائے دیدارش
ہر کرا وصل او نصیب شدہ گشت آمادہ مقصد و کارش

مگر مشکل تو یہ ہے کہ روحانی سفر میں روپیہ پیسہ بھی کام نہ آئے گا صرف ایمان و عمل کا پاسپورٹ
درکار ہے جو ٹکٹ لگا کر درخواست دینے سے نہیں ملتا۔ مدت العمر اپنے اعمال کا
محاسبہ کرتے اور راہ راست پر چلتے رہیں تو یہی ہمارا پاسپورٹ ہے اسی کا حاصل
کرنا انسان کے لئے سب سے مشکل کام ہے

قدسی ندانم چوں شود سودائے بازار جزا
نقد آمرزش بکف جنس عصیانی در بغل

ایمان کیا چیز ہے؟ اور عمل صالح کس کو کہتے ہیں یہ ایک ایسا معمہ ہے کہ عقل
انسانی اس پر اب تک متفق نہ ہو سکی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں سیکڑوں مذہب
پیدا ہوئے اور ہر مذہب ایک نئے راستہ کی نشاندہی کرتا ہے انسان حیران
ہے کہ کس راستہ کو اختیار کرے ہم کو تو سب سے اچھی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ
جس مذہب میں پیدا ہوئے اس کی پابندی کرتے رہیں ورنہ چھان بین کرنے
میں اکثر لوگوں کو دیکھا کہ راہ راست سے بھٹک گئے ہیں۔ الغرض دنیوی اور
روحانی سفر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو آخری
سفر کے لئے ہر وقت زاد راہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ اب رہے بد قسمت تو ان کو

کون ٹھکانے لگا سکتا ہے۔

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

ایک روز کا لطیفہ لائق تذکرہ ہے۔ دو تین روز گرمی شدت کی ہوئی رات کو کیبن میں سونا مشکل ہو گیا۔ میرا برتھ نیچے کا تھا۔ پنکھے کی ہوا وہاں تک کافی نہیں آتی تھی۔ اکثر مسافرات کو اپنا بستر ڈک پر لے جاتے تھے میں نے بھی یہی عمل کیا۔ لیکن ڈک پر آرام کی جگہ نہ ملی۔ زینے کے ختم پر ایک چھوٹا سا مجلہ تھا۔ ایک طرف بستر لگا کر سو گیا۔ رات کو کسی وقت ایک صاحب ڈریسنگ گون پہن کر میرے پہلو میں سو گئے۔ ڈاڑھی کے ساتھ یہ مونچھوں کا بھی صفایا کرتے تھے میری جو آنکھ کھلی تو خیال ہوا کہ کوئی عورت سو رہی ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے شکل پوری طرح دکھائی نہ دیتی تھی کچھ دیر بعد اطمینان ہوا کہ کوئی صاحب سو رہے ہیں۔ مگر بعض لوگ جو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آمد و رفت کرتے رہتے تھے اس معمہ کو حل نہ کر سکے۔ ڈریسنگ گون کی وجہ سے یہی اشتباہ ہوتا تھا۔ کہ عورت سو رہی ہے۔ چنانچہ دو آدمیوں کو نیچی آواز میں یہ گفتگو کرتے میں نے سنا ایک صاحب کہتے تھے "ادھر سے مت جاؤ۔ مسٹر بیگ کسی لیڈی کے ساتھ سو رہے ہیں"۔ دوسرے نے کہا "آخر یہ کون ہے جو ان کے ساتھ سو رہی ہے" پہلے صاحب نے کہا "ہمارے درجہ کی نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ سکنڈ کلاس سے کوئی آگئی ہے" اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے۔ یہ دونوں مقابل کے دروازے سے چلے گئے غالباً انہی نے دوسروں کو بھی اطلاع دیدی۔ اس کے بعد آنے جانے والوں کا سلسلہ بندھ گیا۔ دو تین سیڑھیاں اتر کر جھانکنے کی کوشش کرتے ایک صاحب کو

یہ کہتے سنا کہ مسٹر بیگ بھی چھپے رستم نکلے بظاہر یہ کیسے مہذب بنے رہتے ہیں۔ پتہ چلانا چاہئے کہ یہ لیڈی کون ہے دوسرے نے کہا "میاں جو کچھ بھی ہو ہم سے تو خوش قسمت ہیں"۔ مجھے کبھی تو ہنسی آئی اور کبھی غصہ۔ رات بھر اسی کیفیت میں نیند نہ آئی۔ صبح کو ناشتہ کے وقت کھانے کے کمرے میں جب مجمع ہوا تو بعض بے تکلف حضرات نے مذاقیہ طور پر یہی تذکرہ چھیڑ دیا اس وقت رازِ سربستہ ان پر ظاہر کیا گیا بڑی دیر تک ہنسی ہوتی رہی۔ جو صاحب پہلو میں سو گئے تھے وہ بُری طرح بنائے گئے۔

پورٹ سعید اور عدن سے ایک خاصی تعداد چوتھے درجہ کے مسافروں کی سوار ہوئی۔ چوتھا درجہ کسی قدر تکلیف دہ ہے اس میں کیبن نہیں ہوتا سب مسافر ایک فرش پر لوٹا کرتے ہیں کھانے کا انتظام بھی باقاعدہ نہیں ہے چوتھے درجہ میں بعض مسافر گانے بجانے کے شوقین تھے۔ ان کے پاس ہارمونیم اور طبلہ بھی تھا۔ ہمارے درجہ میں بھی بعض حضرات علم موسیقی کی دولت سے بہرہ مند تھے۔ شام کے وقت محفل گرم ہوتی تھی۔ بمبئی کی طرف سے ایک صاحب مع اپنی بیوی کے ہمارے درجہ میں تھے۔ بائی جی کو گانے میں خاصا دخل تھا۔ راگ راگنیاں خوب گاتی تھیں۔ اظہار تحسین کے لئے جب سامعین تالیاں بجاتے تو بائی جی ناراض ہوتیں۔ اور منع کرتیں کہ تالیاں نہ بجاؤ۔ پورٹ سعید سے ایک پنجابی مولوی صاحب سوار ہوئے۔ کبھی کبھی سمندر کی سیر کرنے کے لئے ہمارے ڈک پر آجایا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ بڑا لطف رہا۔ علوم شرقیہ میں کافی دست گاہ رکھتے تھے۔ یوں تو کوئی انسان کمزوریوں سے خالی نہیں ہے۔ لیکن بعض لوگوں میں یہ اس قدر نمایاں ہوتی ہیں کہ دوسروں کی نگاہوں میں وہ تماشا بن جاتے ہیں۔ یہی

کیفیت ان مولوی صاحب کی تھی۔ تنگ خیالی۔ کج بحثی۔ اور خود ستائی بات بات میں تھی۔ کفر کا فتویٰ دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ بعض من چلے نو عمر طالب علم جو تہذیب یورپ کے نشہ میں سرشار تھے۔ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔ بڑی معرکہ آرائیاں رہیں۔ نئی روشنی کے خوشہ چینوں کی بعض زیادتیوں سے ناراض ہو کر مولوی صاحب نیچے درجہ میں چلے جایا کرتے تھے طالب علموں کو تو وقت کاٹنے کا مشغلہ چاہیئے تھا۔ بھلا ایسا موقع کب ہاتھ سے جانے دیتے ہیں۔ نیچے جا کر مولوی صاحب کو ستاتے اور پھر وہی ہنگامہ شروع ہو جاتا۔ کوئی شراب کی نسبت فتویٰ لیتا۔ کوئی ڈاڑھی کے متعلق سوال کرتا۔ غرض سینکڑوں مسائل حل ہو گئے۔ طالب علموں کی جماعت نے تو ایک کمیٹی مستقل طور پر مقرر کر دی تھی۔ جس کا کام یہ تھا کہ روزانہ ایک فہرست سوالات کی مرتب کرے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر سوالات خلاف تہذیب ہوتے تھے لیکن طالب علموں کو سنجیدگی سے کیا تعلق۔ آخر کار ایک روز مولوی صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ طلب صادق کی نیت سے پوچھو تو سب کچھ بتاؤں۔ ورنہ مذہب کو خدا کے لئے بخشو۔ مذاق کے لئے اور بہت سی باتیں ہیں۔

ایک روز محفل گرم تھی اور مولوی صاحب گرمجوشی کے ساتھ نازک مسائل پر روشنی ڈال رہے تھے۔ بسبیل تذکرہ میں نے برلن کے برہنہ کلب کی تفصیل بیان کی۔ مولوی صاحب کی پریشانی دیکھنے کے لائق تھی ایک شریر طالب علم نے پوچھا حضرت یہ تو بتلائیے کہ اگر خدانخواستہ جناب کی سواری باد بہاری اس کلب میں رونق افروز ہو تو جناب کے جذبات کا کیا کیفیت ہوگی۔ مولانا نے برہم ہو کر اپنے زہد و تقویٰ کی تعریف میں پل باندھے

ایک صاحب نے کسی شاعر کا یہ مشہور و معروف قطعہ پڑھا۔

سبزہ ہو کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش ❊ اور رواں محفل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب ❊ دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو سپئے
گر پی نہ جائیے جلد یہ پیالہ شراب کا

اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو ❊ گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا
اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام ❊ قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

خدا مولانا کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے فوراً دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے۔

خدا کا شکر ہے کہ جہاز کا یہ سفر خیر و خوبی کے ساتھ گزر گیا۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ سمندر میں بالکل سکون رہا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک صاف شفاف سفید چادر بچھی ہوئی ہے لیکن ذرا تخیل کو کام میں لاؤ تو اسی پرسکون فضا کے نیچے ایک رنگ برنگ کی کائنات دکھائی دیگی۔ خدائے عزوجل کی شان کبریائی دیکھو کہ پانی کے اندر بھی ایک دنیا قائم ہے۔

تعریف اس خدا کو جس نے جہاں بنایا ❊ کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا
آب رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے ❊ مچھلی کے تیرنے کو آب رواں بنایا

جن حضرات نے عجائب خانوں میں "اکویریم" کا معائنہ کیا ہے۔ وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سطح آب کے نیچے کیسی کیسی خوبصورت۔ خوش رنگ۔ بدصورت و بدرنگ چھوٹی اور بڑی کائنات موجود ہے۔ کچھ جانور تو ایسے ہیں جو کیچال وغیرہ جیسی نباتات پر قناعت کرتے ہیں لیکن ان میں جو بڑے جانور ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کو کھاتے ہیں۔ زبردست کمزور کو اپنی غذا بناتا ہے۔

اسی کو زندگی کی کشمکش کہتے ہیں ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ مکڑی کس قدر مشقت اور حکمت کے ساتھ جالا تیار کرتی ہے اور کمزور کیڑے اس جالے میں پھنس کر مکڑی کی غذا کا کام دیتے ہیں۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اسی پھیر میں پڑا رہتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آدم خواری کی صفت اس میں تقریباً معدوم ہے لیکن اپنی دو سری سینکڑوں اغراض کو پورا کرنے کے لئے ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ جنگ عظیم ایک نمونہ ہے انسان کی خود غرضی کا جانور بیچارے تو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے ایک دوسرے کو ہلاک کرتے ہیں۔ مگر ہم اس حد سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ اکثر اوقات محض تفریح کی خاطر ہم سیر و شکار میں مصروف رہتے ہیں بے زبان جانوروں کو اس کے چمڑے کی خاطر اور کسی کو اس کے دانت و پرندوں کی خاطر بے دھڑک ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ یہ خیال تک نہیں گزرتا کہ جانوروں کو بھی اپنی جان عزیز ہوتی ہے بلا وجہ اسے کیوں ضایع کیا جائے۔

میازار مورے کہ دانہ کش است
کہ جاندار دو جان شیریں خوش است

ہندوستان کے ان حضرات کی خدمت میں جو اپنے بچوں کو بغرض تعلیم یورپ بھجوانا چاہتے ہیں میری گزارش یہ ہے کہ درجہ اول اور درجہ دوم کے بیجا مصارف میں نہ پڑیں۔ درجہ سوم میں گھر سے زیادہ آسایش ہوتی ہے بالخصوص طالب علموں کے لئے یہ درجہ بہت موزوں ہے۔ حال ہی میں پی اینڈ او کمپنی نے بھی اپنے دو ایک جہازوں میں یہ درجہ اضافہ کر دیا ہے ۶ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو سر شب ہمارا جہاز بمبئی پہنچا۔ جونہی جہاز سے اُترے ابر کرم نے گویا بخیر خوبی کے ساتھ وطن واپس ہونے کی مبارک باد دی ایسی

موسلا دھار بارش ہوئی کہ باید وشاید۔ دو گھنٹے کے قریب محصول خانہ میں اٹکا رہنا پڑا۔ مسافروں کے ہجوم کی وجہ سے سانس لینا بھی مشکل ہوگیا تھا سامان کا معائنہ کسی قدر سختی کے ساتھ ہوتا ہے اور کچھ مراتب دفتری ایسے طے کرنے پڑتے ہیں جو اس سارے سفر میں نہیں دیکھے گئے۔ بالآخر ہمارے اسباب کے معائنہ کی باری بھی آئی۔ جہاز سے اُترتے وقت ہر مسافر کو ایک فارم دیا گیا تھا جس میں سامان وغیرہ کی تفصیل تھی اس میں میرے نام کے ساتھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی لکھا ہوا تھا محصول خانہ کے ملازم نے مجھ سے پوچھا کہ آپ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں میں نے کہا ہاں۔ اس پر اس نے کہا افسوس ہے کہ آپ کو اتنی دیر تک بلاوجہ یہاں ٹھہرنا پڑا۔ آپ سے تو زبانی دریافت کرلینا کافی ہے آپ اپنا سامان نہ کھولئے اور تشریف لیجائیے بمبئی میں رفیق بیگ کو ایک کام کے لئے ٹھہرنا تھا۔ اس سے فارغ ہوکر ۱۹ اکتوبر کو شام کے وقت بذریعہ میل ٹرین ہم حیدرآباد کے اسی اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ جملہ احباب اور کرم فرما اسٹیشن پر موجود تھے۔ سب سے ملکر اور سب کو تندرست دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔

خدا اس ریاست ابد مدت کو جملہ آفات و حوادثات سے ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھے۔ اور ہمارے موجودہ فرماں روا و شہزادگان والاتبار کے اقبال دعمر میں روز افزوں ترقی عنایت فرمائے۔ جس چین امن و آسایش کے ساتھ ہم اِس ملک میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اِس کی نظیر دیگر ممالک میں نہیں ملتی۔

خسرو دکن کی بیدار مغزی اور روشن خیالی کے آثار

آثار چاروں طرف نمایاں ہیں۔ شہر حیدرآباد کو دیکھو کیسی ترقی کر رہا ہے۔ عنقریب اس کا شمار دنیا کے بہترین شہروں میں ہونے لگے گا۔ انشاء اللہ۔

للہ الحمد کہ بچھڑوں سے ملے پھر آکر
پھر ہم آغوش وطن ہیں کہ ہوا ختم سفر
کھینچ ہی لائی کشش خاکِ وطن کی آخر
حق تو یہ ہے کہ بشر کیلئے جنت ہی تو گھر

تمت

۱۳۵۲ھ

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس